پروفیسر مسعود حسین خاںؒ

کی

ادبی خدمات

ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ

کتاب۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کی ادبی خدمات

مصنفہ۔ ریحانہ سلطانہ ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی، پی ایچ۔ڈی

اشاعت اول۔ اکٹوبر ۱۹۹۵ء

کمپیوٹر کتابت۔ شارپ کمپیوٹرس محبوب بازار کامپلکس،
چادر گھاٹ، حیدرآباد۔ ۲۴ (فون 4574117)

مطبع۔ ایس ایس گرافکس حیدرآباد۔

قیمت۔ 110 روپے

یہ کتاب فخرالدین علی احمد کمیٹی، لکھنؤ کے جزوی مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

ناشر: دکن پبلشرز، یاقوت پورہ، حیدرآباد۔ ۲۳

============= ملنے کے پتے =============

1) ۔ حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان حیدرآباد۔

2) ۔ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، گلی عزیز الدین وکیل کوچہ پنڈت، لال کنواں دہلی

۔ گلوریئس دکن اسکول، دبیر پورہ حیدرآباد۔

4) ۔ شارپ کمپیوٹرس، محبوب بازار، چادر گھاٹ، حیدرآباد۔ ۲۴

===== ٥٥٥ =====

انتساب

مشفق استاذ محترم

پروفیسر اشرف رفیع کے نام

فہرست

پیش لفظ

پروفیسر مسعود حسین خاں کی ذات گرامی ایک ہمہ جہت شخصیت ہے۔ وہ ادیب، شاعر، نقاد، محقق، ماہر لسانیات، مفکر اور دانش ور ہیں۔ علم و ادب کے مختلف شعبوں میں ان کے کارنامے وقعت رکھتے ہیں۔ ایسی بلند پایہ شخصیت اور اس کے کارناموں کو تحقیق کا موضوع بنانا اور اس کے ساتھ انصاف کرنا بڑی ہمت اور جگر کاوی کا کام ہے۔ ریحانہ سلطانہ نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور بڑی محنت اور جاں کاہی کے ساتھ اسے پایہء تکمیل کو پہنچایا۔ یہ ایک ایسا بھاری پتھر تھا جسے سہل پسند چوم کے چھوڑ بھاگتے۔ لیکن ایک بدلے ہوئے تناظر میں میرؔ کا یہ شعر ریحانہ سلطانہ پر صادق آتا ہے۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

پروفیسر مسعود حسین خاں کے کارناموں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لینا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو مختلف علوم بالخصوص لسانیات، سماجیات، تاریخ اور کسی حد تک فلسفہ اور سیاست سے بہرہ رکھتا ہو اور اردو شعر و ادب کی روایات سے گہری آگہی رکھتا ہو۔ ریحانہ سلطانہ نے بڑی لگن کے ساتھ اپنے مطالعے کو وسعت دی اور تمام تنقیدی اور تحقیقی اوزار سے لیس ہو کر اس کام کو بڑے اعتماد کے ساتھ سرانجام دیا۔

جہاں تک سوانح حیات کا تعلق ہے وہ ان کے مقالے کا اصل موضوع نہیں تھا انھوں نے تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے لیکن جامعیت کے ساتھ پروفیسر مسعود حسین خاں کی حیات اور شخصیت پر روشنی ڈالی ہے اور بعض ایسی نئی معلومات فراہم کی ہیں جو مسعود صاحب کی خود نوشت میں بھی موجود نہیں ہیں۔

ادبی تنقید کے باب میں انھوں نے مسعود صاحب کی تمام تنقیدی تصانیف اور مضامین کا نہ صرف تعارف پیش کیا ہے بلکہ ان کے نظریہ ادب اور بحیثیت نقاد ان

کی انفرادیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ اردو میں ادھ کچری سماجیاتی اور سیاسی تنقید کا بول بالا تھا مسعود صاحب نے ادب کی بحیثیت ادب قدر شناسی پر زور دیا۔ انھوں نے اردو میں اسلوبیاتی تنقید کی داغ بیل ڈالی اور اس سلسلے میں لسانیات کے علم سے استفادے کی اہمیت کو واضح کیا۔

بحیثیت ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں کے کارناموں کا جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ مقالہ نگار خود بھی علم لسانیات میں درک رکھتا ہو۔ ریحانہ سلطانہ نے اس مقالے کے باب لسانیات و صوتیات میں اس علم سے اپنی بھرپور واقفیت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اس باب میں انھوں نے بطور خاص مسعود صاحب کی معرکتہ الآرا تصنیف "مقدمہ، تاریخ زبان اردو" سے بحث کی ہے۔ اس ضمن میں اردو زبان کے آغاز کے مختلف نظریوں پر روشنی ڈالی ہے، مسعود صاحب کے نظریے کی تفصیل سے وضاحت کی ہے اور اس نظریے پر دیگر محققین اور ماہرین لسانیات کے اعتراضات کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے مسعود صاحب کے نظریے کی مجموعی طور پر استدلال کے ساتھ حمایت کی ہے اور کہیں کہیں اختلاف رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس باب میں "اردو کا المیہ" کے تفصیلی تعارف کے علاوہ صوتیات کے زیر عنوان اردو اصوات پر مسعود صاحب کی تحقیقات کا غائر نگاہ سے مطالعہ کیا گیا ہے۔

اگلے ابواب میں انھوں نے تحقیق و تدوین متن، لغت نگاری اور تخلیقی ادب کے عنوانات کے تحت پروفیسر مسعود حسین خاں کی نگارشات کا نہ صرف تعارف کروایا ہے بلکہ اپنی تنقیدی بصیرت کو کام میں لاکر ان کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ تحقیق و تدوین متن کے بارے میں پروفیسر مسعود حسین خاں کی مدون کردہ پانچ کتابوں = پرت نامہ، بکٹ کہانی، ابراہیم نامہ، قصۂ مہر افروز و دلبر، عاشور اور نامہ رقعات رشید کا فرداً فرداً مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ قدیم متون اور ان کے مصنفین کے بارے میں مسعود صاحب کی تحقیقات اور بعض امور پر دیگر محققین کے اختلافات سے مفصل بحث کی ہے۔ ان مباحث سے تحقیق میں مسعود صاحب کی ژرف نگاہی پوری طرح اجاگر ہوتی ہے۔ اس کی داد ریحانہ سلطانہ کو بھی ملنی چاہیے۔

اس کے آگے لغت نگاری کا باب ہے جو معروضی تحقیق و تنقید کی عمدہ مثال ہے ۔ ریحانہ سلطانہ نے دکنی لغت نویسی کی تاریخ تفصیل سے بیان کی ہے پھر مسعود حسین خاں صاحب کی مرتب کردہ لغت کے محاسن کا جائزہ لیتے ہوے بتایا ہے کہ اب تک دکنی کی جتنی لغتیں لکھی گئی ہیں یہ ان سب میں زیادہ جامع اور سائینٹفک لغت ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے بعض کمیوں کی نشان دہی کی ہے وہ پروفیسر اشرف رفیع کے اس خیال سے اتفاق کرتی ہیں کہ " دکنی اردو کی لغت ایک قدیم زبان کی لغت ہونے کے اعتبار سے ڈکشنری سے زیادہ فرہنگ سے مشابہ ہے ۔" کیوں کہ اس میں معنوں کی وسعت نہیں ملتی ۔ اردو میں لغات اور فرہنگ کے الفاظ مترادفات کے طور پر مروج ہیں اور دونوں لفظ ڈکشنری کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں ۔ مقالہ نگار کے خیال میں بعض الفاظ کے معنی درست نہیں ہیں اور سند سے مختلف ہیں

ریحانہ سلطانہ نے پروفیسر مسعود حسین خاں کی تخلیقی نگارشات پر جن میں ان کی شاعری اور خود نوشت شامل ہیں، سیر حاصل تبصرہ کیا ہے ۔

" پروفیسر مسعود حسین خاں کی ادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ " ایک عمدہ مقالہ ہے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے لیے اس معیار کے مقالے شاذ ہی لکھے جاتے ہیں ۔ مجھے خوشی ہے کہ تاخیر سے سہی یہ مقالہ اب کتاب کی صورت میں شائع کیا جارہا ہے ۔

۱۵/ سپتمبر ۱۹۹۵ء

مغنی تبسم
6 - 3 - 659/2
سوماجی گوڑہ
حیدرآباد 500 082

مقدمہ

پروفیسر مسعود حسین خاں عہد حاضر کی ایک ایسی علمی و ادبی شخصیت ہے جن کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اس جامع الحیثیات شخصیت پر جب میں نے اپنے تحقیقی کام کا آغاز کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس سے قبل ان پر کہیں کوئی تحقیقی تو کیا تعارفی کام بھی نہیں ہوا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں پروفیسر مسعود حسین خاں کی خود نوشت سوانح "ورود مسعود" منظر عام پر آئی۔ پھر اسکے ایک سال کے اندر "نذر مسعود" کا تحفہ اہل نظر کی خدمت میں ان کے ایک شاگرد رشید ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ" نے مرتب کر کے پیش کیا۔ پروفیسر مسعود حسین خاں جیسی ہمہ پہلو شخصیت سے انصاف کرنے کیلئے یہ نگارشات قطعی ناکافی ہیں۔ پیش نظر مقالہ میں اس کمی کو پورا کرنے کی ایک طالب علمانہ جسارت کی گئی ہے۔ یہ مقالہ پروفیسر مسعود حسین خاں کی ان نگارشات پر مشتمل ہے جو ۱۹۴۸ سے ۱۹۹۱ء کے دوران طبع ہو کر منظر عام پر آئی ہیں۔ ان نگارشات کے پیش نظر مقالہ کو (۷) ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا باب مسعود صاحب کی حیات اور شخصیت کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔ اس باب کے لئے مواد ڈاکٹر صاحب کی تحریروں، خاندانی تعلقات اور مختلف شخصیتوں سے ملاقات کر کے اکٹھا کیا گیا ہے۔ ورود مسعود میں موجود معلومات کے علاوہ، حیات کے مختلف گوشوں کے بارے میں نئی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ مسعود صاحب کی زندگی کے ایسے واقعات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جن سے کسی عالم یا ادیب کی سیرت و شخصیت کی عکاسی میں بھی مدد ملتی ہے۔

ضروری نہیں کہ ایک انسان کی سیرت خوبیوں ہی سے عبارت ہو۔ اچھے انسان میں خوبیاں زیادہ اور کمزوریاں کم یا نہیں کہ برابر ہوتی ہیں۔ خوبیوں اور خامیوں کیلئے انسان تنہا ذمہ دار نہیں۔ توریث، خاندان، تربیت، تعلیم، ماحول، پیشہ، احباب اور قریبی افراد اور شخصیت کی انفرادی صلاحیتیں مل کر سیرت کی تشکیل

کرتی ہیں ۔ اس باب میں خاندانی پس منظر کے بعد سیرت و شخصیت کو معروضی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

پروفیسر مسعود حسین خاں تنقید میں ایک متوازن رویہ رکھتے ہیں ۔ ان کا مطالعہ وسیع اور تجزیاتی ہے ۔ ان کی تنقید کا رویہ تاریخی ہے اور تاریخ تحقیق کی متقاضی ہے ۔ دوسرے باب میں بحیثیت نقاد ان کے کارناموں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے ۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کو تاریخ سے خصوصی دلچسپی رہی ہے ۔ علیگڑھ یونیورسٹی میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے سب سے پہلے شعبہ تاریخ ہی میں داخلہ لیا تھا اور اس کے بعد اردو ادب کی طرف توجہ کی لیکن تاریخ سے ان کی دلچسپی نے یہاں بھی اپنے لئے جگہہ نکالی اور اردو زبان کے ارتقائی منازل اور اسکے لسانی رشتوں کی تلاش میں مصروف ہو گئے ۔ تیسرے باب میں ان کی معرکتہ الآرا تصنیف مقدمہ تاریخ زبان اردو کے علاوہ اس موضوع پر ان کے مضامین کی روشنی میں بحیثیت ماہر لسانیات ان کا مقام متعین کیا ہے ۔

مسعود صاحب کی شخصیت کا ایک اور پہلو ان کے وہ تحقیقی کارنامے ہیں جن کی وجہ سے دکنی ادب کی کئی گمشدہ کڑیاں سامنے آئی ہیں ۔ اس کے بعد دکنی فن پاروں کی بازیافت اور ان کے سائنٹیفک مطالعہ کیطرف سنجیدگی سے توجہ دلائی گئی ہے ۔ چوتھے باب میں ان کے تحقیقی کارناموں کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیتے ہوئے بحیثیت محقق ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

آج کی کوئی مہذب زبان، بغیر فرہنگ لغت کے بے سروساماں سی معلوم ہوتی ہے ۔ اردو میں لغت نویسی کی تاریخ بہت طویل ہے ۔ دور حاضر کے اس طویل سلسلے کی ایک اہم کڑی پروفیسر مسعود حسین خاں کی دکنی اردو لغت، اور ترقی اردو بیورو کی طرف سے مرتب کی گئی "اردو لغت" ہے ۔ ان کا عظیم کارنامہ اردو بیورو کی طرف سے مرتب شدہ لغت اگرچہ ابھی منظر عام پر نہیں آئی لیکن اس کی ترتیب کے دوران

و

مسعود صاحب کو جن مسائل و مشکلات اور دقتوں سے دوچار ہونا پڑا اس پر انھوں نے مضامین بھی لکھے ہیں۔ پانچویں باب میں بہ حیثیت لغت نگار مسعود صاحب کے کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

تحقیقی، تنقیدی اور لسانی کارناموں کے علاوہ مسعود صاحب نے تخلیق کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ اس باب میں انھیں بحیثیت شاعر اور خود نوشت سوانح نگار پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بیک نظر مطالعہ کیلئے پروفیسر مسعود حسین خاں کے مضامین اردو تصانیف کی ایک فہرست سن وار مقالہ کے آخر میں شامل کر دی گئی ہے کہ مستقبل میں مزید تحقیق کیلئے یہ فہرست مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے۔

مقالہ کی تیاری میں موضوع کا انتخاب تحقیق کی سمت و راہ متعین کرتا ہے۔ اس سلسلے میں مارچ ۱۹۸۹ء میں رجسٹریشن سے قبل میں نے مسعود صاحب کو اجازت عطا کرنے کیلئے خط لکھا کہ آپ کے ادبی کارناموں پر کام کرنا چاہتی ہوں۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کا جواب آیا:

"آپ نے پی۔ ایچ۔ ڈی کر ڈالنے کی دھمکی دی ہے اور وہ بھی ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی ادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ" کے موضوع پر مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ڈاکٹر اشرف رفیع صاحبہ نے آپ کو اس مہم پر اکسایا ہے۔ میں آپ کو اس سے کیوں کر منع کر سکتا ہوں۔ لیکن اتنا بتاتا چلوں کہ اس سے قبل الہ آباد کے ایک صاحب نے کچھ اس قسم کا عزم کیا تھا۔ وہ آج تک پی۔ ایچ۔ ڈی نہ ہو سکے۔" (۱)

مسعود حسین خاں

خط مورخہ ۲۶/ دسمبر ۱۹۸۸ء

اس خط کو دیکھ کر خوشی ہوئی اور فکر بھی۔ فکر اس کی کہ میں ایسی جامع الحیثیات شخصیت کے فکر و فن کا محدود وقت میں احاطہ کر سکوں گی؟ ایسی شخصیت جو نہ

صرف علمی و ادبی دنیا میں ایک قد آور شخصیت ہے بلکہ میری استاد عظیم کے بھی استاد ہیں۔

اس مقالہ کے نقطۂ آغاز سے انجام تک کئی بار پروفیسر مسعود حسین خاں سے ملنے اور ان سے انٹرویو لینے کا موقع ملا۔ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود انھوں نے میرے سوالات کے جوابات دینے کیلئے وقت نکالا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس خود پرستی کے زمانے میں ایسی بھی ایک ادبی شخصیت اردو دنیا میں موجود ہے جس نے خود اپنا مطالعہ معروضی انداز میں کیا ہے اور خود پر تحقیقی کام کرنے والے اسکالر سے بھی انتہائی غیر جانبدارانہ رویہ روا رکھا ہے۔ مسعود صاحب کے یہاں نہ تو خود نمائی کی کوشش ہے اور نہ ہی نمائشی رعب و دبدبہ کا حصار۔ جسکی وجہ سے میری بڑی ہمت افزائی ہوئی میں نے اپنے موضوع کو اپنا ہیرو نہیں بنایا بلکہ ان ہی سے روشنی لیکر ان کا ایک معروضی مطالعہ پیش کیا ہے۔

اس مقالہ کی ترتیب میں مواد کی فراہمی دشوار کن مرحلہ تھی۔ اس سلسلے میں عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری، ادارۂ ادبیات اردو اور سالار جنگ لائبریری سے کچھ مواد فراہم ہوسکا۔ اردو ریسرچ سنٹر نور خاں بازار میں قدیم و جدید نایاب رسائل کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ راقم الحروف کو اس کتب خانہ سے مستفید ہونے کا پورا پورا موقع ملا۔ جسکے لئے معتمد کتب خانہ مکرمی عبد الصمد خاں صاحب کی شکر گزار ہوں۔ جنھوں نے مشفق رہبر اور ایک سرپرست کی طرح ہر لمحہ میری مدد فرمائی۔

اپنی استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر اشرف رفیع صاحبہ شعبہ اردو کے لئے اپنی ممنونیت اور تشکر کے مکمل اظہار کے لائق الفاظ نہیں ہیں۔ جن کی سرپرستی میں نہ صرف یہ مقالہ تکمیل کو پہنچا بلکہ باوجود اپنی بے پناہ مصروفیت کے ہر وقت انھوں نے اپنا وقت دیا۔ ان کی محبت اور شفقت نے زندگی کے ہر موڑ پر مجھے سہارا دیا۔ ان کے فیض صحبت اور مسلسل توجہ سے میرے ادبی شعور کو جلا ملی اور مجھے معلوم ہوا کہ تحقیق کیا ہے اور تحقیقی کام کس طرح کیا جاتا ہے۔ ان کی رہنمائی، شفقت و محبت پر

جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔

میری درخواست پر پروفیسر مغنی تبسم صاحب نے اپنی گوناں گوں مصروفیات کے باوجود وقت نکالا نہ صرف ایک بسوط مقدمہ لکھا بلکہ اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا اس کے لئے میں سپاس گذار ہوں۔

مواد کی فراہمی میں جن حضرات سے مدد ملی اور انٹرویو لئے گے ان سب کی خدمت میں سپاس گزار ہوں میری بزرگ پروفیسر محترمہ رفعیہ سلطانہ صاحبہ، ڈاکٹر خلیل احمد بیگ، پروفیسر یوسف سرمست، محترم ڈاکٹر مصطفےٰ علی فاطمی صاحب، محترم سرینواس لاہوٹی صاحب وغیرہ کی میں شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے ہر وقت میری ہمت افزائی کی اور استفسار پر معلومات فراہم کر کے میری تشفی کی۔ محترم ڈاکٹر خلیق انجم سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند دہلی نے ہماری زبان کے مضامین کے سلسلے میں تعاون کیا۔ ان کا بھی شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔ محترم دگمبر راؤ صاحب جو میرے استاد ہیں مراہٹی الفاظ کے مصادر و معنی کے کھولنے میں بہت تعاون کیا اور مقالے کی ترتیب میں بھی میری مدد کی ان کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا فرض اولین ہے۔

برادر عزیز مولانا محمد مصلح الدین قاسمی صاحب ڈاکٹر علی احمد جلیلی صاحب جنہوں نے مقالہ کی ترتیب و تشکیل سے لے کر کتاب کی اشاعت تک رہبری کی اور مفید مشوروں سے نوازا ان کی شکر گزار ہوں۔

شارپ کمپیوٹر۔۔۔۔۔۔ کی بھی شکر گزار ہوں جس کی مدد سے اس مقالہ کی کتابت اور اشاعت عمل میں آئی۔

آخر میں میرے والد محترم اور دیگر افراد خاندان کی جنہوں نے میری مدد کی میں ان سب کی دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔

ریحانہ سلطانہ

حیات اور شخصیت

محمد خاں بنگش والیٔ فرخ آباد نے ۱۷۱۴ء سے قبل اپنے بیٹے قائم خاں کے نام پر گنگا کے کنارے ایک قصبہ قائم گنج کی بنیاد ڈالی۔ اس علاقے میں کاسگنج سے لے کر کمال گنج تک بہت سے گنج آباد ہیں جو ان کے منڈی اور تجارتی مرکز ہونے کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ یہ فرخ سیر بادشاہ کا زمانہ تھا۔ جب محمد خاں بنگش تک یہ خبر پہنچی کہ بادشاہ ان کی اس حرکت سے بہت زیادہ خوش نہیں ہیں تو فوراً قائم گنج سے بیس میل مشرق کی جانب گنگا ہی کے کنارے اس نے فرخ سیر کے نام پر فرخ آباد کو آباد کیا اور اسے بعد کو اپنا مستقر قرار دیا۔

نوابانِ بنگش نے اس کے بعد اپنی ریاست کو عسکری بنیادوں پر مضبوط کرنے کے لیے صوبہ سرحد پر گماشتے بھیجے اور پٹھان قبائل کو دوابہ گنگ وہیں آنے کی دعوت دی۔ آفریدی پٹھانوں کے وہ قبائل جو بنوں کوہاٹ سے شمال مغرب کی جانب "تیراہ" کے علاقے میں بود و باش رکھتے تھے اور وہ اس آزاد علاقے کی سکونت ترک کر کے بنگشوں کی ریاست میں بود و باش اختیار کرنے پر راضی ہو گئے۔ انھیں فوجی ملازمتوں اور جاگیروں سے نوازا گیا۔ اس طرح قصبۂ قائم گنج کے ارد گرد انھوں نے اپنے محلّے آباد کر لیے۔ انھیں محلوں میں ایک "مواخیل" ہے جہاں مسعود حسین خاں کے جدِ اعلیٰ حسین خاں ۱۷۱۵ء کے لگ بھگ آکر آباد ہوئے۔

غلام حسین خاں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (صدر جمہور

فدا حسین خاں قائم گنج کے مشہور پٹھان نسل سے تعا

خاں وہ آزاد منش آدمی تھے۔

"اگرچیکہ افسر الملک

حیات اور شخصیت

محمد خاں بنگش والیٔ فرخ آباد نے ۱۷۱۴ء سے قبل اپنے بیٹے قائم خاں کے نام پر گنگا کے کنارے ایک قصبہ قائم گنج کی بنیاد ڈالی۔ اس علاقے میں کاسگنج سے لے کر کمال گنج تک بہت سے گنج آباد ہیں جو ان کے منڈی اور تجارتی مرکز ہونے کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ یہ فرخ سیر بادشاہ کا زمانہ تھا۔ جب محمد خاں بنگش تک یہ خبر پہنچی کہ بادشاہ ان کی اس حرکت سے بہت زیادہ خوش نہیں ہیں تو فوراً قائم گنج سے بیس میل مشرق کی جانب گنگا ہی کے کنارے اس نے فرخ سیر کے نام پر فرخ آباد کو آباد کیا اور اسے بعد کو اپنا مستقر قرار دیا۔

نوابانِ بنگش نے اس کے بعد اپنی ریاست کو عسکری بنیادوں پر مضبوط کرنے کے لیے صوبہ سرحد پر گماشتے بھیجے اور پٹھان قبائل کو دوابہ گمگ وہیں آنے کی دعوت دی۔ آفریدی پٹھانوں کے وہ قبائل جو بنوں کوہاٹ سے شمال مغرب کی جانب "تیراہ" کے علاقے میں بود و باش رکھتے تھے اور وہ اس آزاد علاقے کی سکونت ترک کر کے بنگوشوں کی ریاست میں بود و باش اختیار کرنے پر راضی ہوگئے۔ انھیں فوجی ملازمتوں اور جاگیروں سے نوازا گیا۔ اس طرح قصبۂ قائم گنج کے اردگرد انھوں نے اپنے محلے آباد کر لیے۔ انھیں محلوں میں ایک "موالخیل" ہے جہاں مسعود حسین خاں کے جداعلیٰ حسین خاں ۱۷۱۵ء کے لگ بھگ آکر آباد ہوئے۔

غلام حسین خاں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (صدر جمہوریہ ہند) کے دادا اور والد فدا حسین خاں قائم گنج کے مشہور پٹھان نسل سے تعلق رکھتے تھے بقول یوسف حسین خاں وہ آزاد منش آدمی تھے۔

"اگرچہ افسر الملک سے ان کی دانت کاٹی دوستی تھی لیکن مزاج کے

لحاظ سے دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے ۔ افسر الملک نے انھیں حیدرآباد میں رکھنا چاہا لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں ہوئے ۔ حیدرآباد کی درباری زندگی کے مقابلہ میں انھوں نے قائم گنج کی آزاد اور غیر مصنوعی زندگی کو ترجیح دی ۔"(۱)

غلام حسین خاں المعروف بہ جھمن خاں کا محلے شکل خیل میں مکان تھا فدا حسین خاں اسی مکان میں پیدا ہوئے تھے ۔ یہیں ایک تحصیلی اسکول میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد وہ حیدرآباد چلے گئے ۔ فدا حسین خاں کے حیدرآباد جانے کا سبب ان کے چھوٹے بیٹے محمود حسین خاں یہ بتلاتے ہیں کہ:

" میرے والد کو قدرت کے دست کرم سے علمی ذوق ملا تھا ان کے ذوق کی تسکین ریاست حیدرآباد میں ہو سکتی تھی، چناں چہ وہ قائم گنج سے حیدرآباد دکن گئے ۔"(۲)

لیکن یوسف حسین خاں "یادوں کی دنیا" میں فدا حسین کے حیدرآباد جانے کا سبب تجارت بتلاتے ہیں جس کی تصدیق مسعود حسین خاں کے حوالے سے بھی ہوتی ہے:

" ہمارے والد فدا حسین خاں قائم گنج کے تحصیل اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد گئے ۔۔۔۔۔۔۔ گھر سے ہزار بارہ سو روپے لے کر نکلے تھے کہ اس سے حیدرآباد میں کچھ کاروبار کریں گے ۔"(۳)

فدا حسین خاں ۲۰/ برس کی عمر میں اورنگ آباد میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد حیدرآباد آئے اور بیگم بازار میں قیام کیا ۔ بقول یوسف حسین خاں اس وقت بیگم بازار میں قائم گنج کے بعض لوگ پہلے سے موجود تھے، جن میں رائے پور کے محمد زماں خاں ناظم فوج داری بھی شامل تھے ۔ یہاں آکر فدا حسین خاں نے ابتداء میں مرآد

آبادی برتنوں کا کاروبار کیا ۔ پڑوس میں شمالی ہند کے ایک وکیل صاحب رہتے تھے، ان کی مدد اور مشوروں سے فدا حسین نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور وکالت کے امتحان میں شریک ہو کر درجہ اول میں کامیاب ہوئے ۔

وکالت کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد پریکٹس کی خاطر اورنگ آباد گئے جو اس وقت ریاست حیدرآباد میں شامل تھا ۔ وہاں ایک رسالہ "آئین دکن" جاری کیا جس میں قانون سے متعلق بیس کتابیں تھیں وہ سب کی سب اسی رسالے میں سلسلہ وار شائع ہوتی رہی ۔

۱۹۰۷ء میں جب کہ وہ پیشۂ وکالت میں اپنی اہلیت منوا چکے تھے، دق کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر اپنے آبائی وطن قائم گنج چلے گئے اور وہیں ۱۹۰۷ء میں داعی اجل کو لبیک کہا ۔

فدا حسین کے چھ بیٹے تھے ۔ ساتواں بیٹا محمود حسین خاں ان کے انتقال کے بعد پیدا ہوا ۔ (۱) مظفر حسین خاں (۲) عابد حسین خاں (۳) زاہد حسین خاں (۴) ذاکر حسین خاں (۵) یوسف حسین خاں (۶) جعفر حسین خاں (۷) محمود حسین خاں ۔ مظفر حسین خاں (۴) ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے ۔

ان کے کوئی لڑکی نہیں تھی ۔ مظفر حسین سب سے بڑے بیٹے تھے انھوں نے اٹاوہ سے اسلامیہ ہائی اسکول کی تعلیم کے بعد علی گڑھ سے بی ۔ اے / ایل ۔ ایل ۔ بی کیا ۔ اس کے بعد وہ حیدرآباد آ گئے ۔ کچھ دنوں اکبر یار جنگ کے ساتھ وکالت کی پھر محکمہ عدالت میں بحیثیت مجسٹریٹ تقرر عمل میں آیا ۔ تین سال کے اندر ہی انھیں بھی دق کا عارضہ ہو گیا اس بارے میں یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

> "تین سال کے قریب کار گذار رہے ہوں گے کہ دق کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے ۔ یہ مرض ہمارے خاندان میں ایسا گھسا کہ تباہی بول دی ۔ والد صاحب کا انتقال اسی میں ہوا ۔ سب سے

بڑے بھائی جنھیں ہم بھائی جان کہا کرتے تھے اسی مرض کا شکار ہوئے
"(۵)

مظفر حسین خاں نے ۱۹۲۲ء میں آبائی مکان قائم گنج میں وفات پائی ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں ۔(۱) امتیاز حسین (۲) خدیجہ بیگم (۳) رفیعہ بیگم (۴) مسعود حسین خاں (۵) شاہد حسین خاں ۔ ۲۸/ جنوری ۱۹۱۹ء میں مظفر حسین خاں کے ہاں جھمن خاں کی حویلی کے زنانے حصے میں چوتھے بچے کا جنم ہوا ۔ مظفر حسین خاں نے اپنے بیٹے کا نام مسعود حسین خاں رکھا۔ مظفر حسین خاں کے کل پانچ بچے ہوئے لیکن ان میں صرف تین زندہ رہے اور دو بچپن ہی میں گذر گئے ۔ دونوں بیٹوں نے بہت نام کمایا ۔ بڑے بیٹے امتیاز حسین خاں عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبہ کامرس کے پہلے صدر تھے اور بعد میں ورنگل اور سکندرآباد کالج کے پرنسپل ہوئے ۔ دوران ملازمت ہی ۱۹۶۶ء میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے:

"امتیاز حسین خاں جامعہ سے بی ۔اے کر کے لندن چلے گئے وہاں سے یم ۔ کام ہو کر لوٹے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں استاد ہو گئے ۔ کئی ڈگری کالجوں کے پرنسپل بھی رہے ۔انھیں دل کا روگ لگ گیا تھا اور یہی ان کی موت کا بہانہ ہو گیا اور ۱۹۶۶ء میں انتقال کر گئے ۔"(۶)

مسعود حسین خاں مظفر حسین خاں کے چوتھے بیٹے ہیں ۔ابھی یہ ۳، ۴ برس کے ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ فاطمہ بیگم اپنے بچوں کو لے کر محلے پتورہ اپنی والدہ کے ہاں چلی گئیں ۔ لیکن وہ بھی دو سال بعد یعنی ۱۹۲۴ء میں چل بسیں اس وقت مسعود صاحب کی عمر ۶ سال کے قریب تھی ۔بچوں کی ننھیال میں پرورش ہوتی رہی ۔ نانا ، جان عالم خاں جو ننھے میاں کی عرفیت سے مشہور تھے پتورہ کی خاص شخصیت تھے وہ آخری وقت تک دھوتی ہی پہنتے تھے ۔ نانی اصغری بیگم پتورہ میں "بی" پکاری جاتی تھیں ۔خالہ راحت بیگم تھیں جو یوسف حسین

خاں سے بیاہی گئیں۔ مسعود حسین خاں کا ننھیالی خاندان مشترکہ خاندان تھا۔ پتورہ کے پرائمری اسکول میں مسعود حسین خاں کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔

سب سے بڑے چچا عابد حسین خاں تھے۔ ان کے سبھی چھوٹے بھائی انھیں منجھلے میاں کہتے تھے۔ ابھی وہ ایم۔اے۔ او کالج میں متعلم ہی تھے کہ انھیں بھی دق ہو گیا وہ بھی چل بسے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی پیدائش ۱۸۹۷ء میں حیدر آباد کے محلے بیگم بازار میں ہوئی۔ بیگم بازار کا مکان، ان کے والد نے تعمیر کروایا تھا یہ دو منزلہ عمارت بیگم بازار میں آج بھی فدا حسین کی یاد تازہ رکھے ہوئے ہے۔ ذاکر حسین خاں اس خاندان کے پہلے چشم و چراغ تھے وہ ہندوستان کی ان اولین شخصیتوں میں سے تھے جنھوں نے تحصیل علم کے لیے یوروپی ممالک کا سفر کیا ان کی ابتدائی تعلیم اٹاوہ اسکول میں ہوئی۔ بعد میں علی گڑھ سے تعلیمی مدارج طے کیے۔ جرمنی سے فبروری ۱۹۲۶ء میں معاشیات میں پی ایچ ڈی (Ph.D) کی ڈگری لے کر آئے اور اسی سال جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔ ان کی ساری زندگی تعلیمات سے وابستہ رہی۔ ترقی کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ذاکر صاحب پہلے مسلمان تھے جو صدر جمہوریہ کے عہدے تک پہنچے۔ ذاکر حسین خاں فخر خاندان تو تھے ہی وہ قوم و ملت کے لیے بھی باعث افتخار تھے۔ ۳/ مئی ۱۹۶۹ء کو وفات پائی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دفن ہوئے۔

زاہد حسین خاں تیسرے چچا تھے جو جسمانی حیثیت سے بہت صحت مند تھے۔ چوتھے چچا یوسف حسین خاں تھے وہ ۱۸/ سپتمبر ۱۹۰۲ء میں بیگم بازار کے حیدر آباد والے مکان ہی میں پیدا ہوئے۔ یوسف حسین خاں نے ادبی اور تنقیدی دنیا میں بڑا نام کمایا کئی ایک تصانیف کے مصنف تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ سے وابستہ رہے۔

جعفر حسین خاں پانچویں چچا تھے۔ چھ سال کی عمر میں ان کا انتقال مرض

شجرۂ نسب مسعود حسین خاں

(۱) حسین خاں (معلم اور صوفی) تیراہ کے علاقے سرحد سے قائم گنج آئے

(۲) محمد حسین خاں (ملازم فوج)

(۳) احمد حسین خاں (ملازم فوج)

(۴) غلام حسین خاں (عرف جھمن خاں) ملازمت فوج سرکار نظام افسر الملک

(۵) فدا حسین خاں (مشہور وکیل حیدر آباد دکن چالیس سال کی عمر میں انتقال

(۱) مظفر حسین خاں — (۲) عابد حسین خاں جوانی میں فوت — (۳) زاہد حسین خاں جوانی میں فوت — (۴) ذاکر حسین خاں — (۵) یوسف حسین خاں — (۶) جعفر حسین خاں بچپن میں فوت — (۷) محمود حسین خاں

(۱) امتیاز حسین خاں — (۲) خدیجہ بیگم — (۳) رفیعہ بیگم — (۴) مسعود حسین خاں — (۵) شاہد حسین خاں بچپن میں انتقال

(۱) جاوید حسین خاں — (۲) فریدہ بیگم — (۳) نادرہ بیگم — (۴) شاہدہ بیگم — (۵) زیبا

طاعون میں ہو گیا۔ محمود حسین خاں چھوٹے چچا تھے جو فدا حسین خاں کے انتقال کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ محمود حسین خاں ڈھاکہ میں ہائی اسکول اور کالج کی تعلیم کے دوران مسعود حسین خاں کی علمی سرپرستی کرتے رہے وہ تاریخ کے بہت بڑے اسکالر تھے۔ تاریخ سے ان کو خاص شغف تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی منتقل ہوئے۔ وہاں پروفیسر شعبہ تاریخ، صدر شعبہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور وائس چانسلر کے بڑے علمی عہدوں کے علاوہ سیاسی مناصب پر بھی فائز رہے۔ ۱۹۵۳ء میں کابینہ میں وزیر تعلیم بھی رہے۔ پھر دولت مشترکہ میں حکومت کے مشیر بھی مقرر ہوئے۔ انھوں نے بھی ملیر میں "جامعہ ملیہ ملیر" کی بنیاد ڈالی جو بہت ہی قلیل عرصہ میں علم و فن کا بہت بڑا گہوارا ثابت ہوئی۔ ۱۰ / اپریل ۱۹۷۵ء کو کراچی میں انتقال ہوا اور وہیں جامعہ ملیہ ملیر کے احاطے میں دفن ہوئے۔

بڑے ماموں سلطان عالم خاں تھے۔ یہ سیاست سے وابستہ تھے اور یوپی میں کانگریسی وزارت کے دوران نائب وزیر کے عہدہ پر بھی فائز ہوئے کچھ عرصہ مسلم لیگ سے بھی وابستہ رہے۔ ان کی بیگم رائے پور کے خٹک پٹھانوں (۷) سے تعلق رکھتی تھیں۔ مسعود حسین خاں کی والدہ کے انتقال کے بعد نانی (بی) کے مکان میں ان کی دیکھ بھال زیادہ تر یہی ممانی کرتی تھیں۔

دوسرے ماموں قدوس عالم تھے۔ یہ سلطان عالم خاں سے بہت قریب تھے قدوس عالم خاں کی صاحبزادی نجمہ بیگم سے مسعود حسین خاں کی شادی ہوئی۔ نجمہ بیگم علی گڑھ کے شیروانی پٹھان خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔

تیسرے ماموں غلام ربانی تاباںؔ تھے۔ (۸) مسعود صاحب لکھتے ہیں کہ ان کی بہت سی ذہنی قدریں ان سے مشترک ہیں:

"ان کے اور میرے درمیان بہت سی قدریں مشترک رہی ہیں۔ وہ خاندان کے پہلے شاعر ہیں اور میں دوسرا۔ ہم دونوں کے علاوہ

خاندان کے کسی فرد کو پہلے یا بعد شعر کہنے کی توفیق نہیں ہوئی۔" (۹)

غلام ربانی تاباں پیشہ کے اعتبار سے وکیل تھے لیکن شعر و ادب کے میدان میں انھوں نے خوب نام کمایا۔ ترقی پسند شاعر تھے۔

خورشید عالم خاں چوتھے ماموں ہیں۔ وہ پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت سے کئی بار منتخت ہو چکے ہیں۔ یہ مسعود حسین خاں کے ہم عمر ہیں اور بچپن کے ساتھی بھی۔ ان کی بیگم ڈاکٹر ذاکر حسین کی دختر ہیں۔ خورشید عالم خاں اس وقت صوبہ کرناٹک کے گورنر ہیں۔ ان ہی کے لڑکے سلمان خورشید اب سنٹر میں ڈپٹی منسٹر ہیں۔

ابتدائی تعلیم و تربیت

۱۰/ اگست ۱۹۲۷ء میں محمود حسین خاں نے مسعود صاحب کو جامعہ ملیہ میں درجہ دوم میں داخل کروایا۔ جامعہ ملیہ میں مسعود صاحب نے ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۳ء تک ابتدائی تعلیم کے مدارج طے کیے۔ اس علم و فن کی جامعہ سے مسعود صاحب میں قومی احساسات اور تصورات کا جذبہ پیدا ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اس چھ سال کے قیام نے میری کایا ہی بدل دی۔ میں قائم گنج سے ایک کندہء ناتراش آیا تھا جس میں انا کی صفت کے علاوہ اور کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ جامعہ کے ماحول میں مجھے قومی احساسات اور تصورات کا پہلی بار علم ہوا۔" (۱۰)

جامعہ کے ماحول سے اچھے ہندوستانی اور سچے مسلمان کا تصور ملا۔ یہیں انھوں نے ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور گاندھی جی کو پہلی بار دیکھا۔ جامعہ میں نہ صرف انھوں نے علم حاصل کیا بلکہ چرخہ کاتنے کا فن، ہنڈی کرافٹ، کارپنٹری، خوش خطی، باغبانی اور زراعت کے شعبوں میں بھی معلومات حاصل کیں اور ان کاموں کو سیکھا۔ ہندی زبان اور چرخہ کاتنے کا فن گاندھی جی کے صاجزادے دیوداس گاندھی سے، کارپنٹری ماسٹر عبدالحی سے، خوش خطی رستم قلم محمد علی فرخ آبادی سے سیکھا۔

جب بدیسی چیزوں کا بائیکاٹ چل رہا تھا، سول نافرمانی کی تحریک چل رہی تھی، اس وقت جامعہ بھی ان تحریکات کا مرکز تھی۔یہیں کھدر پوشی کی مہم کو پروان چڑھتے دیکھا ولایتی کپڑوں کو آگ کی ڈھیر ہوتے دیکھا۔ جلیان والا باغ کے واقعے پر سوگ اور سوشیل سروس کے کاموں کو انھوں نے جامعہ میں قریب سے دیکھا۔یہیں سے ان میں علم وادب کا ذوق پیدا ہوا اور اردو زبان سے دلچسپی پیدا ہوئی۔وہ لکھتے ہیں:

"اردو زبان وادب کا چسکا بھی جامعہ کی دین ہے۔" (۱۱)

علامہ اقبال کے ہم وطن اور عقیدت مند نذیر نیازی، جامعہ ملیہ کے استاد تھے ۱۹۳۲ء میں جب وہ کشمیر جارہے تھے تو ذاکر صاحب نے مسعود حسین خاں کو بطور تبدیل آب وہوا ان کے ساتھ کر دیا۔اس موقعہ پر انھوں نے علامہ اقبال کو قریب سے دیکھا۔اس وقت مسعود حسین خاں کی عمر تقریباً ۱۳ سال تھی۔انھیں علامہ اقبال کا اردو کلام ازبر تھا۔ کشمیر میں ان کا قیام ڈھائی ماہ رہا۔یہی ان کا پہلا سفر تھا۔

۱۹۳۳ء میں محمود حسین خاں جرمنی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لے کر ہندوستان آئے اور حیدرآباد میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے ہاں تلاش معاش کے سلسلے میں چلے گئے ان ہی دنوں ذاکر حسین خاں اور امتیاز حسین خاں گرمائی تعطیلات گذرانے حیدرآباد آئے۔اچانک اطلاع ملی کے محمود حسین خاں کا ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں بہ حیثیت ریڈر تقرر ہوگیا ہے تو وہ جانے پر تیار ہوئے اور مسعود صاحب کو بھی ساتھ لے گئے۔اس طرح جامعہ ملیہ کا چھ سالہ علمی دور اختتام کو پہنچا۔

محمود حسین خاں اپنے بھتیجے مسعود حسین خاں کے ساتھ ڈھاکہ پہنچے۔وہاں یونیورسٹی سے الاٹ کردہ ایک مکان میں قیام پذیر رہے۔پڑوسیوں میں رام پور کے ایک صاحب فدا علی خاں تھے جو اردو اور فارسی شعبہ کے صدر تھے۔تھوڑے فاصلے پر مشہور قانون گو صاحب کا مکان تھا۔اس کے بعد صدر شعبہ انگریزی حسن صاحب کی

کوٹھی تھی۔

مسعود صاحب نے جامعہ ملیہ سے آٹھویں درجہ کا امتحان اردو میڈیم سے کامیاب کیا تھا۔ ڈھاکہ میں آرمنی ٹولہ گورنمنٹ ہائی اسکول سے جو ایک ٹریننگ کالج سے ملحق تھا نویں جماعت میں انگریزی میڈیم سے داخلہ لیا۔ یہاں کے ہیڈ ماسٹر مسٹر بسواس بنگالی عیسائی تھے اور تمام اساتذہ بنگالی ہندو تھے۔ صرف اردو فارسی کے ایک مسلمان استاد عندلیب شادانی صاحب کے شاگرد تھے اور اردو میڈم کے صرف تین طالب علم تھے۔

نور الدین مسعود صاحب ڈھاکہ اسکول کے ساتھیوں میں تھے وہ بہار سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کے والد نے ڈھاکہ کی بود و باش اختیار کر لی تھی۔ اس وقت ڈھاکہ کے نوابوں میں بنگالی کا اثر زیادہ تھا۔ ڈھاکہ میں میٹرک کے امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کی، ۷۵% فیصد نشانات حاصل کیے اور تعلیمی وظیفے کے مستحق قرار پائے۔ اس کے بعد ڈھاکے کے ممتاز انٹرمیڈیٹ گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ جامعہ کے اسکول کے اساتذہ میں سب سے بارعب شخصیت برکت علی صاحب کی تھی۔ برکت علی صاحب ریاضی کے استاد تھے۔ وہ بجنور کے رہنے والے تھے۔ لہجہ سخت تھا، خالص کھڑی بولی بولتے تھے۔ اردو کے استاد مولوی سعید انصاری تھے۔ یہ وہی سعید انصاری تھے جو مسعود صاحب کی جامعہ ملیہ میں وائس چانسلری کے زمانے میں جامعہ ملیہ کی تعمیر کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ وہ مسجد کا فرش، سنگ مرمر کا بنانا چاہتے تھے ان کے منصوبے اور لگن و ریاضت سے یہ کام تکمیل پایا۔ اس کا نقشہ مشہور آرکٹیک فیاض الدین صاحب حیدرآبادی کا بنایا ہوا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں اینگلو عربک کالج میں جو اب ذاکر حسین کالج کہلاتا ہے، بی۔ اے میں داخلہ لیا اور بی۔ اے کی ڈگری امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ آئے اور ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ مسعود صاحب نے پہلے ایم۔ اے ہسٹری میں داخلہ لیا تھا لیکن بہت جلد پروفیسر مجیب

کی ترغیب پر انھوں نے ایم۔اے اردو میں داخلہ لے لیا۔ایم۔اے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر آل احمد سرور ان کے خاص اساتذہ تھے۔

انھوں نے سرور صاحب کے "قاموسی علم" اور رشید صاحب کے "وجدانی علم" دونوں سے فائدہ اٹھایا اور ۱۹۴۱ء میں ایم۔اے درجہ اول سے کامیاب ہوئے۔ایم۔اے میں ایک پرچہ اردو زبان کا تھا، جس میں مولوی عبدالحق صاحب نے سو میں سے چوراسی نشانات دیے تھے۔ایم۔اے میں پریم چند کی افسانہ نگاری پر مقالہ لکھا۔یہ پریم چند پر اولین تحقیق اور تنقید تھی۔

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"مسعود حسین خاں بھی ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ایم۔اے میں انھوں نے پریم چند پر ایک مقالہ لکھا تھا۔" (۱۲)

ستمبر ۱۹۴۳ء میں پروفیسر مسعود حسین خاں علی گڑھ آگئے اور شعبۂ اردو میں پی۔ایچ۔ڈی کا کام شروع کیا۔مقالہ کا موضوع تھا "اردو زبان کی ابتداء اور ارتقاء" رشید احمد صدیقی نے پروفیسر آل احمد سرور کو ان کی نگرانی کا کام سپرد کیا اور انھوں نے صرف دو سال کے عرصے میں پی۔ایچ۔ڈی کی تکمیل کی اور ۱۹۴۵ء میں ڈگری حاصل کی۔ ممتحنین کی اعلیٰ رپوٹوں کی وجہ سے یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل نے ان کے لیے مبارک باد کا خصوصی ریزولیشن پاس کیا۔

۱۹۴۸ء کا سال ان کے لیے بہت ساز گار رہا۔اسی سال ان کی شادی ہوئی اور مقدمہ "تاریخ زبان اردو" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا جس کی اشاعت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ستمبر ۱۹۵۰ء میں لندن یونیورسٹی کے "اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز (SOAS) لسانیات میں پی۔ایچ۔ڈی کے لیے داخلہ لیا اور پروفیسر فرتھ سے شاگردی کا شرف حاصل کیا لیکن بہت جلد ہی وہاں سے پیرس منتقل ہوگئے۔لسانیات

پر اپنا مقالہ وہیں مکمل کیا۔

" پہلے لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ آفریکن اسٹڈیز (SOAS) میں لسانیات میں پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے لیے داخلہ لیا مگر وہاں پروفیسر فرتھ سے نہ بنی تو پیرس چلے گئے اور وہاں "اردو لفظ پر پی۔ایچ ڈی کیا۔(۱۳)

ملازمتیں

۱۹۴۱ء میں ایم۔اے کا امتحان دینے کے بعد ان کے سامنے وہی مسئلہ تھا جو ہر نوجوان طالب علم کے سامنے ہوتا ہے۔اردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد انھیں بھی ملازمت تلاش کرنی پڑی لیکن کامیابی نہیں ہوئی بے کاری کے بجائے مسعود صاحب نے ڈبل ایم۔اے کرنے کی ٹھانی۔دہلی میں کشمیری گیٹ کے پاس ہندو کالج میں فلسفہ کے طالب علم ہوگئے۔

یہ دوسرے سال میں تھے کہ انھیں آل انڈیا ریڈیو سے انٹرویو کارڈ ملا۔مارچ ۱۹۴۳ء میں بحیثیت پروگرام اسسٹنٹ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں تقرر عمل میں آیا۔یہاں ہندوستانی ٹاکس Hindustani Talks کا کام سونپا گیا۔اس دوران وہ اردو ہندی زبانوں کی ٹاکس کا پروگرام بناتے اور پھر اس کے لیے مناسب ٹاکرز کو بک کرتے تھے اس ملازمت کا وقفہ بہت ہی مختصر رہا اور یہ احساس ہونے لگا کہ یہ جگہ ان کے لیے مناسب نہیں ہے۔ستمبر ۱۹۴۳ء میں چھ ماہ کے اندر ہی اس عہدہ سے سبک دوش ہوگئے اور علی گڑھ آگئے۔

نومبر ۱۹۴۳ء میں عارضی طور سے شعبہ اردو میں تقرر ہوا اور رشید احمد صدیقی کی سفارش پر "امین ہاسٹل" کے ریزیڈنٹ وارڈن بنائے گئے۔اس دوران انھیں ریسرچ کا موقعہ ہاتھ آیا اور ۱۹۴۵ء میں مقالہ مکمل کرکے داخل کیا۔اس کے بعد ہی اردو کے لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا۔۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۴ء بحیثیت لکچرر کار گذار رہے۔ستمبر ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں بحیثیت ریڈر ترقی ہوئی۔اس وقت یہ ایم۔اے کی کلاسوں کو زبان اردو، دکنی اردو، جدید شاعری اور اقبال پڑھاتے رہے

۱۹۵۵ء میں پونا میں ماہرین لسانیات کی کانفرنس میں شرکت کے بعد انھیں مختصر مدتی اور طویل مدتی ، گرمائی ، لسانیاتی اسکول کے مدرس کی حیثیت سے مدعو کیا گیا ۔ ۱۹۵۹ء میں معہ خاندان امریکہ گئے اور وہاں سے فیلو شپ کے ختم ہونے کے بعد ۱۹۶۰ء میں علی گڑھ لوٹ آئے ۔یہاں پروفیسری کا موقعہ نہ مل سکا، بحیثیت ریڈر کام کرنے سے خوش نہیں تھے حیدرآباد میں ایک پروفیسر کی آسامی خالی ہوئی تو انٹرویو کے لیے بلایا گیا اور وہاں ان کا انتخاب عمل میں آیا۔

جون ۱۹۶۲ء میں شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر عبدالقادر سروری کے وظیفہ پر سبک دوش ہونے کے بعد صدر شعبہ اردو کا چارج لیا اور اہل خاندان کے ساتھ حیدرآباد منتقل ہوگئے ۔ حیدرآباد کا قیام علمی و تحقیقی اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کے لیے بڑا سودمند رہا انھوں نے بہت سے تحقیقی اور ادبی کارناموں کو اس دوران مکمل کیا اور محققین کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے تحقیق کا کام کروایا۔

مسعود صاحب کی وداعی تقریب پر ڈاکٹر حفیظ قتیل نے کہا تھا۔

" مسعود صاحب نے تحقیق کا پہیہ ایسا زور سے گھمایا کہ ان کے جانے کے بعد بھی مدتوں گھومتا رہے گا۔" (۱۴)

علی گڑھ میں پروفیسر کے تقرر کے متعلق پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ ان کی کوشش اور تجویز پر مسعود صاحب کو علی گڑھ میں پروفیسر بنایا گیا۔

" ان کا تقرر عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر اردو اور صدر شعبہ کی حیثیت سے ہوگیا حیدرآباد میں یہ خاصے مقبول تھے مگر علی گڑھ آنا چاہتے تھے ادھر میں اردو کے شعبہ میں لسانیات کا مضمون شروع کرادیا اور بعد میں اس میں پروفیسری بھی مل گئی اور شعبہ بھی الگ ہوگیا ۔ جون ۱۹۶۸ء میں میری کوشش سے ان کا تقرر لسانیات کے پروفیسر کی حیثیت سے ہوا۔" (۱۵)

لسانیات کا ایک پرچہ پہلے سے ایم ۔ اے اردو میں موجود تھا جسے مسعود صاحب ہی پڑھاتے تھے ۔ اپنی سوانح حیات میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے علی گڑھ میں پروفیسری کے تقرر پر صرف پروفیسر عبدالعلیم کی مساعی کا ذکر کیا ہے اس پر آل

احمد سرور کو اعتراض ہے وہ لکھتے ہیں:

"جون ۱۹۶۸ء میں لسانیات کے پروفیسر کی حیثیت سے مسعود حسین خاں کا تقرر ہوا اس سے پہلے علی یاور جنگ کے زمانے میں بھی پروفیسر کی جگہ کا اشتہار ہوا تھا پھر تقرر کیوں نہ ہوسکا؟ اس لیے کہ سرور صاحب کی خواہش نہیں تھی۔ اس وقت علیم صاحب وائس چانسلر تھے اور ڈاکٹر نورالحسن ڈین۔ میں نے دونوں سے پہلے ہی بات کرلی تھی۔ اگست ۱۹۶۸ء میں مسعود صاحب آگئے۔ اپنی خود نوشت، ورود مسعود میں انھوں نے اپنے آنے کے لیے صرف علیم صاحب کی عنایت کا ذکر کیا ہے۔" (۱۶)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم باوجود سیاسی اختلافات کے مسعود صاحب کے بڑے قدر داں تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے پرو وائس چانسلر فضل الرحمن صاحب سے یہ خواہش کی کہ کسی طرح مسعود صاحب شعبہ اردو علی گڑھ میں لسانیات کی پروفیسری کے لیے تیار ہوجائیں۔ فضل الرحمن صاحب کو یہ ہدایت بھی کی کہ وہ اس سلسلے میں مسعود صاحب کی مرضی لینے کے لیے حیدرآباد لکھیں۔ فضل الرحمن صاحب کا کہنا تھا کہ انھوں نے خط لکھا تھا لیکن وہ آج تک مسعود صاحب کو نہیں ملا۔ (۱۷)

اس کے بعد مسعود صاحب نے کچھ شرائط کے ساتھ اس عہدے کو قبول کرلیا اور اگست ۱۹۶۸ء میں پھر علی گڑھ واپس آئے اور اپنے ذاتی مکان جاوید منزل دودپور منتقل ہوگئے علی گڑھ میں تقرری کے بعد ڈاکٹر صاحب تاریخ زبان اردو کی کلاسس لیتے رہے۔ لسانیات کا شعبہ ۱۹۶۹ء میں باقاعدہ قائم ہوچکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب شعبہ لسانیات میں منتقل کردیے گئے۔ اس وقت چار طالب علم تھے وہاں انھوں نے اس شعبہ کو خوب ترقی دی۔ ۱۹۶۸ء میں چھ ماہ کے لیے ہفتہ وار "ہماری زبان" اور سہ ماہی "اردو ادب" کے ایڈیٹر رہے اور انجمن ترقی اردو ہند کے قائم مقام سکریٹری بھی۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء کے دو سال ان کے لیے بہت مصروف گزرے۔ اسی دوران انھوں نے عاشورہ نامہ (روشن علی) (جس کا واحد نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ تھا) کا

متن معہ مقدمہ کے مرتب کیا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں جنوری ۱۹۷۳ء میں جامعہ اردو علی گڑھ کے شیخ الجامعہ بنائے گئے۔ جامعہ اردو علی گڑھ اردو کی تعلیم و تدریس کا اہم مرکز ہے۔ یہ ایک وسیع ادارہ ہے جس کی جڑیں سارے ہندوستان میں اور بیرونی ممالک میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ جامعہ اردو علی گڑھ میں شیخ الجامعہ بنے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا اس بوجھ کو برداشت کرنے کے لئے شانے عادی بھی نہیں ہوئے تھے کہ جامعہ ملیہ نئی دہلی کی وائس چانسلری پر ستمبر ۱۹۷۳ء میں تقرر عمل میں آیا۔ یہ دو اہم ذمہ داریاں ڈاکٹر صاحب بیک وقت اٹھاتے رہے اور نبھاتے رہے۔ یہ وہی جامعہ ملیہ ہے جہاں مسعود صاحب نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، یہ وہی مقام تھا جہاں ان کا بچپن گذرا تھا۔ چالیس سال کے طویل وقفہ کے بعد اسی جامعہ کا سپوت جامعہ کی خدمت کے لیے بحیثیت وائس چانسلر نامزد ہوا۔

جامعہ ملیہ میں اس وقت اردو کسمپرسی میں تھی۔ شعبہ اردو میں ایم۔ اے کلاسس کا آغاز ہوا۔ اردو پروفیسر کے لیے پوسٹ نکالی گئی شعبہ اردو میں گوپی چند نارنگ کا پروفیسر کی حیثیت سے تقرر کیا گیا۔ جامعہ کے ماحول کے بارے میں "ورود مسعود" میں ڈاکٹر صاحب نے کئی ایک تنازعات کا ذکر کیا ہے۔ یہ زمانہ جامعہ کا پر آشوب زمانہ تھا۔ کئی ایک تنازعات کی ڈاکٹر صاحب نے خود یکسوئی کی اور کچھ کا یہ خود شکار ہوئے جس کا ان کی شخصیت پر گہرا اثر پڑا۔

وائس چانسلر کی مدت ۳/ نومبر ۱۹۷۸ء کو ختم ہونے والی تھی لیکن ۱۵/ اگست ۱۹۷۸ء کو انھوں نے اپنی بھی آزادی کا دن منصور کیا اور امیر جامعہ کی خواہش کے باوجود قبل از وقت جامعہ ملیہ سے سبک دوش ہو گئے۔ جامعہ ملیہ کی ملازمت کے دوران ڈاکٹر صاحب کی علمی و ادبی سرگرمیاں تقریباً بند ہی رہیں اور اس دوران انھوں نے ایک آدھ مضمون لکھا ہو تو لکھا ہو۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ:

> "جامعہ پہنچ کر مجھے بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ تصنیف کا قلم رکھ کر دستخطوں کے قلم پر اکتفا کرنا ہوگا۔ جامعہ کے میرے پونے پانچ سال اس لیے علمی اعتبار سے بنجر رہے۔" (۱۸)

جامعہ اردو علی گڑھ کی وائس چانسلری پر ۲۲سال سے برابر خدمات انجام دیتے رہے ہیں ۔اس عہدہ پر تقرر بذریعہ انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے ۱۹۷۳ء کے بعد سے اب تک مسلسل بحیثیت شیخ الجامعہ کے مامور ہیں ۔

۲۸/ جنوری ۱۹۷۳ء میں شیخ الجامعہ کے عہدے کے لیے پروفیسر مسعود حسین خاں کا نام پروفیسر آل احمد سرور نے تجویز کیا تھا اور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے تائید کی تھی ۔اس عہدے کا انتخاب چار سال میں ایک دفعہ ہوتا ہے ۔دوسری مرتبہ ۲۴/ سپتمبر ۱۹۷۷ء کو دہلی میں جامعہ اردو کے عہدہ داروں کا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر رفیق ذکریا امیر جامعہ نے کی ۔اس وقت پینل میں تین نام (۱) پروفیسر مسعود حسین خاں (۲) جناب سید محمد حسن (۳) نسیم قریشی کے پیش کیے گئے تھے لیکن مسعود حسین خاں کو دوبارہ بہ اتفاق رائے منتخب کیا گیا ۸/ جولائی ۱۹۸۱ء کی میٹنگ میں اعزازی عہدہ داروں و اراکین جامعہ کی معیاد انتخاب تین سال سے بڑھا کر چار سال کر دی گئی اور آئین کا نفاذ ۷/ اگست ۱۹۸۳ء سے عمل میں آیا ۔۲۸/ سپتمبر ۱۹۸۳ء کو چار سال کے لیے پھر مسعود صاحب کا شیخ الجامعہ جامعہ اردو کی حیثیت سے انتخاب عمل میں آیا ۔۱۸/ اگست ۱۹۸۸ء کو مجلس عام کا ایک جلسہ زیر صدارت ڈاکٹر رفیق ذکریا انٹرنیشنل سنٹر دہلی میں منعقد ہوا ۔اس جلسہ میں ڈاکٹر رفیق ذکریا امیر جامعہ، مالک رام نائب امیر جامعہ چار سال کے لیے منتخب ہوئے تھے ۔شیخ الجامعہ کے لیے تین ناموں کا پینل دیا گیا تھا ۔(۱) پروفیسر مسعود حسین خاں (۲) ڈاکٹر خلیق انجم (۳) ڈاکٹر عبدالمغنی ۔امیر جامعہ نے آئین میں مذکورہ اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے ان تین ناموں کے پینل میں سے پروفیسر مسعود حسین خاں کو شیخ الجامعہ منتخب کیا ۔اگست ۱۹۹۲ء میں وہ ایک بار پھر چار سال کے لیے شیخ الجامعہ منتخب کر لیے گئے ۔

۱۹۷۸ء میں جامعہ ملیہ سے سبک دوش ہوئے اس طرح باضابطہ ملازمت کا سفر علی گڑھ سے ۱۹۴۳ء میں شروع ہوا اور علی گڑھ پر ہی ۱۹۸۱ء میں ختم ہوا ۔

اگست ۱۹۸۰ء میں شعبہ لسانیات سے سبک دوش ہو گئے تھے لیکن مزید ایک سال سپتمبر ۱۹۸۰ء تا سپتمبر ۱۹۸۱ء تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ لسانیات کے وزیٹنگ پروفیسر رہے ۔

سپٹمبر ۱۹۸۱ء تا دسمبر ۱۹۸۱ء اور مارچ ۱۹۸۲ء تا دسمبر ۱۹۸۲ء تک اقبال انسٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر میں وزیٹنگ پروفیسر رہے۔

دوران ملازمت مسعود حسین خاں کو کئی اعزازات حاصل ہوئے۔ سب سے پہلے

(۱) " اسوسی ایشن آف ایشین اسٹڈیز Association Of Asian Studies مشی گن امریکہ کی جانب سے سینئر فیلو شپ کا اعزاز ملا۔ یہ فیلو شپ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۵۹ء کے لیے تھا۔

(۲) اس کے بعد ڈپارٹمنٹ آف ساوتھ ایشین اسٹڈیز یونیورسٹی آف کیلی فورنیا برکلے امریکہ

Dep. Of South Asian Studies, University of California, Barkale, U.S.A میں ۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۰ء وزیٹنگ اسوسی ایٹ پروفیسر (Visiting Associate Professor) رہے۔

(۳) ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۲ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹاف اسوسی ایشن کے صدر بننے کے کا اعزاز ملا۔

(۴) ۱۹۷۳ء تا ۱۹۸۵ء ترقی اردو بورڈ بیورو کی اصطلاحات کمیٹی برائے لسانیات کے صدر رہے۔

(۵) ۱۹۷۳ء سے تاحال جامعہ اردو علی گڑھ کے شیخ الجامعہ منتخب ہوتے رہے۔

(۶) ۱۹۷۸ء میں ترقی اردو بورڈ بیورو وزارت ہند کے نائب صدر بنائے گئے۔

(۷) ۱۹۸۷ء میں انھیں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات سے سب سے بڑا اعزاز پروفیسر ایمے ریٹس ملا۔

(۸) ۱۹۷۴ء تا ۱۹۸۴ء گیان پیتھ ایوراڈ کی انتخابی کمیٹی کے رکن رہے۔

(۹) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۵ء تک رکن رہے۔

(۱۰) دوبارہ ۱۹۹۲ء میں تین سال کے لیے منتخب ہوئے۔

(۱۱) انجمن ترقی اردو ہند کے تاحیات رکن بنائے گے۔

(۱۲) ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۸ء تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مجلس عام کے رکن رہے۔

شادی اور تاہل

۱۹۴۱ء میں مسعود صاحب جب علی گڑھ سے قائم گنج چھٹیاں گزارنے آئے تو ان کی نظریں اپنے ماموں (قدوس عالم خاں) کی بڑی صاجزادی نجمہ پر پڑنے لگیں۔ قدوس عالم خاں (نواب یوسف خاں شیروانی) کے داماد تھے۔ ان کی بیوی (ممانی) مسعود صاحب کو بہت چاہتی تھیں۔ نجمہ دوسری لڑکیوں کی طرح ان کی خدمت کرتی تھیں۔ مسعود صاحب کو ان سے قریب انسیت کا احساس ہونے لگا جس کا اندازہ ان کی شاعری سے ہوسکتا ہے۔ اس زمانے میں ان کا شعری ذوق ترقی پر رہا۔ ہچکولے، میں کیسے آنکھ اٹھاؤں، موج کا گیت، آج تو شاید وہ آجائے، آج ہی انکار وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۵ء کے درمیان لکھی گئیں۔ ۱۹۴۴ء میں مسعود حسین خاں کے بھائی بہن اور ان کی ممانی کی تحریک پر نجمہ صاحبہ سے باضابطہ نسبت طے پائی جس میں نانی (بی) اور ناما) (جان عالم خاں) بھائی امتیاز حسین خاں کی رضامندی بھی شامل تھی۔ ان کی نظم "جمال یار" ان ہی خوش گوار لمحات کی یادگار ہے۔

۱۹۴۷ء میں جب مسعود حسین خاں چھٹیوں میں قائم گنج آئے تو اس وقت ممانی کی صحت حد درجہ خراب ہوچکی تھی۔ دق کا عارضہ شدت اختیار کر چکا تھا۔ مسعود صاحب اور نجمہ صاحبہ کے لوگ یکجا جمع ہوچکے تھے۔ ماں کی زندگی کو خطرہ دیکھ کر خاندان والوں نے لڑکی کی شادی مقرر کر دی۔ دلہن مانجھے بیٹھ چکی تھی کہ ۳۰/ جنوری ۱۹۴۸ء کو گاندھی جی کی وفات کی اطلاع ملی۔ شادی ملتوی ہو گئی۔ تین دن بعد ۳/ فبروری کو سہ پہر نجمہ صاحبہ کے ساتھ رسم نکاح انجام پائی اسی دن ان کے بھائی بدر عالم خاں کی بھی شادی بالکل ہی سادہ طریقہ پر انجام پائی۔ چھ ہفتے بعد معہ اہلیہ علی گڑھ آئے اور انجنیر نگ کواٹر نمبر ۴ میں سکونت اختیار کی۔

انجنیرنگ کواٹر نمبر ۴ میں شادی کے ڈھائی سال بعد ۲/ جنوری ۱۹۹۰ء میں ان کے گھر لڑکے کی ولادت ہوئی اس موقعہ پر "ننھا شاہکار" نظم کی تخلیق ہوئی۔ لڑکے

جاوید حسین خاں کے بعد چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ جاوید حسین خاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے انجینیرنگ کالج میں طبیعات کے پروفیسر ہیں۔ پہلی لڑکی فریدہ بیگم ہیں جن کا نکاح ڈاکٹر عبدالرشید سے ہوا۔ وہ لکھنو میں رہتی ہیں۔ دوسری لڑکی نادرہ ہیں وہ اپنے شوہر ناصر محمد خاں کے ساتھ جدہ میں مقیم ہیں۔ تیسری لڑکی شاہدہ خالہ زاد بھائی شارق عالم خاں آفریدی سے کراچی میں بیاہی گئیں اور فی الحال امریکہ میں مقیم ہیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی زیبا جو حیدرآباد میں پیدا ہوئی تھیں محمد عمران خاں کی بیگم ہیں اور دہلی میں مقیم ہیں۔ نجی زندگی میں مسعود صاحب کی دلچسپی اور خوش حالی کا ثبوت ڈاکٹر صاحب کی اس تحریر سے ملتا ہے۔

"نجمہ کا کہنا ہے کہ عین غیظ کے عالم میں بھی اس کے اس اعتماد میں کبھی کمی نہیں آئی کہ میں اسے دل سے چاہتا ہوں اس لیے انتظار کرتی رہی کہ اس وحشی رمیدہ پر بھی کبھی تو فتح حاصل ہوگی۔ عمر کے ساتھ ساتھ ہم دونوں کی محبت رفاقت سے مل کر دو آتشہ ہو گئی۔ "اب من تو شدم تو من شدی" کا مقام ہے۔ وہ یقیناً میرا نصف بہتر ہے اور میں اس کا نصف کم تر۔" (۱۹)

اپنی بیگم سے انھیں حقیقی محبت ہے اور وہ اپنی خوش حالی اور شعری فطرت میں بیگم کی شخصیت کو بھی ساتھ میں رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر مجھے زندگی دوبارہ عطا ہو تو نجمہ کے ساتھ شعر کی دیوی کا پھر خواہش مند رہوں گا۔" (۲۰)

اور وہ اس کے خواہش مند ہیں کہ مسعود صاحب کی زندگی میں دیر تک ان کی ہم سفر رہی ہیں۔" (۲۱)

سفر

ڈاکٹر صاحب نے کئی ایک سفر کیے ۔ علمی سفر کا آغاز تو ابتدائے عمر ہی سے ہوتا ہے ۔ ان کی ابتدائی تعلیم وطن سے دور ڈھاکہ اور بعد میں دہلی میں ہوئی لیکن اعلیٰ تعلیم کی غرض سے بیرونی سفر ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا ۔ اس سال وہ لسانیات کی اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کے سلسلہ میں انگلستان گئے وہاں اسکول آف اورینٹل اینڈ آفریکن اسٹڈیز لندن

(School Of Oriental and African Studies,London) میں ۱۹۵۰ میں داخلہ لیا ۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۱ء تک لسانیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ۔ اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں فرانس گئے اور پیرس یونیورسٹی میں ڈکٹرڈیونیورسٹے (Doctoratd, Universite) کی ڈگری حاصل کی ۔

سینئر فیلوشپ اسکالر کی حیثیت سے ۱۹۵۸ء میں امریکہ کا سفر کیا ۔ اس دوران وہ آسٹن اور ہارورڈ یونیورسٹی گئے ۱۹۵۹ء میں کیلی فورنیا برکلے ، امریکہ گئے وہاں وہ ۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۰ء تک وزیٹنگ اسوسی ایٹ کی حیثیت سے پروفیسر رہے ۔ ۱۹۷۶ء میں سرکاری حج ڈیلیگیشن رکن کی حیثیت سے حج کا مقدس سفر کیا ۔ اس کے بعد اس پاک سرزمین پر ان کا دوسرا سفر ۱۹۷۷ء میں عالمی اسلامی کانفرنس کے سلسلے میں ہوا ۔

۱۹۷۷ میں سرکاری وفد کی حیثیت سے سعودی عرب کا سفر کرنے کے بعد جنوری ۱۹۸۶ء میں حکومت ہند کے ثقافتی وفد کی حیثیت سے وزارت تعلیم کی جانب سے پاکستان گئے ۔ ایک سال کے اندر ہی پھر دسمبر ۱۹۸۶ء میں نیاز میموریل خطبہ پیش کرنے اور نیاز فتح پوری ایوارڈ حاصل کرنے کراچی کے سفر پر روانہ ہوئے ۔ نیاز فاؤنڈیشن کی دعوت پر کراچی میں نیاز فتح پوری کی زبان اور اسلوب پر یادگاری خطبات دیئے ۔

ادارت

مسعود صاحب نے ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض منصبی کو بہت خوب نبھایا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں جب شعبہ اردو کے صدر تھے تو ۱۹۶۵ء میں ایک تحقیقی مجلہ جاری کیا اور اس کا نام "قدیم اردو" رکھا۔ جلد اول ۱۹۶۵ء، جلد دوم ۱۹۶۷ء جلد سوم ۱۹۶۹ء اور چہارم ۱۹۷۲ء کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ جلد سوم و چہارم شعبہ لسانیات علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ یکم / اکتوبر ۱۹۶۹ء تا یکم مئی ۱۹۷۰ء اور ۸ / سپتمبر ۱۹۷۲ء تا ۲۲ / اکتوبر ۱۹۷۲ء تک "ہماری زبان" کے ایڈیٹر رہے۔ اس اثنا میں "اردو ادب" کے جو اس وقت علی گڑھ سے شائع ہوتا تھا ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۰ء ایڈیٹر رہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا تحقیقی مجلہ "فکر و نظر" پہلے ڈاکٹر صاحب کی ادارت میں شائع ہوا ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۳ء تک کے شماروں کے بھی یہ ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد پھر ان شماروں کو نمبر (ا) سے شائع کیا گیا۔

تصانیف وانعامات

ڈاکٹر صاحب کے ادبی کارنامے مختلف موضوعات پر ہیں یعنی تحقیق، تنقید، لسانیات، ادب، لغت نویسی اور تخلیق

ا۔ "مقدمہ تاریخ زبان اردو": ۔ ڈاکٹر صاحب کا پہلا تحقیقی کارنامہ ہے جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۸ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ یہ دراصل ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے لکھا ہوا مقالہ ہے۔ یہ لسانیاتی تحقیق آج علمی دنیا میں حوالہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے نو ایڈیشن اب تک شائع ہوئے ہیں۔ ساتویں ایڈیشن کی اشاعت ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے ۱۹۸۷ء میں عمل میں آئی اس میں ترمیم و اضافہ کیا گیا۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا اس کے بعد جلد ہی تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۶ء میں اردو مرکز لاہور کی جانب سے پاکستان میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن میں نئے مواد اور تحقیقات کی

روشنی میں اضافہ کیا گیا۔

۲ ۔ " اردو زبان و ادب ": ۔ ان کی ادبی مضامین کا مجموعہ ہے ۔ جس میں انھوں نے ادبی، تنقیدی اور لسانی مضامین کو شامل کیا ہے ۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۲ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں علی گڑھ ہی سے شائع ہوا ۔ ۱۹۸۳ء میں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ کی جانب سے تیسرے ایڈیشن کی اشاعت عمل میں آئی اس کتاب میں زیادہ تر مضامین اسلوبیات سے متعلق ہیں ۔ اقبال ۔ جوش، اصغر گونڈوی اور عظمت اللہ خاں کے کلام پر ماہر لسانیات کی حیثیت سے تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

۳ ۔ " روپ بنگال ": ۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۴ء میں دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوا ۔ ۱۹۵۶ء میں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

۴۔ A phonetic And Phonological Study of the word In Urdu یہ انگریزی تحقیقی مقالہ ۱۹۵۴ء میں شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہوا۔

۵ ۔ " دو نیم ": ۔ ۱۹۵۶ء میں جب مسعود صاحب بیرونی سفر سے آئے تو مختلف واقعات و حالات کے سایہ میں ان کی شاعری سر سبز ہونے لگی تھی شاعری کا تخلیقی سفر پورے عروج پر تھا یہی احساسات، غزلوں گیتوں اور نظموں کی شکل میں ابھرا ہے ۔ ۱۹۵۶ء میں مجموعہ کلام دو نیم شائع ہوا ۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۶ء میں مزید اضافہ کے ساتھ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے شائع کیا۔

۶ ۔ " شعر و زبان ": ۔ قیام حیدر آباد، مسعود صاحب کے علمی و تحقیقی کارناموں کے لیے بہت سازگار ثابت ہوا جس کا اعتراف انھوں نے " ورود مسعود " میں بھی کیا

ہے۔۱۹۶۶ء میں حیدرآباد سے ادبی مضامین کا یہ مجموعہ شائع ہوا جس میں چند تحقیقی مضامین بھی ہیں۔اس کا کوئی اور ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔

۷۔ "اردو کا المیہ": ۔ اردو کے مسائل پر مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔یہ اداریوں اور انشائیوں کا مجموعہ ہے جس کی اردو حلقہ میں بہت پذیرائی ہوئی۔

۸۔ "اقبال کی نظری و عملی شعریات": ۔ اس کا پہلا ایڈیشن اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا جس میں اقبال کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔دوسرا ایڈیشن سرسید بک ڈپو علی گڑھ سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔اس پر ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ ملا۔

۹۔ "اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ": ۔ یہ ایک مختصر مقالہ ہے جس کا ترجمہ کر کے مرزا خلیل احمد بیگ ریڈر شعبہ لسانیات علی گڑھ یونیورسٹی نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔

۱۰۔ "بکٹ کہانی": ۔ قدیم اردو جلد اول ۱۹۶۵ء میں شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی سے بکٹ کہانی ترتیب دے کر مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۰ء میں ادارۂ فروغ اردو لکھنو سے شائع ہوا۔جس میں نورالحسن ہاشمی کا اشتراک تھا۔اس کے بعد ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۶ء میں اس کے اور ایڈیشن شائع ہوئے۔

۱۱۔ "پرت نامہ": ۔ یہ بھی قدیم اردو جلد اول میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔

۱۲۔ "قصہ مہر افروز و دلبر": ۔ شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی جانب سے ۱۹۶۶ء میں قصہ مہر افروز دلبر، کا متن معہ مقدمہ کے مرتب کر کے قدیم اردو میں شائع کیا۔اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے بڑی خوب صورتی کے ساتھ شائع ہوا۔اس میں نظر ثانی شدہ مقدمہ بھی شامل ہے۔اس کا ایک

ایڈیشن دیوناگری رسم الخط میں حیدر آباد سے ہی ۱۹۶۶ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا مقدمہ ہندی زبان میں ہے اور متن صرف دیوناگری زبان میں منتقل کیا گیا ہے۔

۱۳۔ "دکنی اردو کی لغت": ۔ قدیم فنون کی ترتیب کے لیے قدیم اردو اور دکنی اردو لغت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی کی جانب سے دکنی اردو لغت کا پروجکٹ تیار ہوا۔یہ لغت ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔اس میں تقریباً ۹۰۳۰ الفاظ ہیں۔

۱۴۔ "ابراہیم نامہ": ۔ یہ بھی قیام حیدر آباد کا ایک بہت بڑا تحقیقی کارنامہ ہے جس کو ۶۸ صفحات کے تفصیلی مقدمہ کے ساتھ قدیم اردو جلد سوم میں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔یہ بڑا ہی دقت طلب تحقیقی کارنامہ تھا۔اس تصنیف کی ترتیب و تدوین میں ڈاکٹر صاحب نے بڑی عرق ریزی سے کام کیا ہے۔اس کا علاحدہ ایڈیشن شعبہ لسانیات علی گڑھ سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔

۱۵۔ "عاشور نامہ": ۔ ۳۰ صفحات پر مشتمل مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔جو ۱۹۷۲ء میں شعبہ لسانیات علی گڑھ سے قدیم اردو جلد چہارم میں شائع ہوا جس کا کوئی اور ایڈیشن ابھی تک شائع نہیں ہوا۔عاشور نامہ سفارش حسین کے اشتراک سے مرتب کیا گیا جس کی تفصیل اگلے ابواب میں آئے گی۔

۱۶۔ "رقعات رشید صدیقی": ۔ ۱۹۸۱ء میں شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے رشید احمد صدیقی صاحب کے ان خطوط کو شائع کیا ہے جو پروفیسر مسعود حسین خاں کو ۱۹۴۴ء تا ۱۹۷۶ء کے دوران لکھے گئے تھے۔اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۷ء میں خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ سے جرنل ۴۳ میں شائع ہوا۔

۱۷۔ "اردو زبان تاریخ تشکیل، تقدیر": ۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب

سے پروفیسر ایمے ریٹس بنائے جانے کے بعد مسعود صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جو خطبہ دیا تھا اس کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات نے ۱۹۸۸ء میں "اردو زبان تاریخ، تشکیل، تقدیر کے عنوان سے شائع کیا ہے۔

۱۸۔ "وردِ مسعود": ۔ ۱۹۸۸ء میں "وردِ مسعود" خود نوشت سوانح حیات خدا بخش لائبریری کی جانب سے شائع ہوئی جو ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کی اشاعت کے بعد اردو دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ پھر خدا بخش اورینٹل لائبریری جنرل ۴۸-۱۹۸۹ء میں اس کی تلخیص شائع کی گئی۔

۱۹۔ "انتخاب کلام نظیر اکبر آبادی" اتر پردیش اردو اکیڈیمی لکھنو سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔

۲۰۔ "مقالات مسعود": ۔ مسعود حسین خاں کے مضامین کا مجموعہ ہے جو ترقی اردو بیورو کی جانب سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔اس مجموعہ میں ۱۶ مقالات شامل ہیں۔

۲۱۔ ساہتیہ اکیڈیمی کی جانب سے اردو ادب کے معمار کے سلسلہ کی تصنیف محمد قلی قطب شاہ ہے۔۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔ پھر سوانح یوسف حسین خاں شائع کی۔

۲۲۔ "انتخاب کلام غالب"
یہ انتخاب سرسید بک ڈپو سے ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔

ایوارڈس اور اعزازات

مسعود صاحب کی شخصیت کے مختلف روپ ہیں۔ان کی صلاحیتوں کا اظہار تعلیم کے ابتدائی دور سے ہی ہونے لگا تھا لیکن اس میں پختگی کا سلسلہ ۱۹۴۱ء سے شروع ہوا اس سال انھوں نے ایم۔اے درجہ اول میں کامیاب کیا اور باوجود خرابی صحت کے یونیورسٹی میں تھرڈ پوزیشن حاصل کی اس کے ساتھ ہی اردو تحقیق کی طرف

راغب ہوئے لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہونے کے بعد پی ایچ ڈی کا ارادہ کیا اور دو سال کی شب و روز محنت کے بعد ۱۹۴۵ء میں "اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا" پر مقالہ لکھا جو علمی دنیا میں حوالے کی دستاویز بن گیا۔ (۲۲) اس مقالہ پر ممتحنین (سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور) نے مبارک بادی کا ریزرویشن پاس کیا۔ ۱۹۵۳ء میں پیرس یونیورسٹی سے Doctoratd, Universite حاصل کی۔

۱۹۵۴ء کو علی گڑھ واپسی کے بعد مسلم یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کی سیٹ پر منتخب ہوئے۔ اس وقت وہ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ اردو میں ریڈر تھے۔ ۱۹۵۹ میں فیلو شپ کے تحت یہ اعزاز ملا کہ وہ کسی بھی یونیورسٹی میں اور کوئی بھی پروفیسر کا لکچر سن سکتے ہیں۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر نیویارک کا سفر کیا۔

اقبال کی نظری و عملی شعریات پر مسعود صاحب کو ساہتیہ اکیڈیمی کا ۱۹۸۴ء کا ایوارڈ ملا۔

شخصیت سیرت عادات واطوار

شخصیت میں انسانی فطرت، ذہن، فضا، یا تخیلی صلاحیت، شعور اور لاشعور کی کشمکش احساس کمتری، احساس برتری، جسمانی صلاحیت، موروثی خصوصیات، تجربات، سماجی اثرات، اخلاقی قوانین اور ماحول کا اثران سب کا پیچیدہ اور رنگ دار پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ شخصیت کی بستی میں باطنی، ظاہری، ذہنی و جسمانی افکار و عمال کا بسیرا ہوتا ہے۔

آکسفورڈ ڈکشنری نے شخصیت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

> "وہ صفات کا مجموعہ جو ایک شخص کو دوسرے شخص سے ممتاز کرتا ہے۔ مخصوص ذاتی یا انفرادی کردار خصوصاً جب وہ ایک نمایاں شخصیت ہو۔"

That quality or assemblaye of qualities which

distinct from other makes a person what he is as persons. Distintive personal or Individual charector, Specialy when of a marked kind. (۲۳)

شخصیت کا خام

مواد بقول پروفیسر آل احمد سرور کے تربیت اور ماحول کے مختلف قالب سے بنتا ہے ۔ نسلی خصوصیات جو منتقل ہوتی ہیں وہ زندگی کے مراحل میں مختلف تغیرات اور اثرات کا شکار ہوتی ہیں ۔ جس میں گھر کی تربیت، اسکول کی تربیت ، ماحول ، سماجی اثرات ، اساتذہ کا برتاؤ، علمی و ادبی اقدار ، کمزوریاں ، کامیابیاں ، محرومیاں ، خوشیاں یہ سب عناصر شخصیت کی تعمیر میں اپنا اپنا حصہ ادا کرتی ہیں ۔ جسمانی خصوصیات ورثہ میں ملتی ہیں ۔ لیکن اس کی بھی نشو نما میں خارجی عناصر کا دخل ہوتا ہے ۔ شخصیت کی تعمیر کے ابتدائی مراحل میں جسمانی خصوصیات اہمیت رکھتی ہیں ۔ شخصیت ، رنج و غم ، سختی و نرمی ، دوستی و دشمنی ، کامیابی و ناکامی ، فتح و شکست غرض جلال و جمال کے ہر روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے ۔ جس طرح ہر ادیب ، صاحب طرز ادیب ، ہر شاعر پر گو شاعر نہیں ہوتا ۔ ویسے ہی شخصیت بھی ہر شخص کے نصیب میں نہیں ہوتی ۔

شخصیت کے جسمانی عناصر جو ظاہرہ ہوتے ہیں ۔ اس میں جسمانی ساخت ، صحت قد و قامت ، رنگ و روپ وزن وغیرہ شامل رہتے ہیں ۔ ایک ادیب یا فن کار کی شخصیت میں ظاہرہ اوصاف سے زیادہ باطنی خصوصیات ، ذہنی و فکری رویہ چھایا ہوا ہوتا ہے ۔ مسعود حسین خاں کی شخصیت ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے وجاہت و شرافت کا خوب صورت مرقع ہے ۔ دراز قد طباقی خوب صورت چہرہ ، ستوان ناک سامنے کچھ چوڑی ، گورا رنگ ایسے کے خوشی اور غصہ میں لال ہوجائے ۔ سجیلا جسم ، چوڑی پیشانی ، سر پر ہلکے پھلکے بال ، گھر پر عموماً کرتا اور علی گڑھ پاجامہ پہنتے ہیں ۔ کوئی مہمان آجائے تو مہمان کا لحاظ کرتے ہوئے بشرٹ پتلون پہنتے ہیں ۔ دفتر کے وقت بھی

بشرٹ اور پتلون میں ملبوس رہتے ہیں ۔ شیروانی پہلے پہنا کرتے تھے اب گھر میں تہہ بند میں رہتے ہیں جس کا ذکر مزاحیہ انداز میں انھوں نے اس طرح کیا ہے ۔

"میں اب گھر میں بالکل مدراسی وضع میں رہتا ہوں ۔" (۲۴)

مسعود صاحب کے مزاج میں ایک ٹھہراؤ ہے ۔ پہلی ملاقات میں ملاقاتی ان کی شخصیت سے مرعوب ہو جاتا ہے ۔ جب گفتگو سے مرعوبیت کا اثر کم ہونے لگتا ہے تب علمیت اپنا سکہ جمانے لگتی ہے ۔ نہ وہ کسی سے بے تکلف ہوتے ہیں نہ کسی کو بے تکلف ہونے دیتے ہیں ان کی شخصیت میں مغرب و مشرق کے پسندیدہ خصائص اور تہذیبی قدروں کا امتزاج ملتا ہے ۔ گفتگو کے دوران عموماً سنجیدہ رہتے ہیں ۔

ایک طرف اردو فارسی اور ہندی کے عالم ہیں تو دوسری طرف انگریزی اور فرانسیسی کے ماہر، مشرقی و مغربی ادبیات کا مطالعہ اور اسفار نے ان کی شخصیت کے اس پہلو کو نکھارنے میں بہت بڑا حصہ ادا کیا ہے ۔ اردو کے لیے ان کی شخصیت لازم و ملزوم کی طرح ہے ۔

"اردو سے ان کا رشتہ ناخن و گوشت کا سا ہے ۔ وہ اردو ہی میں آہ بھی کرتے ہیں اور واہ بھی ۔" (۲۵)

بہ ظاہر یہ سخت مزاج اور خشک طبع معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی خود نوشت "ورود مسعود" لطیف جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتی ہے ۔ ان کی نیک سیرت پاک دامنی اور شرافت کے معاصرین بھی قائل ہیں ۔ ان کی شخصیت کے پوشیدہ نہاں خانوں پر "ورود مسعود" کی مدد سے روشنی پڑتی ہے جن کی طرف کسی نے نظر نہیں کی مسعود حسین خاں کے ننھیال کا ماحول نہایت بے باک تھا ۔ لیکن ددھیال کی روایت نے ان کے قدم ڈگمگانے نہیں دیے ۔ جس کا اعتراف انھوں نے اس طرح کیا ہے:

"میرا دامن جو فحشیات سے بچا رہا وہ صرف اس لیے کہ میری ددھیال کی روایات میری ننھیال کی روایتوں پر غالب رہیں ۔ جنس کی جانب

سے میں خیالات میں آزاد رہا لیکن عملی طور پر جھینپو ہونے کی وجہ سے
مس و مساس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اگر ایسا ہوتا تو پیرس کے نگار
خانے میں یہ اعتراف نہ کرتا۔" (۲۶)

خیال دامن الفت کہاں کہاں مسعود
وہ نارسا ہی رہا اور شرم سار رہا

خود نوشت میں بعض ایسے نکات مل جاتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسعود صاحب فطری طور پر حسن پرست بھی رہے ہیں۔ لیکن ان کی حسن پرستی مصری کی مکھی کی طرح ہے۔ قائم گنج کی پٹھان خواتین کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں:

"قائم گنج کے پٹھانوں کے لیے سانولی سلونی لونڈیاں، مہترانیوں اور دھوبنیوں میں گوری چٹی پٹھانیوں سے زیادہ جنسی کشش ہوتی ہے۔" (۲۷)

مغرب کے حسن نے بھی ان کو دعوت نظارہ دیا تھا۔

"یورپ میں ہندوستانی نوجوانوں کو سب سے زیادہ خیرہ کرنے والا وہاں کا حسن نسوانی ہے۔ خاص کر وہ نسوانی حسن کے ڈھلے ہوئے پیکر، جو لاطینی ممالک (فرانس، اٹلی، اسپین) وغیرہ میں نظر آتے ہیں۔ ان کے لیے بے حد جنسی کشش رکھتے ہیں۔ ان کے جسم کے کم بخت دلاویز خطوط یقیناً مشرقی حسن کے پیکروں سے زیادہ حسین ہوتے ہیں۔" (۲۸)

انھیں اپنی خاندانی روایات پر ناز ہے اور اس ورثہ کی حفاظت کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ چناں چہ قیام یورپ کے زمانے میں انھوں نے "لال پری" کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ ہمیشہ خاندانی روایات ان کے پیش نظر رہیں۔ جس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"مغرب کے ناؤ نوش کے اس ماحول میں لال پری سے دور رہا۔ اس میں اس قدر مذہبی قدغن کا خیال نہ تھا جتنا اپنی صحت اور خاندانی روایت کا۔" (۲۹)

ذہنی کیفیات

بچپن ہی سے ان کی غیر معمولی ذہنی استعداد کا اظہار ہوتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں جب کہ ان کی عمر ۱۳ سال تھی، سید نذیر نیازی صاحب کے ہم راہ کشمیر گئے تھے وہاں ان کی پہلی ملاقات علامہ اقبالؔ سے ہوئی اس وقت انھیں اقبالؔ کا تقریبا کلام ازبر تھا۔

مذہب و عقائد

جہاں تک مذہبی عقائد کا تعلق ہے وہ اسلامی اقدار کو عزیز رکھتے ہیں۔ ہندو کلچر، تاریخ اور ادبیات سے قریب رہنے کے باوجود "دیومالائی مہملات" سے بہت دور ہیں

"ہندو کلچر تاریخ و ادبیات سے قریب رہنے کے باوجود میں ان کی معاشرتی زندگی اور دیومالائی تصورات کا ہمیشہ نقادر رہا ہوں۔" (۳۰)

مذہبی اعتبار سے وہ بڑے متوازن واقع ہوئے ہیں۔ وہ مذہبی آڑ میں قدامت پسندی یا تقلید کے قائل نہیں ہیں۔ صرف ایک واقعہ ان کی زندگی میں ایسا ملتا ہے جس سے ان کی قبرپرستی کا گمان گذرتا ہے لیکن بہت جلد پھر انھیں اس عمل کا احساس ہوجاتا ہے۔ اس واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

کشمیر میں مسعود صاحب جب وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے قیام پذیر تھے ایک ریسرچ اسکالر "طالعہ مخدوم" سے متاثر ہوئے۔ اس وقت ان کے بیٹے جاوید حسین کا کشمیر یونیورسٹی میں بحیثیت لکچرر انتخاب عمل میں آیا تب انھیں خیال ہوا کہ شاید یہ کشمیر کے (مخدوم صاحب۔ (۳۱)) کی عنایت ہے لہذا ہر اتوار کو صبح باوضو،

مسعود صاحب درگاہ پر بڑی عقیدت سے حاضر ہونے لگے۔

" یہ ذہن میں رہے کہ اس قسم کی حرکت میں نے کبھی چوبیس خواجاؤں کی چوکھٹ والی دِلّی میں بھی نہیں کی تھی۔ اس لیے کہ میرا ذہن کسی بھی قسم کی مزار پرستی کو قبول نہیں کرتا۔" (۳۲)

لیکن جاوید نے نہ صرف شادی سے انکار کیا بلکہ کشمیر کی ملازمت بھی قبول نہیں کی جس سے مسعود صاحب کو بڑا صدمہ پہنچا اور مخدوم صاحب سے بھی یہ شکایت رہی کہ وہ جاوید حسین کا دل نہ بدل سکے۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" بچپن سے میرا ذہن آزاد خیال کی طرف مائل رہا ہے اور میں نے ہر مذہب کو (بشمول اسلام) عقلیت کے معیاروں پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ خاص طور سے مذاہب کی فروعات کو۔" (۳۳)

آزاد خیال سے مراد یہ نہیں کہ وہ اشتراکی یا کیمونسٹ نظریہ کے حامل ہیں بلکہ وہ قدامت پرستی، توہمات اور تقلید کے بھی قائل نہیں ہیں بلکہ متوازن مزاج ظاہر ہوتے ہیں۔ مسعود صاحب کی شخصیت بقول اسماعیل خاں کے:

" انھوں نے اپنی زندگی کا ایک معیار اور ضابطہ مقرر کیا جس میں صداقت حق شعاری حق گوئی خلوص شریف النفسی اور شائستگی و لفاست کو خاص دخل ہے اپنی خصوصیات سے ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے۔" (۳۴)

ان کے اجداد تیر و شمشیر کے سپاہی تھے یہی تیر ٹوٹ کر مسعود صاحب کے دادا فدا حسین کے لیے قلم بن گیا۔ اس قلم کی لہر ایسی چلی کہ سارے خاندان کے افراد اس قلم کے گرفتار ہوگئے۔ افغانی پٹھانی نسل کی چنگاری جو دبی رہی وہ ایسے موقعہ پر بھڑک اٹھتی ہے جس سے ان کی انا کو ٹھیس لگتی ہے یا سچائی پر آنچ لگتی ہے۔ مسعود حسین خاں میں انانیت کا عنصر بچپن ہی سے نظر آتا ہے وہ خود ایک چھوٹا سے واقعہ لکھتے

"ہمارا محبوب مشغلہ تھا یعنی اینٹوں یا مٹی سے گھروندے بنانا ــــــــ گھروندے سازی کے اس کھیل میں مجھے خورشید سے یہ شکایت رہی ہے کہ وہ خود "راج" کا رول ادا کرنے لگتے اور مجھے مزدور کا کام کرنے کے لیے کہتے۔ اینٹیں لاؤ گارا لاؤ چھت کے لیے پٹاؤ تیار کرو۔ میری انا کو اس سے ٹھیس لگی میں بغاوت کر بیٹھتا پھر اس کے بعد سارا کھیل بگڑ جاتا۔" (۳۵)

یہی انانیت بعد کو زمانے کے سرد و گرم سے استقامت اور استواری کا روپ دھار لیتی ہے۔

"نرم خوئی اور شائستگی کے باوجود مسعود صاحب بہت زیادہ لچک دار نہیں واقع ہوئے ہیں۔ تذبذب اور تامل میں کم ہی مبتلا ہوئے ہیں ان کے مزاج میں ایک استقامت اور استواری ہے۔ وہ بہت صلاحیت کے ساتھ اپنے موقف پر سختی سے جمے رہتے ہیں اور پیچ دوری سے پہلو بدلنے کی کوشش نہیں کرتے۔" (۳۶)

یہی وجہ ہے کہ جن اساتذہ سے ان کی دلی وابستگی رہی ہے انھوں نے بحیثیت شاگرد نہیں بلکہ ان پر ایک بے لاگ ادیب کی حیثیت سے قلم اٹھایا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی توسیع ملازمت کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے مسعود صاحب ایک بے باک ادیب کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ ذاکر حسین خاں جیسی باوقار شخصیت پر وہ کچھ لکھتے ہیں تو دو ٹوک لکھتے ہیں نہ اس وقت ایک محترم چچا ان کے سامنے ہوتے ہیں نہ ایک قومی رہنمانہ جذبات نہ احساسات:

"رشید صاحب ہائی اسکول کے سرٹیفکٹ کے مطابق ۱۹۵۸ء

میں صرف ۶۰ سال کے ہوئے تھے لیکن صحت اور کارکردگی کے لحاظ
سے وہ اس سے کہیں زیادہ لگتے تھے۔ان کی عدم کارکردگی کا اندازہ
ان کے دوست اور مرشد ڈاکٹر ذاکر حسین خاں تک کو تھا جنھوں
نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ جب تک رشید صاحب شعبہ اردو کے
سربراہ ہیں اس کی ترقی و توسیع ناممکن ہے۔" (۳۷)

اس بیان کی روشنی میں مسعود صاحب کی صاف گوئی اور کھل ؎ سامنے آتی ہے۔جامعہ ملیہ میں اردو ایم۔اے کا شعبہ قائم ہونے کے بعد کے حالات اور صدر شعبہ کے تقرر کے معاملے میں مسعود صاحب نے لکھا ہے:

"کافی غور و خوض کے بعد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پر نظر پڑی جو
اس وقت دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر تھے لیکن متنازعہ
فیہ شخصیت کے مالک تھے۔پروفیسر مجیب نے اس جگہ کے لیے ڈاکٹر
گیان چند کو بھی امید دلا رکھی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ہمارے لیے یہ خیال
دلفریبی رکھتا تھا کہ اس طرح اردو کی سیکولر حیثیت زیادہ مضبوط
ہوگی۔" (۳۸)

اس کے بعد نارنگ صاحب کا تقرر صدر شعبہ کی حیثیت سے ہوا۔تب جامعہ میں ان کے متعلق بائیں بازو کے حلقے کی جو شورشیں ہوئیں اس کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے:

"جامعہ کی دیواروں پر لکھا گیا کہ وہ CIA ایجنٹ ہیں ان کی ذاتی
زندگی کے حوالے سے کردار کشی کی گئی حالاں کہ ان میں سے اکثر کی
ذاتی زندگی ان سے بدتر تھی۔" (۳۹)

یہ لکھ کر مسعود صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے اس سے جامعہ کے مختلف ہنگاموں کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔اس کے بعد گوپی چند

نارنگ کے متعلق ان کے خیال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسعود حسین صاحب ایک سیکولر ذہن کے حامل ہیں۔ ایک طرف مسعود صاحب کی شخصیت میں جذبہ، اردو آنند نرائن ملا کی طرح ملتا ہے تو دوسری طرف سیکولر جذبات کی عکاسی بھی ہوتی ہے نارنگ صاحب کے انتخاب کے سلسلے میں خود مسعود صاحب کے حوالے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک خاص مقصد کے تحت ان کا تقرر کیا تھا:

"انھیں ایک خاص نقطہ نظر کے تحت دوسرے بعض اچھے اساتذہ اردو پر ترجیح دے کر جامعہ ملیہ لایا گیا تھا ہم لوگوں کو یہ بھی علم تھا کہ وہ ایک متنازعہ فیہ شخصیت رہے ہیں وہ ایک حوصلہ مند مگر جاہ طلب انسان ہیں۔ طبیعت میں خود پسندی اور شدت ہے۔ یہ مثبت ہوتی ہے تو کارہائے نمایاں کر بیٹھتے ہیں۔ جب منفی ہوتی ہے تو جارحانہ انداز اختیار کر لیتی ہے۔" (۴۰)

مندرجہ بالاحوالہ کی روشنی میں مسود صاحب ایک ماہر نفسیات معلم کی طرح سامنے آتے ہیں۔ انھیں تعلیمی نفسیات کا مکمل تجربہ ہے اور شخصیت شناسی کا جوہر بھی رکھتے ہیں۔ مسعود صاحب کی طبیغت میں متانت کے ساتھ حق گوئی اور بے باکی کا عنصر ملتا ہے لیکن ان کی متانت میں خشکی اور کرختگی نہیں جب کہ حق گوئی و بے باکی میں اعلیٰ ترین مظاہرہ ہر گام پر موجود ہے۔

ثمنیہ شوکت لکھتی ہیں:

"کرختگی اور خشکی کی جگہ مسعود صاحب خوش مزاجی سے متصف ایک نیرنگ و نورنگ شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ طبیعت میں رچی بسی یہی خوش مزاجی شاعر مسعود حسین خاں سے ایسے اشعار بھی کہلا دیتی ہے۔" (۴۱)

مسعود صاحب نے اپنے عہدے کی ذمہ داریوں کو کماحقہ اور دیانت داری

سے نبھایا۔ وائس چانسلر کی حیثیت سے جب انھوں نے چارج لیا تو اکاونٹنٹ آفسر سے مختلف معاملات کے بارے میں قواعد و ضوابط اور شیخ الجامعہ کی مراعات کی تفصیل معلوم کی اور اس پر لمان داری سے عمل کیا۔ اپنی استعمال کی کار کا بھی بے جا استعمال نہیں کیا۔ ایک مرتبہ خانگی کام کے لیے ان کی بیوی نے کار بک کروائی لیکن مسعود صاحب نے اس آرڈر کو کینسل کروا کر دوسری کار دلوائی اور کہا:

"کہیں لوگ یہ کہیں گے کہ مسعود صاحب کی بیوی شیخ الجامعہ کی کار پر گھومتی پھرتی ہیں۔" (۴۲)

مسعود حسین خاں بظاہر کم آمیز ہیں لیکن دوست احباب، رشتہ داروں اور خاص کر اہل قلم کی ضیافت خوش دلی سے کرتے ہیں اور رشتہ، خلوص برقرار رکھتے ہیں۔

نجیب اشرف ندوی کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے:

"آپ نے جس محبت سے یاد فرمایا اس کو پڑھ کر آنکھوں میں آنسو بھر آئے کہ اللہ اللہ اب بھی ایک آدھ ایسی مسعود ہستیاں موجود ہیں جو بے غرضانہ محبت کا پیکر مجسم ہوتی ہیں۔" (۴۳)

مسعود صاحب کی دیانت داری کے نمونے ان کی علمی و ادبی مصروفیات میں بھی ملتی ہیں۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران انھوں نے دکنی لغت لکھی۔ اس میں ڈاکٹر غلام عمر خاں کا نام بھی ساتھ میں رکھا۔ بکٹ کہانی، میں نور الحسن ہاشمی کو شامل رکھا۔ عاشور نامہ میں سید سفارش حسین کا نام صرف اس لیے لکھا کہ اس کا مائیکرو فلم انھوں نے دیا تھا۔

مسعود صاحب کی شخصیت کے بارے میں سید نظر برنی اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

"مسعود صاحب نے شرافت، وضع داری، انکساری اور فہم و فراست

جیسے اعلیٰ انسانی صفات اپنے قابل فخر اسلاف سے ترکہ کی شکل میں پائی ہیں۔" (۴۴)

رنگینیء طبع

مسعود صاحب کی رنگینیِ طبع کا ایک واقعہ خود نوشت میں ملتا ہے جس نے مسعود صاحب کی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ یہ واقعہ گو بہت طویل ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے ایک سے زیادہ گوشوں کو بے نقاب کرتا ہے:

> "ایک سیاہ برقعہ والی کی پرچھائیں بن کر، اس کا فاصلے، سے کئی برس تعاقب کیا۔۔۔۔۔ جب دال نہ گلی تو میں نے قدم روک لیے اور پھر گھر کے نہال خانے کا خیال کرنے لگا اور تحقیق کی رفتار تیز کر دی۔" (۴۵)

پروفیسر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں:

> "معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سینے میں دل گداختہ ہے۔ انھوں نے بھی محبت کی ہے۔ یہ بحث الگ ہے کہ مسعود صاحب نے اپنی بیگم سے سچی اور اصلی محبت کی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ان کا دل دھڑکا ہے۔" (۴۶)

نجی زندگی میں زیادہ تر ان کی شخصیت مطمئن نظر آتی ہے۔ ایک آدھ ہی ایسا موقعہ ہے جہاں مسعود صاحب کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ ایک یہ کہ بچپن میں ہی یہ ماں باپ کے سایے سے محروم ہو چکے تھے جس کا انھیں شدت سے احساس رہا۔ لڑکپن کے کھیلوں میں پتنگ بازی، گلی ڈنڈا۔ تاش، شطرنج سب کو آزمایا لیکن کسی بھی کھیل کو مشغلہ نہیں بنایا جس کی وجہ سے وہ کسی بھی کھیل میں مہارت حاصل نہ کر سکے۔ ان کا محبوب مشغلہ کتب بینی تھا جسے وہ علمی ریاضت کا نام دیتے ہیں۔ روپیہ کی جانب سے ہمیشہ لاپرواہ رہے۔ کبھی قرض لیا اور نہ قرض دیا۔ ہر کام بہ پابندی انجام دیتے ہیں

عام طور پر شعبہ تدریس سے تعلق رکھنے والے اچھے منتظم نہیں ہوتے لیکن مسعود صاحب اچھے استاد کے ساتھ ساتھ انتظامی صلاحیت کے بھی حامل ثابت ہوئے ہیں۔وائس چانسلر جامعہ ملیہ اور جامعہ اردو علی گڑھ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے انھوں نے اس کا ثبوت دیا ہے۔جامعہ اردو علی گڑھ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کی انتظامی صلاحیتیں ناقابل فراموش ہیں۔جامعہ اردو علی گڑھ ایک ایسی دنیا ہے جس کے ذریعہ قلیل عرصے میں امیدواروں کو اعلیٰ علمی مدارج پر پہنچنے کا موقع ملتا ہے اور ذریعہ روزگار بھی ثابت ہوا ہے۔اس ادارے کے علمی ڈھانچے میں حکومت کے ناری شکسا، تعلیم بالغان، اکشراجیوتی، غیر رسمی تعلیم جیسے پروگرام کا عنصر ملتا ہے اس ادارے کے لیے مسعود صاحب نے اپنی علمی اور عملی صلاحیتوں سے اردو بازار کا قیام عمل میں لاکر جمالیات اور مالیات کا سنگم بنا دیا ہے اب وہ ایک اردو ذریعہ تعلیم کا جونیر اسکول بھی قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

انھیں سیاست سے کوئی خاص لگاؤ نہیں رہا اس لیے کہ ان کے خیال کے مطابق جواہر لال جیسے انسان اب سیاست میں نہیں ملتے۔مسعود صاحب کی نظر میں اہل سیاست سے اہل علم زیادہ قابل تعظیم ہیں:

"میری نظر میں اہل علم و ہنر زیادہ لائق تعظیم ہیں۔اس لیے میر، غالب، اقبال، ٹیگور جیسی شخصیتوں کو دل سے عزیز رکھتا ہوں۔"

(۴۷)

جامعہ اردو امتحانات کے سلسلے میں راقم الحروف کو کئی بار ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ایک ایسے ہی کام سے جانا ہوا۔بارش خوب ہو رہی تھی میں اور میرے ساتھی بھیگ گئے تھے دروازے پر دستک دی انہوں نے دروازہ کھولا اور کلام سے قبل فرمایا کہ "آپ لوگ بھیگ گئے ہیں پہلے پانی پونچھ لو پھر چائے نوشی کے بعد گفتگو کریں گے۔" (۴۸)

ایک دفعہ اور چند طلبا کے ہمراہ ان کے مکان جانا ہوا۔ رات کا وقت تھا۔ بجلی چلی گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایمرجنسی لائٹ میں بہت دیر تک گفتگو کی رات کے وقت گھر پر ملازمین نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے ہاتھوں سے طلبا کی اور میری ضیافت کی واپسی پر سڑک تک ایمرجنسی لائٹ ہاتھ میں تھامے ہمارے ساتھ آئے اور جب روشن مقام آیا تو کہنے لگے اب یہاں سے رکشہ مل جائے گا۔ ہم لوگ حیران رہ گئے کہ ایک جامعہ کا وائس چانسلر طبیعت میں کتنی تواضع اور شرافت رکھتا ہے۔ ان واقعات سے سیرت کے ساتھ مسعود صاحب کی عالی ظرفی کا ثبوت ملتا ہے۔

مذہبی روایات اور اقدار کے بارے میں ان کا انداز ترقی پسندانہ ہے اور مسعود صاحب نے مذاہب کو تاریخ کی رو کا آوردہ سمجھا ہے اور کہتے ہیں کہ سب مذاہب میں کچھ دیرپا اقدار ہوتی ہیں جو اخلاقی اور معاشرتی قدروں کی شکل میں زندہ رہتی ہیں یہ ایک سیکولر ذہنیت رکھنے والے مسلمان، عمر کے ستر سال، عزت نفس، شادمانی ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ منازل مختلف اعزازات، خطابات سے مستفید ہو چکے ہیں۔ جلوت پر خلوت کو ترجیح دیتے رہے ہیں اب زیادہ وقت جامعۂ اردو علی گڑھ میں گذارتے ہیں۔ اس کے بعد جاوید منزل پر ہی رہتے ہیں۔

بقول مسعود صاحب کے ہی:

"مکینوں سے قطع نظر مجھے اپنے مکان سے بھی بہت محبت ہے۔"

ـــــــ ○ ○ ○ ـــــــ

حیات اور شخصیت

۱-یوسف حسین خاں -یادوں کی دنیا، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۱۹۷۶ء ص ۲۳

۲-فرمان فتح پوری -انٹرویو ڈاکٹر مسعود حسین خاں - مشمولہ نگار کراچی ۱۹۷۵ء ص ۳۵

۳-یوسف حسین خاں، ڈاکٹر "سات بھائیوں کا خاندان" - مشمولہ نگار ۱۹۷۵ء ص ۶۳

۴-مظفر حسین خاں مسعود حسین خاں کے والد تھے

۵-یوسف حسین خاں - "سات بھائیوں کا خاندان"، مشمولہ نگار ۱۹۷۵ء ص ۶۵

۶-ادارہ پیام تعلیم -ذاکر نمبر ستمبر ۱۹۶۵ء ص ۱۷

۷-ان کے تعلق سے مسعود صاحب نے لکھا کہ انکی نانی بی کی جب بہو سے ان بن ہوتی تو انہیں خشکی کہکر پکارتی تھیں انہیں سخت تکلیف ہوتی تھی۔

۸-غلام ربانی تاباں کا ۷/ فروری ۱۹۹۳ء کو انتقال ہوگیا۔

۹-مسعود حسین خاں "ورود مسعود" خدا بخش لائبریری ۱۹۷۹ء ص ۱۵

۱۰-مسعود حسین خاں "ورود مسعود" -خدا بخش لائبریری ص ۴۸

۱۱-مسعود حسین خاں -ورود مسعود - ص ۴۴

۱۲-آل احمد سرور، پروفیسر "خواب باقی ہیں" علی گڑھ ۱۹۹۱ء ص ۱۰۲

۱۳-آل احمد سرور - خواب باقی ہیں علی گڑھ ص ۱۰۲

۱۴-یوسف سرمست، پروفیسر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، انٹرویو ۷/۲/ اگست ۱۹۹۰ء

۱۵-آل احمد سرور، پروفیسر "خواب باقی ہیں" علی گڑھ ص ۱۰۳

۱۶-آل احمد سرور، پروفیسر "خواب باقی ہیں" علی گڑھ ص ۲۲۷

۱۷-یہ حقیقت ہے کہ آل احمد سرور صاحب ہی کی وجہ سے لسانیات کی پروفیسری پر اس سے پہلے تقرر نہ ہوسکا تھا (انٹرویوز مسعود صاحب)

۱۸-مسعود حسین خاں ڈاکٹر-ورود مسعود ص ۲۴۳

۱۹-مسعود حسین خاں -ورود مسعود پٹنہ ص ۲۸۸

۲۰-مسعود حسین خاں -ورود مسعود پٹنہ ص ۳۰۴

۲۱-مسعود حسین خاں ورود مسعود ص ۳۰۴

۲۲-مرزا خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر-نذر مسعود علی گڑھ ص ۱۱

۲۳-آل احمد سرور، پروفیسر-علی گڑھ میگزین ۱۹۵۹ء شمارہ ۱ ص ۳۵

۲۴-انٹرویو-۲۹/۷/ اگست ۱۹۸۹ء جاوید منزل علی گڑھ

۲۵-وہاج الدین علوی -نذر مسعود علی گڑھ ۱۹۹۰ء ص ۳۰۰

۲۶- مسعود حسین خاں - ورود مسعود ص ۱۹
۲۷- مسعود حسین خاں - ورود مسعود ص ۲۵
۲۸- مسعود حسین خاں - ورود مسعود ۱۵۴
۲۹- مسعود حسین خاں - ورود مسعود ۱۵۴
۳۰- مسعود حسین خاں - "ورود مسعود" ۱۲۴
۳۱- کشمیر میں ہاری پربت کے دامن میں مخدوم صاحب کی بڑی درگاہ ہے طالعہ مخدوم کا اس خاندان سے تعلق تھا اس لڑکی کو مسعود صاحب اپنی بہو بنانا چاہتے تھے
۳۲- مسعود حسین خاں - ورود مسعود ص ۲۷۴-۲۷۲
۳۳- مسعود حسین خاں - ورود مسعود، ص ۲۷۳
۳۴- اسماعیل خاں - "نذر مسعود" علی گڑھ ص ۱۰۲
۳۵- مسعود حسین خاں - ورود مسعود ص ۲۸
۳۶- عبد المغنی - نذر مسعود علی گڑھ ص ۵۰
۳۷- مسعود حسین خاں - ورود مسعود ص ۸۳
۳۸- عبد المغنی - نذر مسعود ص ۵۰
۳۹- مسعود حسین خاں - ورود مسعود ص ۲۲۷
۴۰- مسعود حسین خاں - ورود مسعود ص ۲۲۷
۴۱- ثمینہ شوکت - نذر مسعود علی گڑھ ص ۲۲۱
۴۲- عبد اللطیف اعظمی - نذر مسعود ص ۵۶
۴۳- نجیب اشرف ندوی - مشمولہ خط - سید نجیب اشرف ندوی حیات اور کارنامے ص ۲۳۴
۴۴- وداعی خطبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۲۲/ اکتوبر ۷۳ء ہماری زبان ۸/ نومبر
۴۵- مسعود حسین خاں - ورود مسعود ص ۱۱۶-۱۱۵
۴۶- پروفیسر رفعیہ سلطانہ - روزنامہ منصف حیدرآباد ۱۵/ جولائی ۹۰ء ص ۶
۴۷- مسعود حسین خاں - ورود مسعود ص ۳۰۰
۴۸- انٹرویو - جاوید منزل - یکم/ ستمبر ۱۹۸۹ء

ادبی تنقید

مسعود حسین خاں ایک ممتاز محقق ماہر لسانیات و شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ سائنٹیفک نقاد کی حیثیت بھی رکھتے ہیں ۔ انھوں نے ادبی ، لسانی اور تحقیقی موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے ہیں ۔

پروفیسر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں:

" مسعود صاحب اردو کے بے بدل محقق ، نقاد ، شاعر ، صاحب طرز انشا پرداز اور ماہر لسانیات اور اردو مسائل کے معتبر نباض ہیں ۔ "

(۱)

مسعود صاحب نے اپنے مضامین کے ذریعے تنقید کو سائنٹیفک بنایا اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے ۔

" قدیم ہیئتی تنقید کے سوا تمام دبستانوں میں متن کو یا تو سرے سے نظر انداز کیا جاتا تھا یا اسے ضمنی حیثیت دی جاتی تھی ۔ مسعود صاحب نے اس صورت حال کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہوئے اردو تنقید کو ادبی اور سائنٹیفک بنانے کی کوشش کی ہے ۔ " (۲)

ان کے تنقیدی ادبی اور تحقیقی مضامین مختلف مجموعوں کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں ۔ یہ مقالات ان کی علمی ادبی شخصیت کا ایسا وقیع سرمایہ ہیں جن سے ان کی شخصیت مسلمہ ادیب ، ناقد ، محقق اور ماہر لسانیات کی سی ہو جاتی ہے ۔

اردو زبان و ادب

مسعود حسین خاں صاحب کا پہلا مجموعہ مضامین ہے جس میں پندرہ مضامین ہیں ۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۲ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا ۔ دوسرا ایڈیشن ایجوکیشنل

بک ہاوس علی گڑھ کی جانب سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ تیسرے ایڈیشن کی اشاعت بھی علی گڑھ سے ۱۹۸۳ء میں عمل میں آئی۔ دوسرے ایڈیشن کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ یہ ترمیم شدہ ایڈیشن ہے جس پر تاریخ درج نہیں ہے۔ لیکن راقم کو ۱۹۵۹ء کا ایک ایڈیشن اور ۱۹۸۳ء کا ایک ایڈیشن دستیاب ہوا۔ ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۸ء کے ایڈیشن کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔ ۱۹۵۹ء کا ایڈیشن ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ نے مطبع انوار احمد الہ آباد سے شائع کیا۔ جس کے مضامین اور صفحات کی ترتیب بعینہٖ ۱۹۸۳ء کے ایڈیشن کے مطابق ہے۔

یہ مجموعہ مسعود صاحب کے ادبی، تنقیدی اور لسانی مضامین پر مشتمل ہے۔

اس میں پندرہ مضامین یہ ہیں۔

۱۔ تخلیق شعر

اس مضمون میں انہوں نے شعر کی تخلیق میں شاعر کی جسمانی کیفیات، مادی بنیاد اور واردات قلبی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور شعر کی تخلیق میں اثر پذیر ہونے والے عوامل کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

۲۔ مطالعہ شعر

یہ وہ مضمون ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے اردو میں پہلی بار اسلوبیاتی تنقید کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اور صوتیاتی نقطہ نظر سے شعر کا مطالعہ تفصیل سے کیا ہے۔ لسانی اور صوتیاتی محققین کے لیے یہ مضمون ایک سنگ میل ثابت ہوا ہے۔ اسلوبیاتی اور صوتیاتی نقادوں کے لیے یہ حوالہ کا مقالہ سمجھا جاتا ہے۔

۳۔ غزل کا فن

یہ مضمون اسلوبیاتی تنقید پر مبنی ہے جس میں غزل کی ہیئت کو ردیف اور قافیہ کے محور میں بتایا گیا ہے۔ اس مضمون میں مسعود صاحب نے غالب کی غزلیات

اور اقبالؔ کی نظم "مسجد قرطبہ" کا اسلوبیاتی جائزہ لیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"غزل بغیر قافیہ کے اپنے مخصوص اسلوب اور آہنگ کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ قافیہ کی بندش غنائی، شاعری میں عام طور پر اور غزل میں خاص طور پر اس لیے ضروری ہے کہ اس کی جھنکار میں جذبہ کی شدت اور تخیل کی رنگینی دونی ہو جاتی ہے۔" (۳)

۴۔ اقبال

ہے، عجب مجموعہ اضداد اے اقبال تو۔ یہ مضمون "آج کل" جلد ۱۳ شمارہ ۲ سپتمبر ۱۹۵۴ء "اردو زبان و ادب" اور مقالات مسعود میں بھی شامل ہے۔ اس مضمون میں اقبال کی شعری فکر کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ تصور خدا، تضاد فکر، تصور کائنات، سماجی فلسفہ اور سماجی افکار کو پیش کیا ہے۔ آخر مین اقبالؔ کی تضاد فکر کے عناصر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اقبالؔ کے متضاد افکار کا سرچشمہ ہندی مسلمانوں کی یہی زندگی ہے جو تہذیب اور اسلامیت، مشرقیت اور مغربیت، عجم کے حسن طبیعت اور عرب کے سوزِ دروں سے مل کر بنی ہے۔" (۴)

۵۔ فلسفہ اقبال پر تنقیدی اشارے

اس مضمون میں اقبالؔ کے فلسفہ توحید اور خودی کے بارے میں مختلف تنقیدات کا جائزہ لیا ہے اور اپنے نظریے کی وضاحت بھی کی ہے اور لکھا کہ:

اقبال نے جدید عقلی علوم کی بنیاد پر نئے مابعد الطبیعاتی نظام کی عمارت کھڑی کی ہے، مذہب کی خارجی حکمت عملی کے بارے میں فرد سے فرد کا رشتہ جوڑا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام سے وحدت کا درس تو دیا لیکن اس کی بنیاد جن عناصر پر رکھی ہے ان کے متعلق لکھتے ہیں:

"زمین پر آسمان کی تعمیر کی ہے پھر یہ عجب بات ہے کہ وہ ہیئت اجتماعیہ کی بنیاد عقلی اور خارجی قوانین پر رکھتے ہیں۔" (۵)

۶۔ جوش ملیح آبادی

۱۲ صفحات پر جوش ملیح آبادی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ جوش کی شاعری کے جمالیاتی اور انقلابی پہلو کا اس طرح مطالعہ کیا ہے جس سے جوش کے ورثہ اور اس کے سیاسی و سماجی حالات کا خاکہ بن جاتا ہے۔ جوش کی ابتدائی شاعری میں وہ داستان مضمر ہے جو ان کے اطراف کے ماحول کا مرثیہ پیش کرتی ہے۔ رفتہ رفتہ جوش کی شاعری میں یہ احساسات، فطرت اور جمالیات کا روپ لینے لگتے ہیں۔ فطرت اور جمالیات کا عنصر یکلخت ہی نہیں آیا بلکہ ابتدا میں منظر نگار کو فکر و نشاط اور شعلہ و شبنم کے احساسات کو فطرت نگار بنا دیتے ہیں۔

مسعود صاحب نے جوش کو انقلابی نہیں بلکہ باغی کہا ہے اور یہی باغی جذبہ خدا سے بغاوت تک بھی جاسکتا ہے۔ جوش کی شاعری میں ذہنی ارتقا شروع سے آخر تک ہوتا رہا۔ اپنے ہوش و حواس اور تخیلات کی قوس و قزح کو انھوں نے سماج کے پس منظر میں تحلیل کر دیا۔ یہی جوش کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے اس طویل مضمون میں جوش کی شاعری کے مختلف پہلو اور ادوار کا تفصیل سے خاکہ ملتا ہے۔

۷۔ مصحفی نقاد شاعر

بارہ صفحات پر مبنی مضمون ہے۔ اس میں مصحفی کی تنقیدی صلاحیتوں اور ان کے تنقیدی شعور کا ذکر ملتا ہے۔ شعرالعجم اور مقدمہ شعر و شاعری سے قبل اردو میں تنقیدی نکات تذکروں میں ملتے ہیں۔ مصحفی کا شمار ہمارے ان چند شاعروں میں ہوتا ہے جو شاعر بھی تھے اور تذکرہ نگار بھی۔ مسعود صاحب نے مصحفی کے تذکروں میں مصحفی کی یافت بحیثیت نقاد کی ہے۔ مصحفی کے مطابق شعر گوئی اسی ذہنی صلاحیت کا نام ہے جس کے لیے سب سے پہلے وزن کا احساس ضروری ہے۔

"ان کے نزدیک وہی اشعار درست ہیں جو ۔۔۔۔۔۔ در ترازوئے نقادانِ معیارِ معانی درست آئے۔" (۶)

مصحفی کی شاعری میں دہلوی اور لکھنوی دونوں رنگوں کی آمیزش ملتی ہے۔ مسعود صاحب نے اس مختصر مضمون میں نقاد شاعر کے نظریے اور شعری خصوصیات کا معاصرین کے کلام کو پیش نظر رکھتے ہوئے جائزہ لیا ہے۔

۸۔ اصغر گونڈوی

یہ مختصر مضمون (۷) صفحات پر مشتمل ہے جس میں اصغر کی شاعری کا معاصرین سے موازنہ کیا گیا ہے۔ اصغر کی شاعری، عام سماجی رنگ سے ہٹ کر ہے جو سائنٹیفک دور میں "جہان راز" کی تعبیر کے مماثل ہے۔

۹۔ ہندی پنگل کی مبادیات

یہ ایک لسانی مضمون جو ہندی عروض کے بارے میں تفصیلات پیش کرتا ہے۔ عروضی جائزہ میں مسلم صوفی شعراء نے جو فارسی عروض ہندی شاعری میں استعمال کیے ہیں ان کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ ہندی عروض کی بنیاد آوازوں کی گنتی پر ترتیب پاتی ہے۔ حروف کی آوازوں اور ماتراؤں کے لحاظ سے گنتی کا ضابطہ بتاتے ہوئے چھندوں (بحروں) کی قسمیں اور ارکان کو پیش کیا ہے۔

ہندی پنگل کی طویل بحریں ۳۲ ماتراؤں تک ہوتی ہیں۔ ہر رکن کی ماترک بتاتی ہے۔ فعولن ۔۵ ماترائیں، فاعلن ۵ ماترائیں۔ فاعلاتن ۔ مفاعلین ۷ ماترائیں، فاع لاتن ۸ ماترائیں، مستفعلن ۸ ماترائیں، مس تفعے لن ۸ ماترائیں، مفعولات ۷ ماترائیں۔ ہندی حروف "زحاف" کو پیش کرتے ہوئے چھندوں کی تین قسمیں بتائی ہیں

۱۰۔ عظمت اللہ کے عروضی تجزیے

عظمت اللہ خاں کی شاعری کا عروضی تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ مضمون لسانیاتی

تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہے اس میں ہندی اور اردو عروض کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ آخر میں عظمت اللہ خاں کی شاعری کی خصوصیات پر توجہ دی ہے۔ لکھتے ہیں:

"موجودہ اردو نظم میں فارم کے متعلق جو نئے نئے تجربات ہو رہے ہیں اس کی طرف بھی اشارہ پہلے پہل عظمت ہی نے کیا تھا۔ دراصل اردو نظم کا موجودہ دور صوری اعتبار سے عظمت کا دور ہے۔" (۷)

۱۱۔ اردو ادب کا ایک باغی (عظمت اللہ خاں)

یہ مضمون پچھلے مضمون کا تکملہ ہے۔ عظمت اللہ کی شاعری جدید اردو شاعری کا بہترین نمونہ ہے جس میں نہ صرف نیا رجحان ملتا ہے بلکہ مروجہ اوزان سے بھی گریز ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں بنیادی تبدیلی، اوزان کی اور پھر حالات کی تھی۔ عظمت اللہ نے اپنی شاعری کی بنیاد نئی پود کے لحاظ سے ٹھیٹھ زبان اور موجودہ حالات کے سانچے میں رکھی تھی۔ انھوں نے اپنی شاعری سے تقلیدی شاعری اور تقلیدی اوزان کے بارے میں بغاوت کی اور اپنا الگ آہنگ قائم کیا جس پر آنے والی نسل کی شاعری جنم لیتی ہے۔

۱۲۔ اردو حروف تہجی کی صوتیاتی ترتیب بین الاقوامی انجمن

صوتیات کے اصولوں کے پیش نظر، اردو آوازوں کی جدید ترتیب کا خاکہ مختصر طور پر پیش کیا ہے۔ حروف صحیح کی ترتیب کے بعد (ک) حلقی آواز اور (چ، ٹ، ت، پ) کی ترتیب حنکی تالوی کوز آوازوں کے بارے میں تفصیل ہے اس کا تفصیلی ذکر صوتیات کے باب میں آئے گا۔

حروف علت اور ان کا مخرج ایک خاکہ سے بتایا ہے۔ اس مضمون میں مسعود صاحب نے اردو ٹائپ کا حوالہ دے کر کہا ہے کہ جدید دور میں عربی اور فارسی سے تاریخی لسانیات کا جو صوتی تعلق تھا اس کو جدید علم الصوت کے مطابق بنانا ہوگا۔ مگر آج کے کمپیوٹر دور میں اس میں مزید صوتی معیار قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۳۔اردو ایک ترقی پسند زبان

اردو کی سماجی اہمیت کے پیش نظر اردو کو تمام السنہ کی سب سے کم عمر زبان قرار دیا اور کہتے ہیں کہ یہ کم عمر زبان کا ایک ملک کے بسیط و عریض رقبہ پر کم سے کم عرصے میں فتوحات کا پالینا خود اس کی وہ خصوصیت ہے جو مختلف الفاظ اور صوتیات کو اپنے دامن میں ڈال لیتی ہے۔لیکن اس زبان کو مختلف علاقوں کے ترقی پسند میلانات کی وجہ سے بہت کچھ نقصان پہنچا۔دکن کی دکنی جس کی آبیاری صدیوں سے ہوئی اس کو دہلی والوں نے اپنے رنگ و روپ میں تبدیل کیا۔لکھنو میں فصاحت و بلاغت کے گراں باری؟ کی وجہ سے وہ زبان خالص شہری اور درباری زبان تک محدود ہو کر رہ گئی۔مختلف زبانوں اور مختلف علاقوں میں اس کا تاثر بدلتا گیا مگر یہ زبان بازاری اور عوامی حیثیت سے اٹھ کر رانی بن گئی۔دور جدید جمہوری دور ہے۔وہی زبان قائم رہ سکتی ہے جو عوام کی ہو اور عوام کے لیے ہو۔اس مضمون میں اردو والوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اس زبان کو تعصب کے رنگ میں نہ ڈبوئیں بلکہ اس کے عوامی رنگ کو برقرار رکھیں۔

۱۴۔اردو مردانہ زبان ہے

اردو کے کھرے اور کھڑے لہجے کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے مردانہ زبان بتایا ہے۔اس سلسلے میں کچھ مثالیں بھی دی گئی ہیں۔پنجابی اور برج سے تقابل کر کے بھی اردو کو مردانہ زبان بتایا ہے۔اس زبان کے مردانہ رجحانات ہی اس کو دنیا کی مردانہ زبانوں کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

۱۵۔اردو نئے ماحول میں

اردو کو نئے ماحول میں فروغ دینے کے لیے اردو کا لسانی پس منظر پیش کرتے ہوئے اس کا حل بھی تلاش کیا ہے۔

ان اصلاحات کے بارے میں اشارے ملتے ہیں۔

۱۔ہندوستانی زبانوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔علاقائی بولیوں کے لحاظ سے اس کو سہل بنانا چاہیے۔

۲۔شمالی ہند کے ایک بڑے خطے میں ہندوستانی مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے لہذا اس میں فارسی و عربی کے الفاظ کی بجائے سنسکرت کے خالص تد بھو ترقی یافتہ الفاظ شامل کیے جائیں۔

۳۔اردو میں جو اصطلاحات ہیں ابھی مکمل نہیں ہیں۔موجودہ سائنسی دور میں ہر شعبہ کی مخصوص اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے۔لیکن اب بھی بہت سی اصطلاحات عربی، جرمن، انگریزی میں ملتی ہیں۔یا کلاسیکی زبان کا سہارا لینا ہوتا ہے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ عام زبانوں میں اصطلاحوں کی تشکیل ہو۔

۴۔سائنٹیفک اصطلاحوں کو قدیم کلاسیکی زبانوں کو دیکھ کر، یا ان کی مدد سے وضع کرنے کی بجائے بین الاقوامی اصطلاحوں کے تلفظ کو ضروری تبدیلی کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے کیوں کہ حیدر آباد میں دار الترجمہ اور بنارس کے پنڈت نے اس کام میں کوئی خاص جدت نہیں کی ہے۔

یہ وہ اصلاحاتی اقدامات ہیں جن کا موجودہ دور میں اپنانا ضروری ہے. بجائے ترجمہ کے ان الفاظ کو اگر ہم بقول مسعود صاحب کے تلفظ کی تبدیلی کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں تو اس سے دوسرے علوم ہماری زبانوں میں منتقل کرنے کے لیے کچھ خاص دشواریاں نہیں ہوں گی اور خاص بات یہ ہوگی کہ جدید اصطلاحوں سے ہم بخوبی واقف ہو جائیں گے۔

اقبال کا صوتی آہنگ

یہ مضمون مسعود صاحب کی تصنیف، " اقبال کی نظری و عملی شعریات " کا ایک باب ہے۔اس مضمون میں اقبال کے صوتی آہنگ کا تجزیہ اسلوبیاتی انداز میں کیا

گیااور یہ واضح کیا ہے کہ۔

"اقبال نہ لفظ پرست شاعر ہے اور نہ صوت پرست ۔ان کی شاعری کے بہترین حصوں میں لسانیات کی پانچوں سطحات ، صوتیات ، تجز صوتیات ، شکلیات (صرف) نحو اور معنیات مکمل طور پر برآمد ہوتی ہیں ۔"(۸)

لسانیات ایک سماجی سائنس (Social Sceince) ہے جس طرح سائنس میں معروضی اور تجزیاتی بحثیں ہوتی ہیں ، لسانیات میں بھی اسلوبیات اور صوتیات کی معروضی ، ذوقی ،جمالیاتی ، معنیاتی حیثیت سے بحث کی جاتی ہے ۔ مسعود صاحب نے غالب اور اقبال کی شاعری کا صوتی تجزیہ کرتے وقت یہ واضح کر دیا ہے کہ اقبال اور غالب کی شاعری میں جو تجز صوتیوں Phonemes کا سرمایہ استعمال ہوا ہے وہ کل (۴۷) ہیں ۔ ان میں (۱۵) مصوتے Vowels اور (۳۷) مصمتے (Consonants) ہیں ۔ان میں ق ۔ز ۔ژ ۔ح ۔غ ۔اور ق ، ژ تو تقریبا غیر مستعمل ہے ۔اس طرح ان پانچ آوازوں کو چھوڑ کر باقی تمام خالص ہند آریائی بتائے ہیں ۔

مجموعی حیثیت سے انھوں نے اقبال کے کلام میں صوتی آہنگ کو تلاش کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ اقبال کے یہاں انفی مصوتوں اور انفیت سے ہی اونچے سر بنتے ہیں یا (۶) صفیری آوازوں سے ۔بال جبریل کی اس مشہور غزل کا تجزیہ پیش کیا ہے جس کا مطلع ہے ۔

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ اقبال بنیادی طور پر صوتی آہنگ کے شاعر نہیں بلکہ وہ فکر و تخیل کی آویزش اور آمیزش سے شاعرانہ بصیرت اور نغمہ کا رنگ پیدا کرتے

ہیں ۔ جہاں تک / ق / کا سوال ہے لکھتے ہیں کہ یہ محض حرف کی حیثیت رکھتا ہے ۔ (ص ف ی ر ی) صوت کی نہیں ۔ اقبالؔ کے کلام میں ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن میں صفیری اور مسلسل آوازیں نمایاں معلوم ہوتی ہیں ۔ صوتی تجزیے میں مسعود صاحب نے / ق / سے زیادہ ہکاری آوازوں کی اہمیت پر زور دیا ہے اور اقبالؔ کے کلام میں ان کی تلاش کی ہے ۔

گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

"ہکاری و معکوسی آوازیں کہیں قافیہ کی مجبوری کی وجہ سے تو کہیں بیان کی ادائی کو برقرار رکھنے کے لیے درکار ہوتی ہیں اقبالؔ کے یہاں ہکاری اور معکوسی آوازوں کا استعمال فطری طور پر ہوا ہے ۔" (۹)

مسعود صاحب نے واضح کیا ہے کہ اقبالؔ بنیادی طور پر پیام بر شاعر ہیں لیکن محتاط فن کار ہیں ۔ اقبالؔ کی نظموں کا تجزیہ بڑی بصیرت سے کرتے ہوئے کہا ہے اقبالؔ اپنی شاعری سے صوتیاتی آہنگ کو اردو شعریات کا عجوبہ بنا دیتے ہیں ۔

لیکن گوپی چند نارنگ نے اس طرح اظہار کیا ہے:

"اصوات کی اس خوش امتزاجی نے اقبالؔ کے صوتیاتی آہنگ کو ایسی دلآویزی، توانائی، شکوہ اور آفاق میں سلسلہ در سلسلہ پھیلنے والی ایسی گونج عطا کی ہے جو اپنے تحرک و تموج اور رنگ و بو کے اعتبار سے بجا طور پر یزداں گیر کہی جا سکتی ہے ۔" (۱۰)

اقبال کے صوتی آہنگ کی خصوصیت یہ ہے کہ جن آوازوں کو کرخت مانا جاتا ہے وہی ان کے یہاں خاصے شگفتہ اور شاعرانہ الفاظ کی صورت میں تشکیل پاتے ہیں ۔

مثلاً

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی

بقول شمس الرحمن فاروقی اصوات کی خوب صورتی یا بد صورتی کے بارے میں کوئی اقداری فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ ہر آواز اپنی مناسب جگہ پر خوب صورت ہوتی ہے۔

اقبال کے ترکیب بند

(۱۲) صفحات پر مشتمل یہ مقالہ "مقالات مسعود" میں شامل ہے۔ اس میں اقبال کے ترکیب بند کا ہیئتی مطالعہ کرنے کے لیے مسعود صاحب نے اسیر لکھنوی، دیبی پرشاد سحر بدایونی، شمیم احمد کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان نظریات کا تعارف کروایا ہے جو انھوں نے بند کی تعریف اور اس کی بنیادی اہمیت کے بارے میں لکھے ہیں۔ اس کے بعد مسعود صاحب نے ترکیب بند کی شناخت کے لیے (۷) اصول مرتب کیے ہیں اور اقبال کی نظموں میں تصویر درد، طلوع اسلام (ہزج مثمن سالم) شمع و شاعر خضر راہ، ابلیس کی مجلس شوریٰ (رمل مثمن محذوف) مسجد قرطبہ، ذوق و شوق (اجر، مثمن مسطوی مجنوں) کا ہیئتی تجزیہ کیا ہے اور ترکیب بند کی ہیئت کی معیار بندی کی ہے۔

اقبال کی نظری اور عملی شعریات

۸۲-۱۹۸۱ء تعلیمی سال کے دوران میں مسعود صاحب اقبال انسٹیٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی میں بطور وزیٹنگ پروفیسر، مامور ہوئے تھے۔ ان دنوں پروفیسر آل احمد سرور اقبال انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر تھے۔ اس زمانے میں مسعود صاحب نے لسانیات کے اصولوں پر متعدد لکچر دیے اور اقبال کی شعریات پر بھی مقالے تیار کیے۔ بعد میں یہ تمام مقالے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ یہ کتاب (۹۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے دو حصے ہیں ٠ پہلا نظری شعریات اور دوسرا عملی شعریات۔ پہلے حصے میں تین مقالات شامل ہیں۔

الف۔ اقبال کا تصور حسن و فن ۔۔۔۔۔۔خودی سے پہلے

ب۔ اقبال کا تصور فن شعر، ۔۔۔۔۔خودی کے بعد

ج۔ اقبال کا تصور شعر

ابتداً اقبال کے اس حصے میں نظری شعریات پر بحث کی گئ ہے ۔اس دور کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جوں جوں ان پر خودی کا تصور روشن ہوتا گیا انھیں شاعری ساحری کی بجائے پیمبری نظر آنے لگی اور وہ الہام و نزول کی اصطلاحوں میں سوچنے لگے۔" (۱۲)

اس سے قبل ان کے ذہن میں حسن کے کئ پیکر بنتے رہے ہیں ۔ حسن کی حقیقت مطلق کو اقبالؔ اکثرو بیشتر نور ہی کے لباس میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ حسن اس کائنات کے ذرہ ذرہ میں ہے جن میں جمادات، نباتات اور حیوانات سب ہی شامل ہیں ۔اقبالؔ کے اس نظریے حسن کو مسعود صاحب نے ان کے کلام کی روشنی میں جانچا ہے۔

اور پھر اقبال کے فلسفۂ خودی میں جمالیاتی مضمرات کی نشاندہی کی ہے:

"انھیں خودی کے پیغام کے لیے درماندہ غلام کی رگوں میں قوم کی زندگی دوڑانے کے لیے ایک ایسے فن کی ضرورت تھی جو ضرب کلیمی رکھتا ہو۔" (۱۳)

اقبالؔ جلال اور جمال دونوں کو حسن کی صفت مانتے ہیں اور حسن کے مظاہر میں ایک کو قوت و جبروت اور قہاری و جباری سے عبارت کرتے ہیں اور دوسرے کو لطافت و نزاکت سے عبارت سمجھتے ہیں ۔یہ نظریے قرآن حکیم کی رو سے مسلمہ ہیں ۔ حسن مکمل میں دونوں کا امتزاج اور توازن ضروری ہے۔ مسعود صاحب نے اپنے اس تنقیدی مقالے میں جمال سے زیادہ جلال کو اہمیت دی ہے:

"اقبال کا کلام ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہے جہاں جلال کو فن کی غالب خصوصیت بتایا گیا ہے ۔اس کے برعکس ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے جن میں صرف جمال کو حسن کی غالب خصوصیت بتایا گیا ہے ۔" (۱۴)

اقبال کی شاعری کا اہم موضوع ان کا فلسفہ خودی ہے جس میں حرکت اور حیات کا فلسفہ پوشیدہ ہے ۔جلال حرکت و عمل کی دعوت دیتا ہے اور عمل کو مہمیز کرتا ہے ۔اس لیے فلسفہء خودی میں اقبال نے جلال کو زیادہ ترجیح دی ہے ۔

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"جہاں تک ان کے نظریے حسن و فن کا سوال ہے پروفیسر مسعود حسین نے یہ درست کہا کہ فلسفہء خودی پر راسخ ہونے سے ان کی یہاں جو کلمہ وجودی فکر کا اثر غالب ہے اس لیے اسی کے تحت انھوں نے حسن کو بھی دیکھا ۔ہاں جب خودی کا فلسفہ ان کی فکر کا محور بن گیا تو نظریہء حسن و فن بھی اسی سانچے میں ڈھل گیا ۔" (۱۵)

اقبال نے اپنی شاعری کو قوم کی بے داری اور اثبات خودی کی شاعری قرار دیا ہے ۔اقبال کی شاعری کو مسعود حسین نے ادب "برائے زندگی" کی شاعری بتلایا ہے ۔ اقبال کے شعر یا شاعری کی ایک منزل "ادب برائے خودی" بھی ہے ۔اس میں بھی ان کے یہاں افادیت اور مقصد حیات ہے جو بعد میں سماجی افادیت کا بھی آلہ کار بن گئی ہے ۔آگے چل کر اقبال کی شاعری کو انھوں نے لفظوں کی بازیگری نہیں بلکہ و دلعبی اور وہبی جوہر قرار دیا ہے ۔

مقصدیت کے حامی ناقدوں کے دو گروہ ہیں ۔ایک گروہ جس کا سربراہ فرائڈ ہے ۔وہ فن میں مقصد کی تحدید، مسرت اور انبساط کو محدود انداز سے دیکھتا ہے ۔اور دوسرا گروہ جس میں افلاطون ، برناڈ شا ، ٹالسٹائی ، وغیرہ شامل ہیں ، ان کے ہاں مقصدیت کا تصور ، سماجی اصلاحی اور بہبودی کی ذمہ داری ہوتا ہے ۔اقبال اسی

دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس کتاب کے پہلے حصے میں مسعود حسین خاں نے اقبال کے تخیل کی بلندی کے نظریے پر زیادہ زور دیا ہے۔اقبال کی ابتدائی دور کی شاعری میں جو زبان کی لغزشیں تھیں اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کا کلام الہامی نہیں ہے کہ جس میں کوئی عیب نہ ہو:

"زبان کی بعض لغزشیں ضرور تھیں جن پر زبان کے ٹھیکہ داروں نے اعتراضات بھی کیے ہیں مگر ان کے علاقے کی اردو میں اور دہلی و لکھنو کی اردو میں کچھ فرق قدرتی تھا جس پر معترضین نے غور نہیں کیا ہے۔" (۱۶)

مسعود حسین نے نہ صرف اقبال کی شاعری، زبان اور تخیل کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے بلکہ معترضین کے جوابات بھی دیے ہیں:

"شعر انفرادی ذہن کے طلسم کا گنجینۂ معنی ہوتا ہے اور اس نوعیت کے لیے ضروری ہے کہ نقاد شعر، اسے خود اسی کے معیار پر پرکھے۔یہ معیار جمالیاتی عمل کے ان دائروں سے بنتا ہے جو ذہن شاعر اور لسانی مواد کے عمل اور رد عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔" (۱۷)

اقبال کی شاعری فکری شاعری تھی جس میں وہ تخیل کا خلاق تھا۔اس میں معنی آفرینی اور حسن آفرینی کے لیے انھوں نے فارسی تراکیب کے ذریعے زبان میں توسیع کی ہے۔

دوسرے حصے میں مسعود صاحب نے لسانیاتی مطالعے کی روشنی میں اقبال کے اشعار کا تجزیہ کیا ہے۔

پروفیسر مغنی تبسم لکھتے ہیں:

"مسعود صاحب نے تخلیق اور تخلیق کار کے باہمی ربط کو یہاں تک

اہمیت دی ہے کہ کلام اقبال کا صوتیاتی نقطہ نظر سے جائزہ لیتے ہوئے مصمتہ /ق/ کو /ک/ سے بدل دیتے ہیں۔" (۱۸)

اقبال کی شاعرانہ زبان کے متعلق انھیں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"میری تہذیب مرکب تہذیب ہے۔اس کی روح عربی ہے مگر اس کا لباس ترک و تاتار اور خوانسار و اصفہان نے تیار کیا ہے۔ میں جو اردو لکھتا ہوں میری تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے اور میں اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔" (۱۹)

اقبال کی ابتدائی شاعری میں فارسی کی آمیزہے۔بانگ درا اس کا ثبوت ہے۔ اس کے بعد سے انھوں نے فارسی آمیز اردو کو ہی اپنی شاعری کا ذریعہ بنایا۔اس آمیزش سے ان کے کلام میں ترنم اور شگفتگی پیدا ہوگئی ہے اور ایک ایسا سنگم ملتا ہے جس میں ترنم، گونج، زیر و بم سب کچھ موجود ہے۔آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"پروفیسر مسعود حسین نے اقبال کی لسانی صلاحیت اور شعور پر کافی زور دیا ہے۔صوتی آہنگ کے سلسلے میں یہ بات دلچسپ کہی ہے کہ فارسیت شعری آہنگ میں ہے، صوتی آہنگ میں نہیں۔اس سے پروفیسر گیان چند کے اس خیال کی نفی ہوتی ہے کہ بانگ درا کے بعد اقبال مجازیت اور عرب کے سوزدروں سے شغف کی وجہ سے ہندوستانی آہنگ سے کچھ دور ہوگئے۔" (۲۰)

اقبال نے روایت پسندی کے ساتھ ساتھ اپنی جدت فکر اور دل گداختہ سے اردو زبان کو پگھلا کر نئے سانچوں میں ڈھال دیا تھا۔اس بات کو مسعود صاحب نے بڑے ہی شگفتہ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے:

"مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ سخن وری میں طرز کہن پر اڑنے والوں میں سے تھے لیکن سخن وری سے کام انھوں نے جدید فکر کا لیا۔" (۲۱)

مسعود صاحب نے صوتیات کی سطح کے علاوہ دیگر مطالعہ متن کو بھی اپنی تنقید کا پہلو بنایا ہے اور اقبال کے فکر و فن کو جدید و قدیم کی کسوٹیوں پر پرکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ اقبال ماضی و حال اور مستقبل کے شاعر تھے۔

اقبال کی شاعری میں چوں کہ پیام حرکت و عمل ہے اس لیے وہ غیر محسوس کو محسوس کا پیکر عطا کر کے شاعر سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ فطرت کے بے پایاں سمندر میں غوطہ زنی کرتا ہو۔ اقبال شاعر کے تخیل کے متعلق یہ تصور رکھتے ہیں کہ شاعر خواب نہیں دیکھتا بلکہ عمل کرتا ہے اور شاعر کا واحد مقصد حقیقت نگاری ہے۔ فطرت اس کی ترجمان ہوتی ہے۔

مسعود صاحب لکھتے ہیں کہ اس مقام و رتبہ کا شاعر نہ صرف خوب کو خوب تر بناتا ہے بلکہ اپنے فن کو محبوب تر دکھاتا ہے:

بحر و بر پوشیدہ در آب و گل
صد جہان تازہ مضمر در دلش

اس کے برعکس اجل پرست شاعر بوسہ، گل سے تازگی چھین لیتا ہے۔

اقبال کا کلام ذوقِ عمل، یقینِ محکم، خلوص و محبت اور قوم و ملت کو انسانیت کا درس بخشنے والا ہے۔ اقبال اپنی شاعری کے ذریعے عظمت اور خودی سے زندگی کا نصب العین پیش کرنا چاہتے تھے۔

اقبال کے کلام یا تخیل پر فلسفہ، توحید کے ساتھ، قرآن اور قرآنی تعلیمات کے سوا جو عقیدت شامل تھی اس پر مولانا روم کی مثنوی کے اثرات بھی تھے۔ اقبال نے مولانا روم کے شعری تخیل سے یہ اندازہ قائم کیا کہ مشرق کا مسلمان مرد بیمار بن گیا ہے۔ اسلامی شان و شوکت، زوال پذیر ہو گئی ہے۔ مغربی فلسفہ کی تقلید مشرقی سماج کی جڑیں کھوکھلی کر رہی تھیں۔ ایسے پریشان کن دور میں اقبال نے انسان کامل کی

تلاش کی اور تاریخ اسلام میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اقبال نے مردمومن یا مرد کامل میں دو متضاد صفات کا ذکر کیا۔ مسلمانوں کو مانند خورشید بتایا ہے جو ایک سمت میں غروب ہوتا ہے تو دوسری جانب طلوع ہوتا ہے:

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے

یہاں سے بحث آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اقبال کے نظریے مردِ مومن کے بعد ان کی شہرت کی بنیاد قومی و وطنی شاعری پر مبنی ہے۔ اقبالؔ کی قومی شاعری محض رسمی نہیں ہے۔ ان کے خیالات وجذبات اکتسابی نہیں بلکہ ذاتی تھے۔ ان کے وطنی اور ملی جذبات میں ایک کشمکش رہی ہے۔ "تصویر درد" وطن کا مرثیہ پیش کرتی ہے۔ ترانۂ ہندی وطن پرستی کا جذبہ اور قومیت کا درس ہے تو نیا شوالہ وطن دوستی کا عکس ہے۔ وطنیت کے ساتھ اقبالؔ کے ملی نظریے میں بین الاقوامیت بھی کارفرما ملتی ہے۔

اسلوبیات، توضیحی لسانیات کا عنصر ہے جس کی بنیاد لفظ پر استوار ہوتی ہے۔ اقبال کے لسانی شعور کا توضیحی لسانیات کے زیر اثر مطالعہ کرتے ہوئے مسعود صاحب نے لکھا ہے کہ اقبال نے اردو شاعری کی فرہنگ میں اضافہ نہیں کیا بلکہ الفاظ کے مفہوم کو بدلا ہے۔

سلیم اختر نے مسعود صاحب کے اس نظریے پر لکھا ہے:

"مسعود حسین خاں نے علامہ اقبال کا صوتی آہنگ اجاگر کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ اقبالؔ اور غالبؔ کا صوتی آہنگ فارسی کا ہے۔ ان کے بموجب فارسیت کا الزام ان دونوں شاعروں کے شعری فرہنگ پر کیا جا سکتا ہے۔ صوتی آہنگ پر نہیں۔" (۲۴)

اقبالؔ اور غالب کے شعری اسالیب کا تجزیہ کرتے ہوئے مسعود صاحب نے ق بھ، دھ، اور گھ، کی مثالیں دے کر نتائج اخذ کیے ہیں۔اس نظریے کے بارے میں سلیم اختر کہتے ہیں:

"لفظ اپنی خلق میں انسانی آلات، اصوات کے ذریعے سے ہوا کے نکاس کی مختلف صورتوں کا مرہون منت ہوتا ہے ۔ اسی لیے اسلوبیات کا انحصار بھی اصوات پر ہوتا ہے۔" (۲۴)

اسلوبیات کا انحصار در حقیقت نہ صرف اصوات پر ہوتا ہے بلکہ زبان پر بھی ہوتا ہے۔فاضل مضمون نگار نے مسعود صاحب کے اس (ساخیاتی) اسلوبیاتی تجزیے پر تنقید کرتے ہوئے اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

"ایک مقام پر اسلوبیات اور شماریات مصافحہ کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور شاید ایک ایسا وقت بھی آجائے جب نقاد کو کمپیوٹر کے لیے جگہ خالی کرنی پڑے ـــــ لیکن بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ اس طریقے میں الفاظ کے نفسی تلازمات اور اسلوب کی جمالیات سے صرف نظر کر دیا جاتا ہے۔اس امر کے باوجود بھی اسلوبیات کے انداز تحلیل کی اپنی افادیت بھی ہے۔بہرحال اسلوبیاتی نقطہ نظر سے مسعود حسین خاں کی یہ تحلیل مطالعہ اقبال میں مضمر مزید امکانات کی نشاندہی کرتی ہے۔" (۲۵)

مسعود صاحب کے طریقہ کار سے تو اختلاف کیا ہے لیکن ان کے اخذ کردہ نتائج کو تسلیم کیا ہے۔

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو

اقبال اور غالب مسعود صاحب کے دلچسپ موضوعات رہے ہیں۔انھوں نے اپنے ادبی اور تنقیدی زاویۂ نظر سے اقبال کی شاعری اور مختلف نظریات کا وقتاً فوقتاً

اپنے نگارشات کے ذریعے جائزہ لیا ہے۔ مذکورہ مضمون آجکل شمارہ (۲) جلد (۱۳) سپٹمبر ۱۹۵۲ء میں (۴) صفحات پر شائع ہوا تھا۔ بعد کو یہ مضمون مسعود صاحب کے پہلے مجموعہ مضامین میں زبان وادب ۱۹۵۹ء میں شامل ہوا۔

مضمون کی ابتدا میں عنوان کے تعلق سے تشریح کردی گئی ہے کہ تضاد سے مفکر اقبال کی تنقیص مقصود نہیں بلکہ فلسفہء جدید میں "تصور تضاد محمود ہے نہ کہ نامحمود ہے۔ انھوں نے فکری اعتبار سے اقبال کو مجدد مانا ہے۔ اقبال نے اپنے تضاد تصورات سے فکر کا نیا امتزاج تیار کیا ہے۔ ان کے فلسفلہ کی بنیاد تعلیمات اسلامی پر ہے۔ لکھتے ہیں:

" ان کے پاس ایک بنیاد ضرور ہے۔ یہ بنیاد، تعلیمات اسلامی کی ہے اسی پر انھوں نے اپنا قصر فکر تعمیر کیا ہے جو بیک وقت سوز و ساز رومی اور پیچ و تاب رازی، دانش برہانی اور دانش نورانی سے لا اور نشہ الاالله سے مرکب ہے۔" (۲۶)

اقبال نے کسی بھی تہذیب سے بیزارگی کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ ان کے افکار میں یورپ کی روشنی، علم و ہنر اور حکمائے مشرق کی نظر دونوں شامل ہیں۔ اقبال کے مرکب فلسفہ میں اجتہادی نقطہ نظر ملتا ہے۔ ابتدا میں اقبال وحدت الوجود کے قائل تھے اور رفتہ رفتہ یہ نظریہء خودی بنتا گیا۔ اقبال ماورائیت پر زور تو دیتے ہیں اور تصوف پر اعتراض تو کرتے ہیں لیکن وہ خود ایک صوفی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اقبال کے نظریے میں مرد مومن کا قلب مسکن خدا ہوتا ہے اور اس کے عبادات بیرونی نہیں بلکہ تزکیہ قلب اور اجتماع قومی اور اتحاد ملی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ خواہشات نفسانی ارادہء الہیٰ میں فنا ہوجاتے ہیں جو نفس امارہ کو اپنا غلام بناتا ہے وہی مجتہد ہوتا ہے:

عالم ہے فقط مومن جاں باز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

اقبال کے افکار دوسری سطح پر خدا کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے کائنات کے ارتقا پر سائنسی نقطہ نظر سے حیات ارتقا کے مدراج طے کرتے ہیں۔ مسعود صاحب کے خیال میں اقبال شعلہ و دود دونوں کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اقبال ارتقاِ حیات کو بندہ مولا کی صفات سے آگے نہ لے جاسکے۔ نیٹشے جسم کے بغیر بقائے روح کا معتقد نہیں لیکن اقبال کا فلسفہ بقائے روح پر تعمیر ہوتا ہے۔ ان کا تصور منطقی نہیں وہ اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

اقبال کا دوسرا فلسفہ وجدانی ہے اور تیسری سطح میں ان کا سماجی فلسفہ ہے۔ معاشرتی فلسفہ پر اقبال کا اجتہادی نقطہء نظر ختم ہوجاتا ہے اور وہ قدامت پرستی کا شکار ہوجاتے ہیں اس کی بہترین مثال ان کے نظریے آزادی نسواں ہے جسے وہ حل نہ کر سکے۔ اور صرف غم ناک ہو کر رہ گئے:

میں بھی مظلومی نسواں سے ہوں غم ناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدہ مشکل کا کشود

اس دور میں وہ یورپی تہذیب پر تنقید کرتے اور ماضی کو حال پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی سماجی افکار اقبال کو مجموعہ اضداد بنادیتے ہیں:

مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

اقبال کا تضادِ فکر نظریہ، سیاسی سطح پر زیادہ ہوجاتا ہے۔ اقبال نے پر آشوب دور میں ہر دبستان خیال کے لوگوں کی ترجمانی کی۔ سیاسی منتشر خیالی میں بھی اقبال کی ساری توجہ، قوم وطن اور مذہب پر رہی۔ اقبال کی وطنیت اور اسلامیت کی دو رنگی کا مسعود صاحب نے ذکر تو کیا ہے لیکن کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرسکے تاہم اس مضمون کے آخر میں اقبال کے ذہنی افکار کے بارے میں چند دلچسپ باتوں کا اظہار کیا ہے جو سیاست سے زیادہ متعلق ہیں۔

فلسفہ اقبال پر تنقیدی اشارے

(۱۱) صفحات پر بسوط مضمون میں اقبال کے فلسفے پر تنقیدی نظریات پیش کیے ہیں ۔ یہ مضمون گذشتہ مضمون سے ارتباط رکھتا ہے ۔ اقبال کی شاعری میں مذہب، فکر اور فن تینوں کا امتزاج ملتا ہے ۔

فلسفہ خودی میں وجدان ہے ۔ اقبال کے نزدیک استحکام خودی انسان اور ملت کا ذریعہ حیات ہے ۔ خودی میں ڈوبنا اور اس بحر ناپیدا کنار سے ابھرنا اس شخص کے بس میں ہے جو باحوصلہ ہوتا ہے اور خود اعتماد ہوتا ہے:

خودی میں گم ہو ، خدائی تلاش کر غافل !
یہی ہے تیرے لیے اب صلاح کار کی رائے ؟

مسعود صاحب نے اقبال کے فلسفہ خودی کے نفسیاتی مفہوم کی وضاحت کی ہے ۔ لکھتے ہیں:

"اقبال کے فلسفیانہ خیالات کی بڑی دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ان کی ابتدا نہیں معلوم ان کی انتہا بھی تاریکیوں میں کھو جاتی ہے ۔ وہ بیک وقت جدید بھی ہیں اور قدیم بھی ۔" (۲۷)

غالب کے خطوط کی لسانی اہمیت

اٹھارھویں صدی عیسوی میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اردو نثر کا آغاز ہوا ۔ ابتدائی جدید نثر کے کارناموں میں کتابوں کے ترجمے اہمیت رکھتے ہیں جن سے اردو نثر کے معیار اور اسلوب میں خاص ترقی ہوئی ۔ میر امن کی باغ و بہار نے اردو نثر کے اسلوب کو سلاست و فصاحت سے قریب کیا ۔ غالب نے اردو نثر میں ایک نیا طرز ایجاد کیا ۔ مراسلہ کو مکالمہ بنایا ۔ غالب ایک سوچنے والے ذہن کا مظہر تھے ۔ پروفیسر وحید اختر نے نہایت شاعرانہ انداز میں غالب کی شاعرانہ شخصیت پر روشنی ڈالی:

"غالب صرف اپنی اور اپنے عہد کی شکست کی آواز ہی نہ تھے، وہ گل نغمہ اور پردہ ساز بھی تھے۔(۲۸)

غالب کا عہد لسانی اعتبار سے مختلف طبقات میں بٹا ہوا تھا۔اس دور میں دہلی میں کرختداری اردو کا رواج تھا اور سلاطین دہلی کا حلقہ ایک محدود محاورہ کی زبان استعمال کرتا تھا۔اس کو بیگماتی اردو کہا جاتا تھا۔اس ماحول میں غالبؔ نے اپنے خیال میں مراسلہ کو مکالمہ کے طور پر برتا ہے۔

مسعود صاحب نے غالب کے خطوط کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی لسانی اہمیت کو واضح کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ غالب کے مراسلات میں جو جمع، ترکیب نحوی کے صیغہ میں استعمال ہوئے ہیں وہ فارسی طرز کے ہیں لیکن عام طور پر اس سے جدید اردو نثر کے خاکے بنتے ہیں۔چند نحوی تراکیب اور متروک افعال کے سوا غالب کے خطوط کی زبان جدید اردو نثر کا عکس ہے۔غالب کے خطوط کے حوالے سے انھوں نے اسمائے ضمیر روز مرہ اور محاوروں کا لسانی مطالعہ پیش کیا ہے۔غالب کی نثر کا ان کے شعری اسلوب سے مقابلہ کرتے ہوئے غالب کی ایک غزل کا اسلوبیاتی تجزیہ کیا ہے:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

اس غزل کا تعلق غالب کی ریختہ گوئی کے دوسرے دور سے ہے۔ان کا کہنا ہے کہ غالب کی اس غزل میں آورد بنانے (ساختن) کی تمام کشاکش موجود ہے۔"آورد" اور ورود" ایک ہی لسانیاتی عمل ہے۔

غالب کی شاعری میں انفرادیت پسندی ہے۔بحر کا انتخاب شاعر کی واردات زائدہ نہیں بلکہ دوسروں کا کیا ہوا ہوتا ہے۔غالب کے یہاں مطلع ہی سے بحر۔قافیہ اور ردیف پر غلبہ حاصل رہتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اس غزل کے (۱۶) اشعار میں (۸) شعر بھرتی کے ہیں اور (۸) شاعر نے اپنے کمال فن سے "آورد" کو "آمد" بنایا ہے۔صوتی

آہنگ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"صوتی آہنگ ان کے یہاں شعوری طور پر نہیں آیا، آمد کی رو میں برآمد ہوتا ہے اور غزلوں کے مزاج اور کیفیت کے مطابق ہوتا ہے۔"

(۲۹)

مسعود صاحب نے غالب کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے جن خصوصیات کی نشاندہی کی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) غالب کے کلام میں مصوتوں پر ختم ہونے والے قافیے (۴۸) ہیں اور مصوتوں سے شروع ہونے والی ردیفوں کی تعداد (۷) ہے ان میں (۲) قافیے مصوتے پر ختم ہوتے ہیں۔ان کی (۲۲) غزلوں میں ارتعاشی مصمتہ / ر / استعمال ہوا ہے۔(۱۹) میں / اؤں / اور ین پر مشتمل ہے۔(۱۶) / ا / کی افقی شکل میں / ان / رکھتے ہیں۔

مسعود صاحب نے شعری تجزیے کو صوتیات کی روشنی میں پرکھا ہے۔ان کا استدلال ہے کہ:

"آمد شعر کے وقت شاعر کا ذہنی ارتکاز لفظ اور ترکیب پر زیادہ ہوتا ہے اسلیے جب تک صوتی سانچے اس کے شعری وجدان کا جز نہ بن جائیں ان میں تنافر پیدا ہونے کا امکان قائم رہتا ہے۔دوسرے الفاظ میں صوتی سطح تخلیق شعر کے وقت زبان کی دیگر سطحوں کے مقابلے میں زیادہ تہہ نشین رہتی ہے۔" (۳۰)

کلام غالب میں قافیے اور ردیف کا آہنگ

اس مضمون میں کلام غالب کا صوتیاتی جائزہ قافیوں اور ردیفوں کے صوتی آہنگ سے کیا گیا ہے۔مسعود صاحب غالب کے صوتی آہنگ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غالب کی فارسی گوئی اور فارسی دانی کا اثر ان کے ریختے پر بھی نمایاں

ہے۔اور شعر کی زبان کو انھوں نے ذوق کی محاورہ بندی سے نکال کر عجمی لالہ زاروں میں لا کھڑا کیا۔" (۳۱)

مسعود صاحب نے غالب کی صفیری آوازوں کے استعمال پر زیادہ زور دیا ہے صفیری آوازوں کا استعمال اقبال کے یہاں بھی ہے لیکن غالب کے یہاں تفکر حریز کی حیثیت رکھتا ہے۔غالب نے مصوتوں کو مصوتوں ہی کی حیثیت سے زیادہ استعمال کیا ہے۔ مسعود صاحب لکھتے ہیں کہ غالب کا کمال لفظ اور ترکیب میں ظاہر ہوتا ہے۔ صوتی آہنگ میں نہیں وہ لفظ کو اس قدر تہہ دار اور پہلو دار بناتے ہیں کہ صوتی آہنگ کی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔غالب نے رمزیہ فنی رویے سے نحوی ڈھانچے میں خاصی تخفیف کی ہے اور طویل مصوتوں کا بہت کم استعمال کیا ہے:

"عین ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ طویل مصوتوں کی کفایت ہو لیکن اس بارے میں پوری تصویر سامنے نہیں آتی۔" (۳۲)

غالب بنیادی طور پر صوتی آہنگ کے شاعر نہیں ان کی شاعری میں صوتی آہنگ سے زیادہ ندرتِ الفاظ اور معنی آفرینی ملتی ہے۔آہنگ شعر میں میر اور غالب کی غزل سے فانی کی غزل کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔

فانی کی مختلف غزلوں کا حوالہ دیتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ فانی کی شاعری میں جو بحریں ملتی ہیں ان میں صوتی آہنگ موجود ہے۔اس کے ساتھ ساتھ فانی کی شاعری میں ان صوتی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہیں جس کا بہت کم اظہار ہوتا ہے۔ معکوسی / ڑ / ن جو صوتی حیثیت سے سیاق و سباق اردو شاعری میں نہیں کھپتا اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"معکوسی / ڑ / یقیناً صوتی سیاق و سباق میں نہیں کھپتی لیکن یہ ہند آریائی اردو کی ایک بنیادی آواز ہے۔" (۳۳)

پروفیسر مغنی تبسم اور مرزا خلیل احمد بیگ نے صفیری و حلقی مصمتے کو حزن

ویاس اور آہ کے اظہار سے مربوط کیا ہے جس پر مسعود حسین خاں نے بہت پہلے اظہار خیال کیا ہے جس کی تصدیق پروفیسر گیان چند سے ہو جاتی ہے۔ مغنی تبسم اور مرزا خلیل احمد بیگ کے حوالوں کو پیش کرتے ہوئے "ہ" کے تصور کے متعلق لکھا ہے کہ

> "ہ" میں یاسیت کا تصور اصلاً ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا ہے جو ان سے ان کے دونوں شاگردوں مغنی تبسم اور مرزا خلیل بیگ تک پہنچتا ہے۔" (۳۴)

مقدمات شعر و زبان

مسعود صاحب نے ایم۔اے میں تحقیقی مقالہ پریم چند پر لکھا تھا۔اس وقت سے ان کی ادبی و تحقیقی صلاحتیں زبان و ادب اور تحقیق و تنقید کی طرف زیادہ رہیں جس کا ثبوت ان کے وہ مضامین ہیں جو ۱۹۴۴ء سے گرفت تحریر میں آتے رہے ہیں ۔۔ یہ مضامین ادبی، تحقیقی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں ۔ مسعود صاحب نے کم لکھا ہے لیکن جب لکھا سارے اردو حلقے میں اس کی پذیرائی ہوئی ۔ان کے مضامین میں تحقیق و تنقید اور لسانیات کا عنصر غالب ہے۔ مسعود صاحب کے تین مجموعہ مضامین شائع ہو چکے ہیں ۔پہلا مجموعہ "اردو زبان و ادب" ہے جس میں (۱۵) مضامین شامل ہیں دوسرا مجموعہ شعر و زبان ہے۔اس میں بارہ (۱۲) مضامین ہیں اور مقالات مسعود میں (۱۶) مقالات شامل ہیں ۔انھوں نے یہ مضامین قلم برداشتہ نہیں بلکہ بڑے غور و فکر کے بعد تحقیقی، تنقیدی، ادبی و لسانی مسائل پر قلم بند کیے ہیں جس میں ادبی تحقیق اور ادبی محاسن کی تمام خوبیاں ملتی ہیں۔

" مقدمات شعر و زبان " یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی مالی اعانت سے شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی جانب سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔یہ مجموعہ ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔اس کے تین مضامین اس سے قبل کے مجموعے مضامین " اردو زبان و ادب "

(۱۹۵۲) میں بھی شامل ہیں ۔ شعروزبان کے مجموعہ کا انتساب مسعود صاحب نے اپنے مرحوم بھائی محترم امتیاز حسین خاں کے نام کیا ہے جن کا تعلق نامورانِ جامعہ عثمانیہ سے ہے۔

شعروزبان کے (۱۲) مقدمات میں پہلے حصے کے (۷) مضامین کا تعلق شاعری اسلوبیاتی تنقید، عروضی تجزیات سے ہے ۔ دوسرا حصہ زبان سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے ۔

۱۔ تخلیق شعر۔ اس مضمون میں شعر کی تخلیق کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ۔ شعر کیسے بنتا ہے ؟ شعر پر خارجی ماحول کا کیا اثر ہوتا ہے ؟ شاعر تخلیق شعر کن حالات میں کرتا ہے ؟ ان سوالات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تخلیق شعر کے ابتدائی مدارج میں شاعر کی توجہ نہ صرف خیال پر شدت کے ساتھ مرکوز ہوتی ہے بلکہ اس تجزیے میں نشاطی کیفیت بھی ہوتی ہے ۔" (۳۵)

شاعر کے لیے شعر کی تخلیق کا سب سے بڑا محرک وہ جذبات اور تخیلی وحدت کو بتاتے ہیں ۔ اس عمل میں تخلیق کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔ تخلیقی عمل کے لیے مادی بنیاد کا ہونا ضروری ہے جس میں زبان کی عضویاتی اور صوتیاتی بنیادیں شامل ہوتی ہیں ۔ شعر، شاعر کے جمالیات، تاثرات، احساسات، حافظہ اور ذہنی کیفیات کا عکس ہوتا ہے ۔

مسعود صاحب کے تخلیق شعر کے نظریے کے بارے میں پروفیسر مغنی تبسم لکھتے ہیں:

"(وہ) فن میں جمالیاتی اور عمرانی اقدار کی ہم آہنگی پر زور دیتے ہیں ۔ اپنے مضمون، "تخلیق شعر" میں انھوں نے تخلیقی عمل کے شعور و

لاشعوری اور خارجی و داخلی محرکات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے ۔"

(۳۶)

۲۔ مطالعہ شعر صوتیاتی نقطہء نظر سے ۔ مسعود صاحب ایک ممتاز محقق، ماہر لسانیات و شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نقاد بھی ہیں ۔انھوں نے سائنٹیفک طریقہ پر فن کو پرکھا اور نئے نظریات قائم کیے ۔

مطالعہ شعر یہ وہ مضمون ہے جو "مقالات مسعود" اور "اردو زبان و ادب" کے علاوہ کئی رسائل میں بھی شائع ہوا ۔ اس مضمون کی روشنی میں اردو ادب میں اسلوبیاتی تنقید کا دبستان کھلتا ہے جس میں توضیحی لسانیات کے اصولوں کی روشنی میں شعر کا مطالعہ کیا گیا ہے جو پہلی جدت ہے ۔

صوتی اور اسلوبی حیثت سے اس کی خاص اہمیت ہے ۔ شعر کا صوتی مطالعہ کرتے ہوئے تنقیدی نظریات قائم کیے ہیں ۔ لکھتے ہیں:

"شعر انفرادی ذہن کے طلسم کا گنجینہء معنی ہوتا ہے اور اس نوعیت کے لیے ضروری ہے کہ نقاد شعراء اسے خود آگہی کے معیار پر پرکھیں ۔ یہ معیار جمالیاتی عمل کے ان دائروں سے بنتا ہے جو ذہن شاعر اور لسانی مواد کے عمل اور رد عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔" (۳۷)

مسعود صاحب نے اپنے اس مضمون میں واضح کیا ہے کہ شعر صوتیات کی سطح سے ابھر کر ارتقائی صوتیات، تشکیلیات، صرف و نحو اور معانیات کی پرپیچ وادیوں سے گزرتا ہوا اسلوبیات پر ختم ہوتا ہے ۔ مسعود صاحب کی اس تحقیقی تنقید پر پروفیسر مغنی تبسم صاحب رقم طراز ہیں:

"قدیم ہیئتی تنقید کے سوا تمام دبستانوں میں متن کو یا تو سرے سے نظرانداز کیا جاتا تھا یا اسے ضمنی حیثیت دی جاتی تھی ۔ مسعود صاحب نے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اور محسوس کرتے ہوئے اردو

تنقید کو ادبی اور سائنٹیفک بنانے کی کوشش کی ہے۔" (۳۸)

۳۔ سماج اور شعر یہ مقالہ (۲۴) صفحات پر مشتمل ہے جس میں ادب اور فن کو سماج کا ایک مستقل روپ قرار دیا ہے۔ فن کار کا تخلیق اور سماج سے گہرا رشتہ ہوتا ہے لیکن تخلیق میں انفرادیت اور آزادی رائے بھی ضروری ہے۔ فن کار اپنے اطراف کے ماحول کو اپنے تخیل کی روشنی میں پیش کرتا ہے۔ شاعر اور سماج کے اس رشتہ کو بڑے خوب صورت انداز میں اس طرح پیش کیا ہے:

> "شاعر یقیناً ایک سیاسی جانور ہوتا ہے لیکن وہ سماج کے تقاضوں کو اپنے انداز میں پورا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنا ہدایت نامہ خود مرتب کرتا ہے وہ کسی خالص تصور حیات کو خون میں حل کر کے تخلیق شعر کر سکتا ہے لیکن اگر کیمیائے شعر کے اس بنانے میں ایک تاؤ کی بھی کمی رہ گئی تو مس خام کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" (۳۹)

شاعر کی انفرادیت اور آزادی تو ضروری ہے لیکن وہ ہر صورت میں سماج کا ایک نمایند اور ذمہ دار شخص ہوتا ہے۔ لہذا شاعر یا فن کار کو چاہیے کہ وہ اپنے فن کے ذریعے سماج کی امنگوں اور آرزوؤں کو ابھارے اور اس کو توسیع دے۔

۴۔ غزل کا فن۔ دس صفحات کے اس مضمون میں غزل کی ہیئت اور اس کے اجزائے ترکیبی کا تنقیدی جائزہ ملتا ہے۔ مطلع، ردیف، قافیہ، مقطع اور بحر، غزل کے ان عناصر ترکیبی سے بحث کی گئی ہے۔ غزل اردو اصناف سخن کی محبوب صنف اور اردو شاعری کی آبرو سمجھی جاتی ہے۔ بیسویں صدی سے اس کے رنگ میں تبدیلی شروع ہوتی ہے۔ جدید علوم کی روشنی میں غزل میں نئی تخیلی جدتیں شامل ہونے لگیں اور غزل نئی وسعتوں کے ساتھ لکھی جانے لگی۔ مسعود صاحب نے غزل کے فن کا تنقیدی جائزہ اس طرح لیا ہے کہ شاعر کے قلم یا لفظوں سے غزل کب بنتی ہے؟ اور شاعر کا جذبہ کیوں کر گفتار کا رنگ قبول کرتا ہے؟ ان سوالوں کے پیش نظر غزل کے خدوخال متعین کیے

ہیں:

"غزل کی ہیئت کا اس کے اسلوب پر بھی اثر پڑتا ہے۔ غزل کا اسلوب ایجاز و اختصار، رمز کنایہ، مجاز، تمثیل، استعارہ، تشبیہہ سے مرکب ہے۔ اس لیے اس میں وہ تمام خوبیاں اور خامیاں ملتی ہیں جو سخن مختصر کی خصوصیات ہیں۔" (۴۰)

ہیئت کے اعتبار سے بحر اور قافیہ غزل کے محور ہوتے ہیں غزل کی ردیفوں کے بارے میں کہا کہ فنی اعتبار سے ردیف کی چولیں سب سے پہلے قافیے سے بٹھانی پڑتی ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ کسی ردیف کی چولیں قافیہ کے ساتھ بیٹھ جائیں۔ ردیف غزل کے ایجاز و اختصار پر اثرانداز ہوتی ہے۔ غمنائی شاعری میں جذبہ شدید ہوتا ہے مگر مختصر، اسلیے اس قسم کی غزلوں میں ردیف کی آرائش باآسانی قبول کی جاتی ہے۔ جو فعل اسم اور حروف کی شکل میں استعمال ہوتی ہیں۔

غزل قافیہ کے بغیر اپنا مخصوص اسلوب اور آہنگ برقرار نہیں رکھ سکتی۔ قافیہ غزل میں عصا کا کام کرتا ہے اور ادب میں خوب صورتی یا جمال آرائی سے نہیں بلکہ آداب فن اور ادبی بندشوں سے نکھرتا ہے۔

مسعود صاحب نے ایسی ردیفوں کی طرف داری کی ہے جو افعال پر منحصر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسم والی ردیفیں کم کھنکتی ہیں۔ نئی ردیفوں کے اختراع کے بارے میں فن کار کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں جہاں وہ ردیف و قافیہ کی پابندی سے آزاد نا قدانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"قافیہ غزل میں اس مقام پر آتا ہے جہاں موسیقی میں طبلے کی تھاپ دونوں میں تاثر اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔" (۴۱)

بحر کے تعلق سے کہتے ہیں کہ اس کا انتخاب شاعر غزل میں شعوری طور پر نہیں کرتا، بلکہ جذبات اور احساسات کی وجہ سے از خود بن جاتی ہے۔

مطلع غزل کا پہلا جزو ہے مگر اس کا تعین بھی ردیف و قافیے پر ہوتا ہے ۔ غزل کے ابتدائی اشعار میں مطلع باالالتزام تزلم آتا ہے اور بعض اوقات اس کا جزو مطلع برقرار رہتا ہے ۔اس مختصر سے مضمون میں یہ واضح کیا ہے کہ غزل ایک انفرادی فن کارانہ عمل ہے جس میں جذبات عام ہوتے ہیں اور یہ ماضی، حال اور مستقبل سب کا احاطہ کرتی ہے ۔اس مضمون میں غزل اور شاعری کے بارے میں جن تجربات کا اظہار کیا گیا ہے وہ صرف ایک نقاد کے نظریات یا خیالات نہیں ہیں بلکہ ایک شاعر کے اپنے تجربات ہیں جن سے شاعر گزرتا رہا ہے یہاں اس بات کا ذکر بے موقع نہیں ہوگا کہ پروفیسر مسعود حسین خاں کی علمی و ادبی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی شاعری بھی ہے جن پر اس مقالہ کے چھٹے باب میں گفتگو کی جائے گی ۔

تنقیدی اور ادبی مضامین

جوش ملیح آبادی

مسعود حسین خان نے (۲۰) سے زائد صفحات میں جوش کی شاعری کا جائزہ لیا ہے ۔جوش کی ابتدائی شاعری سے لے کر آخری مجموعے تک تفصیل سے نظر ڈالی ہے ۔ لکھتے ہیں:

> "روح ادب کی ابتدائی نظمیں کھجائے ہوئے غم بھرے ہوئے جذبات اور اشتعال انگیز خیالات کے نقوش ہیں ۔چوں کہ یہ نقوش عام طور سے ناپختہ اور خام ہیں اس لیے شاعرانہ اعتبار سے زیادہ لائق اعتنا نہیں ۔" (۴۲)

شعلہ و شبنم اور فکر و نشاط کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے اظہار کرتے ہیں کہ جوش کی فطرت پرستی کا اصل پس منظر میرانیس کی مرثیہ نگاری ہے ۔جوش مشاہدہ کی باریکی اور اپنی لفاظی شعوریت تشبیہہ و استعارے کی خصوصیت سے منظر نگار تو بن

گئے مگر پیغمبر فطرت نہ بن سکے۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے آغاز ہی سے جوشؔ کی شاعری میں اس نئی تحریک کا اثر سمونے لگتا ہے۔یہاں سے جوش کی شاعری میں اشتراکیت اور مادیت کی خصوصیات شامل ہو جاتی ہیں اور ان کی اشتراکی شاعری اس دور کی مکمل نمائندہ بن جاتی ہے۔

جوش کے نظریات کا اقبال کے تخیل اور کلام سے مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جوش نے فکر و نشاط اور شعلہ و شبنم میں فطرت پرستی اور منظر نگاری کا مرقع پیش کیا ہے تو اقبال نے خضر راہ، ذوق و شوق، ساقی نامہ سے یہی کام لیا ہے۔اقبال کے تصورات خودی ان کے لیے عقیدہ کا حکم رکھتے ہیں۔جوش کے عقائد، تصورات، جذباتی عقائد میں تبدیل نہیں ہو پاتے۔اقبال کی دردمندی کے سامنے جوش کی دشنام طرازی، اتھلی دکھائی دیتی ہے۔جوش کی شاعری میں جمالیاتی مراتب کم ہیں۔ ان کی شاعری میں انقلابی نظریے کو جذبۂ بغاوت سے تحریک ملتی ہے۔

جوش کے کلام کی قدر و قیمت کا اظہار کرتے ہوئے مسعود صاحب اس مضمون میں لکھتے ہیں:

> "نفسیاتی تنقید میں قدر کا تصور لازمی طور پر آتا ہے۔جوش شاعری کی جمالیات کے مراتب میں زیادہ بلند مقام حاصل نہ کر سکی لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری کے بڑے حصے میں وزن و شعر کی منزل میں جراحت دل انسان کا پورا پورا احساس ملتا ہے۔" (۴۳)

اصغرؔ گونڈوی کا ایک نقاد۔ نیاز فتح پوری

اصغر حسن اصغرؔ گونڈوی کو تصوف سے بڑا تعلق تھا۔انھوں نے شاہ عبدالغنی صاحب منگلوری سے بیعت کی تھی۔اصغرؔ متقی اور پرہیزگار شخصیت کے مالک تھے۔وہ شاعری میں پہلے تسلیمؔ اور پھر وجدؔ بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔جن کے کلام میں تخیل کی

گہرائی، جوش و نشاط اور سرمستی ملتی ہے۔ تصوف کی جانب تمام عمر، ان اساتذہ کا رویہ معاندانہ رہا۔ مگر ان کے شاگرد رشید اصغر نے فلسفہ اور تصوف کے مضامین کو بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے پیش کیا۔ "نشاط روح" اور "سرود زندگی اصغر گونڈوی دو مجموعہ کلام ہوئے ہیں۔ نیاز فتح پوری اصغر کی غزلوں میں تین قسم کے اشعار کی نشاندہی کرتے ہیں

"ایک وہ جو واقعی تغزل کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ دوسری قسم ان اشعار کی ہے جن کا مفہوم تو کھینچ تان کر پیدا کیا جاسکتا ہے لیکن ان کا تغزل سے کوئی علاقہ نہیں اور تیسری قسم میں وہ اشعار داخل ہیں جو نہ غزل ہیں نہ نظم اور جن میں شاعر اپنے مقصود کو ظاہر کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔" (۴۴)

نیاز نے جن اشعار میں مختلف استعارات و تشبیہات کی اصلاح کی اور ان پر تنقید برائے تنقید کی ہے اس کے متعلق مسعود صاحب لکھتے ہیں:

"نیاز کو یہ معلوم نہیں کہ شاعری کی اپنی منطق ہوتی ہے جس کے لیے تشبیہ کا جگر چاک کرنا پڑتا ہے اور استعارے کے دل میں اترنا پڑتا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے علامہ اقبال کی مثنوی اسرار خودی کے بعض الفاظ و محاورات اور تشبیہات و استعارات پر اعتراض کئے تھے اقبال نے ان کے لفظی اعتراضات کو اکثر جگہ تسلیم کر لیا لیکن تشبیہات و استعارات کے بارے میں بڑے احترام سے معذرت چاہی اسلئے کے یہ شاعر اور اس کے تخیل کا معاملہ ہے۔" (۴۵)

اصغر کی شاعری اور تصوف کو مسعود صاحب نے اپنے فکری پس منظر میں وحدت الوجود کے ماورائی تصورات بتایا ہے۔ اصغر کی شاعری میں معنی کی تہہ داری کے عنصر کو سراہا ہے اور ان کی تمام شاعری کو عشق مجازی کا پرتو بتایا ہے۔ اس طرح یہ مقالہ ایک طرف نیاز فتح پوری کے نظریہ، تصوف شعر اور تخیل کو واضح کرتا ہے تو

دوسری طرف اصغر گونڈوی کی متصوفانہ شاعری اور عشق مجازی کی پر اسرار راہوں کو واضح کرتا ہے۔

فانی کی غزل کا صوتیاتی تجزیہ

حیدر آباد میں فانی سمینار کے موقع پر جنوری ۱۹۸۱ء میں مسعود حسین خاں نے ایک مضمون " دل فانی کی تباہی کو نہ پوچھ " پیش کیا تھا۔ جس میں فانی کی غزل کا اسلوبیاتی تجزیہ کیا تھا۔ اس سے قبل فانی کی غزل:

دیر میں یا حرم میں گزرے گی　　　عمر تیرے ہی غم میں گزرے گی

کا صوتیاتی تجزیہ کیا تھا جو مقالات مسعود میں شامل ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے فانی کی " یاس " کی شاعری کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے:

" فانی بنیادی طور پر یاس کے نہیں یاسیت کے شاعر ہیں۔" (۴۶)

فانی کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ فانی کے کلام میں نہ میر کی طرح چلبلا پن ہے اور نہ حسرت کی شاعری کی طرح وہ واردات عشق و عاشقی سے سرشاری ہے۔ فانی تخلیق کائنات اور تخلیق آدم کے المیہ کو اپنی ناکام، حیات سے مربوط کر کے پیش کرتے ہیں۔

اس مضمون میں مسعود صاحب نے فانی کے کلام کا صوتیاتی تجزیہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ فانی کی شاعری میں صفیری Fricative اور انفی مصمتے اور طویل مصوتے زیادہ استعمال ہوتے ہیں اردو کے طویل مصمتے، فانی کے احساس و الم کی چیخ بن کر کھلتے ہیں۔ ان کی اس غزل میں ۵۳ انفی آوازوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ آوازیں انفی مصوتوں کی شکل میں سوزناک بن جاتے ہیں اور دولبی بندشہ Stop کی وجہ سے انھیں صبر و ضبط کا کنارا مل جاتا ہے۔

" زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا " کا محاکمہ کرتے ہوئے اظہار کرتے ہیں کہ یہ ساری غزل وحدت سے معمور ہے۔ اس غزل میں فانی نے ذاتی الم کو کائناتی المیہ

میں ڈھال دیا ہے۔

"میرا شعری تجربہ"

مسعود صاحب کا تعلق قائم گنج (ضلع فرخ آباد) کے پٹھان خاندان سے ہے۔ ننھیال اور ددھیال دونوں خاندانوں میں صرف دو ہی سخن داں ہوئے یعنی مسعود صاحب کے چھوٹے ماموں غلام ربانی تاباںؔ ایڈوکیٹ جو مرنے تک مکتبہ جامعہ دہلی سے وابستہ رہے اور مسعود صاحب۔ ان دونوں نے شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ ددھیال میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں (چچا) شاعر تو نہیں لیکن سخن فہم اور اقبال و غالب کے اچھے ناقد گزرے ہیں۔ ان کی شخصیت برصغیر ہند و پاک کے اردو حلقے میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھیں شعری ذوق کیوں کر ملا۔ اس سلسلے میں مسعود صاحب نے ایک مقالہ میرا شعری تجربہ قلم بند کیا ہے جس میں انھوں نے اپنے شعری سفر کے آغاز اور شعری تحریک کی بنیاد میں شامل عناصر کا ذکر کیا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں جب مسعود صاحب نذیر نیازی کے ہم راہ کشمیر گئے تھے، اس وقت انھیں اقبال کی پوری بانگ درا ازبر تھی اور اسی دوران قیام کشمیر انھوں نے پہلا شعر کہا تھا:

نہیں نہیں، نہیں جاتے تم اس طرف کو مگر
قدم قدم پہ یہ لرزہ قدم کا کیسا ہے

اپنے اس اولین شعر کے متعلق انھوں نے وضاحت کی ہے کہ اس شعر کی بنیاد کوئی واردات نہیں تھی بلکہ روایت کے زور پر یہ شعر کہا تھا۔ اس کے بعد جب مسعود صاحب اپنے چچا محمود حسین کے ہمراہ ڈھاکہ بغرض حصول علم گئے (۱۹۳۳) وہاں بنگالی ماحول میں بھی انھوں نے دو غزلیں، چند متفرق اشعار اور ایک نظم لکھی ہے۔ اس طرح ڈھاکہ میں مسعود صاحب کی شعری تربیت ہوتی رہی جس کا اظہار انھوں نے خود کیا ہے:

"ڈھاکہ کے چار سال کا قیام ذوق شعری کی خاموش تربیت کا زمانہ رہا"[۱۷]

۱۹۴۱ء میں جب انھوں نے مسلم یونیورسٹی میں ام۔اے اردو میں داخلہ لیا اس وقت مسعود صاحب کی شاعری کا باقاعدہ آغاز گیتوں سے ہوتا ہے۔انھوں نے ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۴ء (۷) گیت لکھے۔

(۱)۔میں کیسے آنکھ اٹھاؤں ۴۲ء (۲)۔موج کا گیت ۴۲ء (۳)۔آج تو شاید وہ آجائے۔۴۳ء (۴)۔آج سہی انکار (۵)۔پریم کے ہاتھوں میں بک جاؤں ۴۴ء (۶)۔بھاگ گئیں جو میری خوشیاں ۴۴ء (۷)۔کیوں سج دھج کر آؤں ۴۴ء

یہ وہ گیت ہیں جب کہ ان کا دل شکست خوردہ تھا۔اس وقت انھوں نے ایک پرچھائیں سے محبت کی تھی۔ان گیتوں میں حساس اور زخمی دل کی کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔جس میں واردات عشق کا صحیح عکس ملتا ہے۔اس کا اعتراف انھوں نے خود بھی کیا ہے:

"میں نے ایک وقت میں ایک گوشت پوست کے پیکر اور ایک پرچھائیں سے محبت کی تھی۔یہ چھایا اور مایا کی کشمکش کا کھیل تھا ۔۔۔۔۔۔یہ گیت اس لیے پسند ہیں کہ یہ عشقیہ واردات کا صحیح عکس ہیں۔" (۴۸)

اس مقالہ میں مسعود صاحب نے اپنی شاعری کی روشنی میں شعری تنقید کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔شعر کے بارے میں انھوں نے اپنا تنقیدی نقطہ نظر کو (۱۶) اصولوں کے تحت پیش کیا ہے۔اس کے بعد انھوں نے اپنے شعری محرکات کا ذکر کرتے ہوئے اس کی وضاحت یوں کی ہے:

"بعض اوقات کسی جذبے یا صدمے کے باعث ایک خاص ذہنی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے اظہار کا سہارا لیتا ہوں۔" (۴۹)

ارقعات رشید

مسعود حسین خاں، رشید احمد صدیقی کے شاگرد ہیں۔ یہ کلمہ ان کے لیے اضافی بھی ہے اور توصیفی بھی۔ ۱۹۳۹ء میں رشید صاحب سے انھیں شرف شاگردی حاصل ہوا۔ وردو مسعود سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسعود صاحب اپنے اساتذہ میں رشید صاحب کے بعد پروفیسر آل احمد سرور سے بھی بہت متاثر ہیں۔ سرور صاحب کے قاموسی علم اور رشید صاحب کے وجدانی علم دونوں سے مسعود صاحب نے استفادہ کیا رشید صاحب کے متعلق ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ رشید صاحب ان کے لیے نہ صرف استاد ہی رہے بلکہ اچھے شفیق رہبر اور مربی بھی ثابت ہوئے۔

سرور صاحب، رشید صاحب سے بہت عرصے سے واقف تھے۔ علی گڑھ میں ان کی بیگم سے سرور صاحب کے گھر والے اور بچے بہت مانوس تھے۔ اس کا اظہار اس واقعہ سے ہوتا ہے:

> "رشید صاحب کے بچوں میں سلمیٰ میری بیوی سے بہت مانوس تھی اور اکثر آتی رہتی تھی۔ ان کی بیگم تو ہمارے گھر میں اس قدر مقبول تھیں کہ جب ایک دفعہ مہ جبین کو ٹائیفائڈ ہوا تو دوا صرف بیگم رشید کے ہاتھ سے پیتی تھیں۔" (۵۰)

اس قدر قربت کے باوجود جب رشید صاحب کی توسیع ملازمت کا معاملہ سامنے آیا تو انھیں یہ خیال ہوا کہ سرور صاحب کی وجہ سے انھیں ملازمت میں توسیع نہ مل سکی۔ اس اختلافی معاملہ کو سرور صاحب نے ایک دو بار رشید صاحب کے مکان جاکر سلجھانے کی کوشش کی لیکن رشید صاحب جیسی حساس شخصیت نے اس خاموشی کو شدت سے محسوس کیا اور کبھی معاف نہیں کیا۔

رشید صاحب اور مسعود حسین خاں کے درمیان جو محبت خلوص عقیدت اور اپنائیت رہی ہے اس کا اظہار رشید احمد صدیقی کے ان خطوط سے ہوتا ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً مسعود صاحب کو لکھے۔ ان تمام خطوط کو پروفیسر مسعود حسین خاں نے

ترتیب دے کر "مجموعہ رقعات رشید احمد صدیقی" کے نام سے شائع کروادیا ہے۔اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء میں شعبہ لسانیات علی گڑھ سے شائع ہوا۔دوسرا ایڈیشن خدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع ہوا (۱۹۸۷ء) یہی رقعات جرنل (۴۶) میں بھی کتابی شکل میں شامل کیے گئے ہیں۔(۳۱۳) صفحات پر مشتمل اس کتاب میں (۱۹۰) خطوط شامل ہیں ان میں بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں انھوں نے تلف کر دینے کی درخواست کی تھی۔خطوط سے قبل (۱۴) صفحات پر رشید صاحب کی شخصیت اور سیرت کا جائزہ لیا گیا ہے اور (۵) صفحات پر رشید احمد صدیقی کے بارے میں مختلف معلومات فراہم کی گئی ہیں۔یہ وہ خطوط ہیں جو علی گڑھ کی تاریخ و تہذیب، علمی سرگرمیوں اور نظریاتی یا ادبی پرخاشوں کا پردہ چاک کرتے ہیں۔خطوط کے حوالے سے رشید صاحب کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اس طرح اجاگر کیا ہے کہ اس سے ان کی نجی اور ادبی دونوں زندگی کے کئی روپ منظر عام پر آجاتے ہیں۔

یہ خطوط ۱۹۴۴ء سے شروع ہوتے ہیں اور ۱۹۷۳ء میں اختتام کو پہنچتے ہیں۔ان میں اکثر وہ رقعات ہیں جو رشید صاحب نے مسعود صاحب کو اس وقت لکھے جب کہ وہ "ہماری زبان" کے ایڈیٹر تھے۔ہماری زبان کی ادارت کے دو دور ہیں۔

۱۔ یکم اکتوبر ۱۹۶۹ء تا یکم مئی ۱۹۷۰ء

۲۔ ۸/ ستمبر ۱۹۷۲ء تا ۲۲/ اکتوبر ۱۹۷۲ء

۲۹/ سپتمبر ۱۹۴۴ء سے ۱۹/ اکتوبر کے عرصے میں (۷۹) رقعات ملتے ہیں جب کہ اکتوبر ۱۹۶۱ء تا ۱۹۷۳ء کے دوران لکھے ہوئے خطوط کی تعداد (۱۱۰) ہے۔ ۲۲/ جنوری ۱۹۶۳ء کے خط میں رشید صاحب نے لکھا ہے ان کے خطوط، نجی تحریریں یا فراموش شدہ مضامین کسی بھی طرح شائع نہ کیے جائیں۔۱۵/ اپریل ۱۹۷۰ء کا خط بھی اسی نوعیت کا ہے جس کے بارے میں انھوں نے لکھا تھا کہ یہ خط چھاپنے کے لیے نہیں چھپانے کے لیے ہے۔۲۲/ دسمبر ۱۹۷۳ء کے خط کو تلف کرنے کی استدعا کی تھی۔لیکن یہ تمام خطوط

ان رقعات میں شامل ہیں۔ ابتدائی خطوط میں سیرت و شخصیت اور مزاج کے ساتھ علمی و ادبی کاوشوں، علی گڑھ کا ماحول، مسلم یونیورسٹی کا حال، مسعود صاحب کے قیام حیدر آباد کے بارے میں معلومات ملتی ہیں جس میں نہ صرف مسعود صاحب کے بھی حالات ہیں بلکہ ذاکر حسین خاں کے بھی حالات اور مختلف علمی و ادبی شخصیتوں کے اشارے ملتے ہیں۔

۱۹۳۹ء میں مسعود حسین خاں نے شعبہ تاریخ، علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ انھوں نے بی۔اے میں اختیاری مضمون تاریخ لیا لیکن بہت جلد اس شعبہ کو خیر باد کہا اور شعبہ اردو سے وابستہ ہوئے اور رشید صاحب کے دائرہ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

رشید احمد صدیقی ۲۵/ ڈسمبر ۱۸۹۴ء (۵۱) کو قبضہ بیریا ضلع بلیا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم برہمنوں کے زیر سرپرستی ہوئی۔ ہندو اور مسلمان دونوں کٹر مذہب کے پابند تھے لیکن تعلقات برادرانہ تھے۔ مذہب ذاتی معاملہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس طرح ابتدائی تعلیم مقامی تربیت گاہوں میں ہوتی رہی۔ ۱۹۰۷ء میں بارہ (۱۲) برس سے باضابطہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ بعد جونپور کی عدالت میں کلرک کی حیثیت سے ماہانہ ۱۵، ۲۰، روپے پر کارگزار ہوئے۔ لیکن بہت جلد اس ماحول سے چھٹکارا حاصل کیا اور ۱۹۱۵ء میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں بی۔اے اور ۱۹۲۱ء میں ایم۔اے کیا۔ ۱۹۳۲ء میں انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ میں بحیثیت استاد تقرر عمل میں آیا۔ مستقل تقرر کے لیے کسی موضوع پر تحقیقی کام کی ضرورت تھی جس کے لیے اپنا تحقیقی کارنامہ "طنزیات و مضحکات" ترتیب دیا۔ ۱۹۳۶ء میں مستقل حیثیت سے مامور ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں ریڈر بنے۔ ۱۹۵۴ء میں پروفیسر کے عہدے پر ترقی ہوئی۔ ۱۹۵۸ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔

رشید صاحب نے اردو طنز و مزاح کو ایک شستہ ذہن اور شائستہ لہجہ عطا کیا۔

ان کا مزاج خالص ادبی نوعیت رکھتا ہے۔ان کی شخصیت اور سیرت کا مختصر اور جامع تعارف بقول مسعود صاحب کے اس طرح ہے:

" رشید صاحب آدمی بھی ہیں اور انسان بھی۔ مرنجان مرنج اور زود رنج، حساس اور زود حس۔ نظر کے کاٹنے پر اشخاص کو سبک و گراں کرنے والے۔ کسی نامعقول کو اپنی صحبت میں بار نہ دینے والے۔ ان کے مزاج کی بنیادی خصوصیت خواص پسندی ہے۔ اشخاص ہوں یا اشیا۔ان کے انتخاب کا ایک خاص معیار ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔"
(۵۲)

صاف گوئی اور عزیزوں، دوستوں کی ہمت افزائی رشید صاحب اپنا شعار سمجھتے تھے

" وہ اپنے شاگردوں اور دوستوں تک سے مرعوب ہوجاتے تھے۔"
(۵۳)

دوستوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی خوبیوں سے، شاگردوں میں آل احمد سرور اور ابواللیث صدیقی کی ذہانت و فطانت سے مرعوب تھے۔ رشید صاحب اور مسعود حسین خاں کی عمروں میں بڑا فرق تھا۔(۳۵) سال زائد عمر کا، یہ تفاوت ان کی دوستی میں حائل نہ ہوسکا۔ رقعات رشید سے واضح ہوتا ہے کہ یہ استاد و شاگرد کا رشتہ نہیں تھا بلکہ دو علمی و ادبی رفیقوں کی باہمی رفاقت اور باہمی اعتماد و خلوص کا رشتہ تھا۔

رشید صاحب خطوط بڑی پابندی سے لکھتے تھے اور دوستوں کے خطوط کے جواب غالب کی طرح بروقت دیتے تھے۔وہ دوستوں کے خطوط کا خود ہی جواب دیتے ادب کو واسطہ بنا کر۔بہت کم افراد سے انھوں نے دوستی کی ہے۔ان کے ادبی مراسم، آغا حیدر حسن، سید آل عبا، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، نیاز فتح

پوری ، ڈاکٹر عابد حسین اور سید سجاد حیدر یلدرم سے تھے ۔ ذاکر صاحب ، اصغر گونڈوی ، ڈاکٹر زور اور حسرت موہانی سے ذاتی تعلقات تھے ۔ "ہم نفسان رفتہ" اور دوسرے مضامین میں عقیدت و رفاقت کی جھلکیاں ملتی ہیں ۔ مسعود صاحب نے رقعات رشید کے پیش لفظ میں رشید صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے ۔ان کی کامیابی، کم سنی اور کم انگیزی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی جوہر شناس طبیعت کا بھی اظہار کیا۔ لکھتے ہیں:

" انسانوں ، عزیزوں اور رفیقوں کو آنکنے کی رشید صاحب کے پاس صرف ایک کسوٹی تھی اور وہ ان کے پسندیدہ لفظ نامعقول میں مضمر تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ غیر معمولی ، غیر تعقلی ، ذہانت اور بصیرت کے مالک تھے ۔ وہ بت شکن سے زیادہ خدا ساز تھے ۔ جن قدروں ، یا شخصیتوں کو عزیز رکھتے تھے ان کو ادبی تخلیق کا ہالہ عطا کر دیتے ۔ "

(۵۴)

رشید صاحب کے خطوط کے ذریعے ان کی سیرت ، شخصیت ، علمی و ادبی شخصتیوں کے بارے میں اظہار خیال ملتا ہے ۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء تک کے خطوط میں نجی حالات و کیفیات کا ذکر زیادہ ہے ۔ اس کے علاوہ مسلم یونیورسٹی کا حال ، عثمانیہ یونیورسٹی کا ذکر ، کبھی علی گڑھ کے موسم کا تو کبھی حیدرآباد کے موسم کا، تقریبوں ، مبارک بادیوں ، خیر و عافیت ، علمی اصطلاحات ، ادبی مباحث ، ادبی و نظریاتی پرخاش کے تذکرے سبھی ملتے ہیں۔

چند خطوط کے اقتباسات:

موسم ۔ میں ہر موسم میں مچھردانی استعمال کرنے کا عادی ہوں ۔ علی گڑھ کے بارہ ماسی مچھروں کا فیضان ہے ۔" (۵۵)

مسلم یونیورسٹی کے مختلف واقعات کئی ایک خطوط میں ملتے ہیں:

" نظامی صاحب کی پروفیسری کے بارے میں آپ کا غائبانہ لیکن نہایت صحیح جائزہ حیرت انگیز ہے۔ اگر وائس چانسلر نے حسب معمول علم دوستی، انصاف پسندی اور دلیری سے کام نہ لیا ہوتا تو یہ اسامی ڈوب چکی تھی۔" (۵۶)

قلی قطب شاہ

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ خود مختار سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ان پانچ سلطنتوں میں قطب شاہی (گولکنڈہ) اور عادل شاہی (بیجاپور) یہ سلطنتیں علم و ادب کی سرپرستی کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ان سلطنتوں میں اردو اصنافِ سخن کی سرپرستی شاہی درباروں میں زور و شور سے ہوتی رہی۔ گولکنڈہ کی سلطنت کا بانی سلطان قلی قطب شاہ تھا جس نے قطب شاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔اس خاندان کا چوتھا فرمانروا سلطان محمد قلی قطب شاہ گزرا ہے جو بڑا قادر الکلام شاعر تھا۔ مسعود صاحب نے اردو کے اس پہلے صاحب دیوان شاعر پر ایک مونوگراف لکھا ہے جس کی اشاعت ۱۹۸۹ء میں ساہتیہ اکیڈیمی کی جانب سے عمل میں آئی۔یہ مونوگراف قلی قطب شاہ پر لکھی جانے والی مختلف تصنیفات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ مسعود صاحب ماہر لسانیات و دکنیات بھی ہیں۔انھوں نے قدیم دکنی ادب کے متون کو مرتب بھی کیا ہے۔اپنی تخلیقی کاوشوں کے پیشِ نظر اس مختصر سے کتابچہ میں قلی قطب شاہ کے حالات کا اور اس کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے انتخابِ کلام پیش کیا ہے۔یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب۔ تاریخی پس منظر

دوسرا باب۔ محمد قلی، تخت نشینی اور حکمرانی

تیسرا باب۔ شخصیت اور سیرت

چوتھا باب۔ بھاگ متی اور بھاگ نگر۔ قطب اور مشتری

مواد کے مدنظر قطب شاہی سلطنت کی ابتدا اور قلی قطب شاہ کی تخت نشینی پر تفصیل سے معلومات فراہم کی ہیں۔ محمد قلی ۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ ابراہیم عادل شاہ ثانی والیٔ بیجاپور کا ہم عصر تھا۔ اس نے ۱۵۹۱ء میں شہر "حیدر نگر" کی تعمیر و تزئین کا آغاز کیا اور ۱۵۹۲ء میں چارمینار مکمل ہوا۔ اس باب میں قلی قطب شاہ کی تخت نشینی، شہر کی تعمیر، مختلف عمارتوں، بادشاہی لباس وغیرہ کا مختصر ذکر ملتا ہے۔

شخصیت اور مذہب

محمد قلی کی شخصیت کے بارے میں انھوں نے چند انکشافات کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> "محمد قلی، ابراہیم قطب شاہ کا تیسرا اور غالباً سب سے چہیتا بیٹا تھا جو ۱۵۶۵ء میں گولکنڈہ میں پیدا ہوا تھا۔ ماہ نامہ کے مصنف کے بقول اس کی ماں بھاگیرتی ایک ہندو عورت تھی۔ دیگر مورخین اس بارے میں خاموش ہیں۔" (۵۷)

اس بیان کی تصدیق اور حوالے کی خاطر مسعود صاحب نے داخلی شہادت پیش کی:

میں آپ دین چھوڑ کر پکڑ یا اس دین کا مارگ
نپائے اجھوں مو کو ہندوئے فرح

اس نپائے فرح کو "بھاگیرتی" بتایا ہے(۵۸)۔ جس کی گود سے پلنے بڑھنے کے بعد قلی قطب شاہ نے میر مومن اور دیگر عمائدین کے زیر اثر شیعیت کو قبول کیا تھا۔ محمد قلی کی تربیت اور تعلیم کے متعلق ڈاکٹر زور اور پروفیسر شیرانی کے نظریات پر تنقید کرتے ہوئے داخلی شہادتوں کی روشنی میں محمد قلی کو امی نہیں بلکہ ایک قابل شخصیت کا حامل بتایا ہے۔

مذہب اور علمی قابلیت کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے شخصیت کے بارے میں شیخ شریف احمد گجراتی کی مثنوی یوسف زلیخا اور اسد اللہ وجہی کی قطب

مشتری کے حوالے سے شخصیت کا خاکہ پیش کیا ہے۔ صرف ایک جملہ میں اس کی شخصیت کو اس طرح سمو دیا ہے:

"محمد قلی بنیادی طور پر شعر و شاہد و شراب کا آدمی تھا۔" (۵۹)

پروفیسر سیدہ جعفر اس کے خارجی ماحول کو اس کی شخصیت پر اثر انداز بتاتی ہیں۔ اور محمد قلی کی شاعری کے اہم عناصر کو اسطرح واضح کرتی ہیں۔

"محمد قلی طبعاً حسن پرست تھا اور رومان پسند تھا اور اسے ماحول بھی ایسا ملا تھا کہ جس نے اس میلان کو تقویت پہنچائی تھی۔ محمد قلی نے رنگ و روپ کے بارہ میں ایسے پیکر اپنے محل میں جمع کیے تھے جو حسن و شباب اور ناز و ادائیں بے مثل تھے۔ محمد قلی کی شاعری ان پری جمالوں کے حسن و غمزہ کی تصویر اور اس کے شوق بے پایاں کی تفسیر ہے۔"

(۶۰)

"محمد قلی کا مذہب" کے زیر عنوان مسعود صاحب نے محمد قلی کے اس کلام کا جائزہ لیا ہے جو عقیدت میں اس نے حضرت علیؓ اور اماموں کے بارے میں لکھا ہے۔ محمد قلی کے دور میں سیاسی مخالفتیں زیر ہو چکی تھیں۔ پر سکون ماحول تھا۔ اس کے دربار میں میر مومن استرآبادی اور مرزا احمد امین جیسے خاص مشیروں کا اثر تھا۔ علاوہ ازیں اس کے ذاتی حالات اور مشاغل ایسے تھے جس کی وجہ سے اس کا وسیع المشرب ہونا ضروری ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس بارے میں لکھتے ہیں:

"قطب شاہیوں کے سیکولر ہونے کا خاصا ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے۔ جہاں تک ابراہیم قطب شاہ کا تعلق ہے اس کے وسیع المشرب ہونے میں

شبہ کی گنجائش نہیں۔اس کی جوانی کے نشیب و فراز، وجیانگر میں سات سالہ قیام، بھاگیرتی کا حرم، ایسے حالات تھے کہ وہ مذہبی غلو سے بیگانہ رہا لیکن محمد قلی باوصف اس کے کہ اس کی ماں کو ہندو بتایا جاتا ہے اور ایک ہندو پاتر بھاگ متی کو اس کی معشوقہ قدیم وہ اپنے کلام میں سنیوں (خوارج) اور ہندوؤں دونوں پر برسا ہے۔

محمد دین قائم ہے ہندو بھاراں بھگاؤ تم
سیاہی کفر کی بھالو ، اجالا جگمگاؤ تم را ان

(سنی العقیدہ) خوراج کے بارے میں بعض مقامات پر شدت سے مخالفت کا نظریہ ملتا ہے:

خوارج نے رگن کے بانی سویو جھاگا
براہیم نمن مج کوں سکھ آرام دویگا

بعض اشعار میں اور بھی شدت کی چوٹ ملتی ہے:

عمرؓ عثمانؓ تھے دیں میں ہوا ہے سب خلل
ہمیں ہیں شیعہ کر کرتے خوارج دشمنی سب سوں
علی ابن ابی طالب اس کوں ، روہت ضربت (۶۲)

اس عقیدہ کی بحث کے بعد بھاگ متی کے متنازعہ مسئلے کو چھیڑا ہے اور اس روایت کے بارے میں لکھا ہے:

"میں بذات خود روایت کے تواتر اور کلیات کی داخلی شہادتوں کی بنا پر سمجھتا ہوں کہ اس کہانی میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے اور پروفیسر شروانی کا منفی طریق استدلال صحت سے بعید ہے۔" (۶۳)

اس کے بعد قطب مشتری کی روشنی میں بھاگ متی اور قطب شاہ کی رسم شادی اور ولادت حیات بخش بیگم کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

باب دوم "محمد قلی کی شاعری" کے عنوان سے ہے۔یہ باب بہت طویل ہے۔

(۴۹) صفحات پر کلیات قلی قطب شاہ کی بازیافت، قلی قطب شاہ کی نظم نگاری اور غزل گوئی کا جائزہ لیتے ہوئے لسانی حیثیت سے زبان اور قرأت کلام پر بحث کی ہے اور صرفی، نحوی و صوتی جائزہ لیا ہے۔ یہ جائزہ مسعود صاحب کی لسانیاتی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ اس سے پہلے بھی محققوں نے لسانیاتی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ کئی اعتبار سے ان اصحاب کا یہ جائزہ اتنا قابل اعتبار نہیں۔ مسعود صاحب نے نہایت اختصار سے کام لیا ہے لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں "مستند ہے ان کا فرمایا ہوا۔"

صوتی خصوصیات (۸) بتائی ہیں:

(۱)۔ طویل مصوتے (آ)۔ مختصر مصوتے (ا) میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ آدمی ادمی۔

(۲)۔ طویل اُو۔ مختصر ا میں تبدیل ہو جاتا ہے: بوند، بند۔ دوب، دَب

(۳)۔ طویل ای۔ مختصر ا میں تبدیل ہو جاتی ہے: تیسری، تسِری۔ پھول، پھَل

(۴)۔ بعض جگہ مختصر مصوتے طویل ہو جاتے ہیں: پتلی، پوتلی

(۵)۔ انفی مصمتے غیر انفی ہو جاتے ہیں: رہو، رو۔ نہیں، نئیں

(۶)۔ مشدد الفاظ کی کثرت: ہاتھی، ہتّھی

(۷)۔ غیر ضروری طور پر انفیت کا داخل کر دینا: برسات، برساتھی۔ پرچم، پرچھنم

(۸)۔ مصوتوں کو حد درجہ انفیانے کا رجحان: سورج، سرَج۔ مزا، مزا۔

صرفی اور نحوی خصوصیات اس طرح واضح کی ہیں۔ محمد قلی کے کلام کی قرأت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "محمد قلی کے کلام کے بعض حصص کی صحیح قرأت دکھنی اردو کے ماہروں کے لیے ابھی تک دردِ سر بنی ہوئے ہے۔ اس کے اشعار با وزن طریقے پر پڑھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر سیدہ جعفر دونوں مرتبین نے کلام کے ان حصوں کی جانب پوری توجہ نہیں دی ہے۔" (۶۴)

پروفیسر سیدہ جعفر کے مرتب کردہ کلیات کی فرہنگ کے بارے میں انھوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں تشریح لفظ یا لغات کا حوالہ درج نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر سیدہ جعفر نے فرہنگ کی ترتیب میں کبھی بھی سنجیدگی سے کام نہیں لیا۔ وہ الفاظ کی الفبائی ترتیب پر غور کرتے ہیں، نہ اس کی پیش کش میں فرہنگی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتی ہیں۔

باب سوم میں محمد قلی کا اسکے کلام کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور محمد قلی کی اولیت کو تسلیم کیا ہے لیکن اس کی شاعری کے فحشات کو خاطر شہوانیت بتایا ہے۔ منظر نگاری میں وہ آپ خود ہیرو ہے اور لکھتے ہیں کہ قلی قطب شاہ منظر نگار سے زیادہ پیکر نگار ہے۔

> "بلا تخصیص مذہب و ملت، ہندی شاعری کی روایت کے مطابق وہ بھنورا بن کر ان کا رس چوستا ہے۔ تیوہار آتے ہیں تو اس کے کلام میں نظیر اکبرآبادی کی طرح تیوہاروں کی چہل پہل سے زیادہ لاگ لگاؤ کی داستان ملتی ہے۔" (۶۵)

محمد قلی کی شاعری کو اردو شاعری کے دو اسالیب کی کشمکش کا آئینہ دار بتایا ہے اور محمد قلی کی غزلوں میں سے کسی ایک غزل کا بھی مقطع انھوں نے لائق انتخاب نہیں سمجھا۔ محمد قلی کے نہ صرف کلام بلکہ تشبیہات و استعارات میں بھی دورنگی ملتی ہے۔

آخر میں مسعود صاحب نے محمد قلی کی عظمت کے بارے میں لکھا ہے کہ محمد قلی کی تاریخی بازیافت تو ہو چکی ہے لیکن ادبی بازیافت کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ محمد قلی کی شاعری کی فنی خصوصیات یا اعجاز کو سمجھنے کے لئے کلیات کو مع اعراب وحواشی کے شائع کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے اور محمد قلی کی ہمہ جہتی شخصیت

اور شاعرانہ بے پناہی کی تائید میں خود اس کا شعر پیش کیا ہے:

نہ لکھ سکے گا کنے شرح منج کتاباں کا

ہمار علم ہے سب عالماں کا جوں اعجاز (۶۶)

آخر میں (۲۳) صفحات پر محمد قلی قطب شاہ کی منتخب نظمیں دی گئی ہیں۔ حاشیہ پر الفاظ کی فرہنگ اور تلفظ کو بھی اعراب سے واضح کیا گیا ہے۔

حمد، نعت، منقبت، شب برات، مرگ سال، تھنڈ کالا، ٹھنی عیش، فتنہ دکھن، نین ماتے، الک بکھرے، پرم کی کہانی۔ان نظموں کے علاوہ غزلیں اور ایک نامکمل قصیدہ انتخاب میں شامل ہے۔

یہ کتاب محققین دکنی ادب اور قلی قطب شاہ کے لیے نشان راہ ثابت ہو سکتی ہے۔ایک طرف تنقیدی پہلو ہے تو دوسری طرف تحقیق ہی نہیں بلکہ لسانی تحقیق کے اشارے بھی ملتے ہیں۔

ساہتیہ اکیڈیمی نے ہندوستانی ادب کے معمار کے سلسلے کے تحت شاعروں، ادیبوں کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں کو منظم طریقے سے اردو ادب میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔(اس پراجکٹ کی پہلی تصنیف، قلی قطب شاہ کا مونو گراف ہے جو ساہتیہ اکیڈیمی کی جانب سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی)

یوسف حسین خاں

یوسف حسین خاں مسعود صاحب کے حقیقی چچا تھے۔یہ اس خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس کا ہر فرد علم و ادب، شعر و سخن، علمی و سیاسی حیثیت سے اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔

یوسف حسین خاں نے اپنی خود نوشت "یادوں کی دنیا" لکھی تھی۔پروفیسر مسعود حسین خاں نے "ہندوستانی ادب کے معمار" کے سلسلے کے تحت یوسف حسین خاں پر مونوگراف لکھا ہے۔اس کی اشاعت ساہتیہ اکیڈیمی کی جانب سے ۱۹۹۰ء میں

عمل میں آئی ۔ ۷۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں چھ ابواب ہیں ۔

(۱) پہلا باب ۔ حیات (۲) دوسرا ۔ شخصیت و سیرت (۳) تیسرا اقبالیات
چوتھا ۔ غالبیات (۵) پانچواں ۔ متفرقات (۶) چھٹا ۔ انگریزی تصنیفات

پہلا باب حیات سے متعلق ہے جس میں انھوں نے اپنے خاندان کا مختصراً تعارف کروایا ہے ۔ اسی سلسلے میں جن افراد کا ذکر یہاں آیا ہے ان کے بارے میں کچھ معلومات یوسف حسین خاں کی خود نوشت "یادوں کی دنیا" اور وردو مسعود" میں مل جاتی ہیں ۔ ان کے خاندانی حالات کے بارے میں مزید ایسی باتیں سامنے آئی ہیں جن کا ذکر خود ڈاکٹر صاحب نے اپنی سوانح " وردو مسعود " میں بھی نہیں کیا ہے ۔ یوسف حسین خاں کے دادا یعنی ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے پردادا کے بارے میں یہ نہیں لکھا تھا کہ ان کا تعلق بھی حیدرآباد سے کسی نہ کسی طرح رہا ہے لیکن اس مونوگراف میں مسعود صاحب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ:

"یوسف حسین خاں کے دادا غلام حسین خاں (عرف جھمن خاں) بھی ریاست حیدرآباد کی ایک کن ٹن منٹ میں فوجی خدمات انجام دیتے تھے لیکن ریٹائرڈ ہونے کے بعد انھوں نے وطن کی سیدھ لی ۔" (۶۷)

اس کے بعد یوسف حسین خاں کی پیدائش ، ابتدائی تعلیم اور ان اشخاص کا تعارف ہے جن کا یوسف حسین خاں کی شخصیت پر اثر رہا ۔ ابتدائی تعلیم میں اٹاوہ ، علی گڑھ ، جامعہ ملیہ ، ان سب مادر جامعات کا ذکر ہے ۔

۱۹۲۶ء میں یوسف حسین خاں فرانس اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے گئے اور وہاں سے Doctorat d, Universite, کی ڈگری لے کر ہندوستان آئے اور ۱۹۳۰ء میں جامعہ عثمانیہ کے شعبہء تاریخ میں بحیثیت ریڈر تقرر ہوا ۔ بعد کو صدر شعبہ و پروفیسر ہوئے ۔ ۲۷ سال تک یونیورسٹی کی خدمات انجام دینے کے بعد وظیفہ پر سبک دوش ہوئے ۔ اس دور میں جامعہ عثمانیہ میں اعلیٰ پروفیسروں اور قابل ترین

اساتذہ کی کہکشاں تھی۔اس میں یوسف حسین خاں کا ایک خاص مقام تھا۔اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں پرووائس چانسلر کی حیثیت سے مامور رہے۔ پھر ۱۹۶۵ء میں شملہ انسٹیٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز کے فیلو ہوئے۔یہاں سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد ایک معمولی سے کرائے کے مکان میں جو مشترکہ تھا اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے۔ ۵/ فبروری تا ۲۱/ فبروری ۱۹۷۹ء موت و زیست کی کشمکش میں فیملی ہسپتال میں زیر علاج رہے اور آخرکار ۲۱/ فبروری ۱۹۷۹ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

دوسرا باب شخصیت و سیرت سے متعلق ہے۔یہ موضوع جس قدر آسان نظر آتا ہے اتنا ہی کٹھن ہوتا ہے خاص طور پر اس وقت جب کہ کسی ایسی ہستی پر لکھنا ہو جو محترم بھی ہو اور عزیز بھی۔ڈاکٹر مسعود حسین کا معروضی انداز فکر ان کی ہے شخیصت کا خاصہ ہے۔یہاں بھی اھوں نے شخصیت نگاری میں بے تکلف رہنے کی کوشش کی ہے

یوسف حسین خاں کی صاف گوئی حق پسندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے کہ:

"یوسف حسین خاں مصلحت کو سیاست سمجھتے تھے اور سیاسی پنیترا بازوں کے بارے میں ان کی رائے اچھی نہیں تھی۔" (۶۸)

یوسف حسین خاں کے مذہبی نظریات کو واضح کرتے ہوئے مسعود صاحب نے لکھا ہے کہ ان کی سیرت روحانیت اور مادیت کا ایک امتزاج تھی۔انھیں اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا۔اپنے ہندوستانی ہونے پر بھی مارکسی خیالات کے نقاد رہے۔ اقبال کے افکار کو حقیقت کلی کے ایک مذہبی تصور کی حیثیت سے دیکھتے تھے پروفیسر یوسف حسین نے ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی عکاسی "یادوں کی دنیا" میں کی تھی۔ اس حوالے میں مسعود صاحب لکھتے ہیں کہ اسلامی کردار سے مراد وہ دینی احساس، اسلامی شعار کا احترام اور قومیت کا جذبہ ہو جس کے ساتھ یونیورسٹی کے تمام

شعبوں میں مسلم طلبا کی اکثریت ہو، یونیورسٹی میں غیر مسلم ارکان ایسے منتخب کیے جائیں جو مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت سے واقف ہوں۔

تیسرا باب اقبالیات کا ہے۔اقبال شناسی مسعود صاحب اور یوسف حسین خاں دونوں میں ایک قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔اس باب میں مسعود صاحب کا قلم تیز رفتار، تیکھا اور پر زور ہے۔یوسف حسین خاں کو علامہ اقبالؔ کے فلسفہ سے گہرا لگاؤ تھا۔"روح اقبال" ان کا سب سے اہم ادبی کارنامہ ہے۔جس کی پہلی اشاعت ۱۹۴۲ء میں حیدر آباد سے عمل میں آئی تھی۔اس کے بعد اس کے کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔۱۹۷۶ء میں اقبال صدی پر جو اڈیشن شائع ہوا تھا، یہ یوسف حسین خاں کی زندگی میں مزید اضافہ و ترمیم کے ساتھ شائع ہوا تھا۔

اس کتاب میں یوسف حسین خان نے تین ابواب رکھے ہیں۔(۱) فن۔(۲) تمدن۔(۳) مذہب۔مسعود صاحب لکھتے ہیں:

> "میرے خیال میں روح اقبال کے متذکرہ بالا تین حصوں میں یوسف حسین تمدن والے حصے میں زیادہ گہری بصیرت کے ساتھ عہدہ برآمد ہوئے ہیں۔ایک پیشہ ور مورخ کی حیثیت سے وہ فلسفۂ تمدن کے مباحث سے بخوبی واقف ہیں۔"(۶۹)

یوسف حسین خاں "روح اقبال" میں تاریخی استقراء کے تحت جس گہرائی کو پیش کرتے ہیں اس کے متعلق مسعود صاحب کا خیال ہے کہ:

> "تاریخی استقرا انسانی علم کا نہایت اہم ماخذ ہے۔جس طرح اشیا کے خواص ہیں اس طرح اعمال کے خواص ہوتے ہیں۔قوموں کے اعمال سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان سے علم بصیرت کے علاوہ عبرت بھی حاصل ہوتی ہے۔قوموں کے عروج و زوال کے اسباب دریافت کرنا انسانی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔"(۷۰)

"روح اقبال" کے اس باب میں یوسف حسین خاں نے فلسفیانہ انداز میں

اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مسعود صاحب نے اس کو اور بھی واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اقبال نظام حکومت، نظامِ معیشت، تدبیر منزل کے تحت مذہب و اخلاق سے بے تعلق، ہمہ گیری اور وطنیت و تصور کے اصول کے ناقد ہیں اور اقبال کے اس نظریہ کے ناقد یوسف حسین خاں ہیں۔

اقبال کے فلسفہ اجتماعی کی تفسیر کے بارے میں مسعود صاحب لکھتے ہیں:

" میرے خیال میں اقبال کے فلسفۂ اجتماعی کی تفسیر اور اس کے فلسفۂ خودی سے اس کی ہم آہنگی اس سے بہتر اور کسی تصنیف میں نہیں ملتی۔" (۷۱)

آخر میں اپنے ادبی تنقید کے فریضہ کو انجام دیتے ہوئے مسعود صاحب لکھتے ہیں

:

" جہاں تک اقبال کے تصور فن اور تصور مذہب والے حصص کا تعلق ہے ان دونوں موضوعات پر یوسف حسین سے بہتر لکھا جا چکا ہے لیکن یہاں بھی ہمیں روح اقبال کی اولیت کو نہیں بھولنا چاہیے۔ (۷۲)

حافظ اور اقبال: یوسف حسین خاں کی اس تصنیف کے چھ (۶) ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا جس کے مقابل میں دوسرے ایڈیشن کا حجم تقریباً دونا ہو گیا ہے۔ ۱۹۷۶ء کے ایڈیشن میں یوسف حسین خاں نے اقبال کی فکر کے تشنہ پہلوؤں کو اس میں شامل کیا تھا جس پر ان کو بعد از مرگ (۱۹۷۹ء) میں ساہتیہ اکیڈیمی نے ۱۹۷۸ء کے ایوارڈ سے نوازا۔

اقبال اور غالب مسعود صاحب کے مطالعہ کے خاص موضوعات رہے ہیں۔ غالب پر، " غالب " اور آہنگ غالب " اور اقبال پر " اقبال کی نظری اور عملی شعریات " میں، اس کے علاوہ مختلف مضامین میں اس کا اظہار ہو چکا ہے۔ یوسف حسین خاں نے اقبال اور حافظ کے درمیان جن مشترک اقدار کو واضح کیا ہے، اس کے بارے میں

لکھتے ہیں:

"میرے خیال میں یوسف حسین اس طرح حافظ و اقبال کے درمیان عشق کا پل باندھ کر تنقیدی اعتبار سے کوئی با معنی اضافہ نہیں کرسکے۔ اقبال کے یہاں عشق ان کے منظم فلسفہ خودی کا ایک جزو ہے۔۔۔۔۔ اس کے برعکس حافظ کا عشق بقول ولیؔ اورنگ آبادی

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا (۷۳)

یوسف حسین خان نے اس کتاب کے پانچویں باب میں حافظ اور اقبال جیسے دو بلند پایہ عارف شعرا کے کلام کی فنی مماثلتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس بارے میں مسعود صاحب نے لکھا ہے کہ:

"حافظ و اقبال سے نہ صرف یوسف حسین خاں کی اقبال کے بارے میں ژرف نگاہی کا ثبوت ملتا ہے بلکہ اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ کے بارے میں اس گہرائی کے ساتھ اس سے قبل نہ اردو میں لکھا گیا ہے اور پروفیسر نذیر احمد کی شہادت کے مطابق نہ فارسی میں۔" (۷۴)

یوسف حسین خاں کی اس تصنیف پر مسعود صاحب نے ناقدانہ انداز فکر سے اظہار خیال کیا ہے۔

غالب اور آہنگ غالب ایک تفصیلی کتاب ہے۔ ۱۹۶۸ء میں غالب صدی کے موقع پر اس کی اشاعت عمل میں آئی تھی۔ یہ کتاب (۵) ابواب پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے تاریخ کی روشنی میں ادبی تنقید کا فرض نبھایا ہے۔ مسعود صاحب غالب پر اور آہنگ غالب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کئی لحاظ سے غالبیات میں ایک سنگ میل کی اہمیت رکھتی ہے۔" (۷۵)

اسی عنوان کے تحت غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات اور غالب کے کلام میں حرکی تصورات کا ان مقالات میں تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

اس قدر ادبی سرمایے کے باوجود یوسف حسین خاں کی ادبی خدمات سے بعض حضرات نے ذاتی رنجش کی بنا پر اغماز سے کام لیا اور انھیں ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ نہیں ملنے دیا۔ جب مالک رام صاحب ساہتیہ اکیڈیمی میں اردو کنونیر مقرر ہوئے تو انھوں نے پہلے ایوارڈ کے لیے یوسف حسین خاں کے نام کی سفارش کی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس ایوارڈ کو یوسف حسین خاں کے انتقال کے چند ہفتے بعد ان کی بیوہ نے وصول کیا۔

یوسف حسین خاں نے اگسٹ ۱۹۷۳ء میں دیوان غالب کا انگریزی ترجمہ کیا تھا یہ ترجمہ تفہیم عبارت کے پیش نظر کیا گیا تھا۔ یہ ترجمہ ابھی ہندوستان میں فروخت بھی نہیں ہوا تھا کہ بیرونی تاجر کتب نے اس کا سارا ذخیرہ حاصل کر لیا۔ اب یہ نایاب ہے۔ انگریزی ترجمہ کو مسعود صاحب نے منتخبہ اشعار کے ساتھ پیش کیا ہے اور مترجم کی فنی خصوصیات سے تعارف کروایا ہے۔ یہی نہیں اس کے بعد یوسف حسین خاں نے منتخب فارسی غزلوں کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کا کام آخری ایام زندگی میں مکمل کیا تھا

اس مونوگراف کا پانچواں باب متفرقات کے عنوان سے ہے۔ اس میں یوسف حسین خاں کی مختلف تصنیفات، تخلیقات و تالیفات کا جائزہ لیا ہے جن میں (۱) اردو غزل (۲) تاریخ دستور ہند۔ (۳) تاریخ دکن۔ (۴) فرانسیسی ادب۔ (۵) حسرت کی شاعری۔ (۶) کاروان فکر۔ (۷) یادوں کی دنیا۔ (۸) خطبات گارساں و تاسی (ترجمہ) شامل ہیں۔

ان میں اردو غزل "تاریخ دکن" اور "تاریخ دستور ہند" درسی کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ "یادوں کی دنیا" ایک ایسی تخلیقی خود نوشت ہے جس کی اردو حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ اب یہ نایاب ہو چکی ہے۔ یہ خود نوشت سوانح کے

ذخیرہ میں ایسا اضافہ ہے جو قائم گنج اور حیدر آباد کی تاریخ و تہذیب کا مرقع معلوم ہوتی ہے ۔ اس باب میں یادوں کی دنیا کا مسعود صاحب نے بصیرت افروز جائزہ لیا ہے ۔ تنقیدی جائزہ میں مکمل دیانت داری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک اچھے ناقد و ادیب ہونے کا ثبوت دیا ہے ۔ انھوں نے خاندانی مراسم اور رشتہ سے بھی گریز کرتے ہوئے حق گوئی کا دامن نہیں چھوڑا ہے ۔

" دلچسپ اور رنگین مرقعوں کے باوجود یوسف حسین خود نوشت لکھنے کے آداب سے کماحقہ عہدہ برآ نہیں ہوسکے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ ان میں وہ جرأت رندانہ نہیں کہ وہ اپنی زندگی مکمل طور پر بے نقاب کر سکیں ۔ دوسرے اکثر بھول جاتے ہیں کہ وہ خود نوشت لکھ رہے ہیں یا شخصیات اور واقعات پر مقالے مثلاً " فخر خاندان " کے عنوان سے انھوں نے چوتھے باب میں جو ۱۷ صفحے ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت اور کارہائے نمایاں پر صرف کیے ہیں اس سے خود نوشت کا توازن بگڑ گیا ۔" (۷۶)

اس تبصرہ کے بعد انھوں نے خود نوشت نگاری کے لیے چند اصول مرتب کیے ہیں جن کی روشنی میں " ورود مسعود " کا جائزہ لیں تو مسعود صاحب خود اس کے پابند نظر آتے ہیں:

" اچھا خود نوشت نگار نہ تو مورخ ہوتا ہے اور نہ ناقد و محقق ۔ وہ سب سے پہلے خود سے سچا ہوتا اور اپنے عصر کے ان چھوٹے ریزوں پر رنگوں کا عکاس ہوتا ہے جو اس کی شخصیت سے ہو کر گزرتے ہیں ۔" (۷۷)

اس باب کے آخر میں خطبات گارساں دتاسی (ترجمہ) کا سرسری تعارف کروایا ہے ۔ اس کتاب کے آخری حصہ میں انگریزی تصانیف کا تعارف دیا گیا ہے ۔ یہ وہ انگریزی تصنیفات ہیں جن کا اردو ترجمہ کیا جانا ضروری ہے ۔ ان میں قابل ذکر ہیں:

1. Selected Documents of the Deccan (1660 1671)

2. Selected Documents of Aligarh Archives.

یہ دو ماخذات ہیں جو دکن کی تاریخ اور علی گڑھ تحریک کی کڑیاں جوڑتے ہیں اور مورخین کے لیے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

============

اسلوبیات

جدید لسانی تحقیقات کی روشنی میں اسلوبیات ، وضاحتی لسانیات (Discrptive Linguastic) کی وہ شاخ ہے جو ادبی اظہار کی ماہیت ، عوامل اور خصوصیات سے بحث کرتی ہے۔ اسلوبیاتی تنقید کسی ادبی فنی پارے کی معروضی، لسانی اور سائنٹیفک تجزیہ پر مبنی ہوتی ہے۔

اسلوب کی اصطلاح اور تنقید کے بارے میں گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> "اسلوبیات کی اصطلاح تنقید میں زیادہ پرانی نہیں۔ اس صدی کی چھٹی دہائی سے اسلوبیات کا استعمال اس طریقہ کار کے لیے کیا جانے لگا جس کی رو سے رواجی تنقید کے موضوعی اور تاثراتی انداز کی بجائے ادبی فن پارے کے اسلوب کا تجزیہ معروضی ، لسانی اور سائنٹیفک بنیادوں پر کیا جاتا ہے۔" (۷۸)

یورپ میں انیسویں صدی کے شروع میں لسانیاتی نقطۂ نظر سے ادب پر تحقیقی کام شروع ہوا۔ ماہرین لسانیات (LInguastic Experts) نے ادب کو زبان و بیان کے اصولوں پر جانچ کر ان کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ اس کے بعد اسلوبیاتی تنقید یا اسلوبیات کی اہمیت بڑھتی گئی۔ یوروپ کے جن ماہرین لسانیات نے اسلوبیات کے اصولوں پر ادب کا مطالعہ کیا۔ ان میں قابل ذکر ہیں:

> "ٹامس اے سوبیک ، راجر فاؤلر ، اولیمن ہرالڈ ، وہائٹ ہال اور جیوفری ، ان ماہرین لسانیات نے ادب کا صوتی ، صرفی ، نحوی ، لغوی اور معانیاتی سطح پر تجزیہ پیش کیا ہے۔ ڈیل ہائمن نے خصوصی طور پر

اسلوبیاتی تنقید صوتی پہلو (Phonological aspect) کو اپنا
موضوع بنایا۔" (۷۹)

اردو میں اسلوبیاتی تنقید کو سب سے پہلے پروفیسر مسعود حسین خاں نے روشناس کرایا۔ علی رفاد فتحی لکھتے ہیں:

" اردو میں اسلوبیاتی تنقید کے بھرپور آغاز کا سہرا پروفیسر مسعود حسین خاں کے سر ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے اردو ادب کے مطالعہ میں اسلوبیاتی تنقید کے اصول کو اپنایا۔" (۸۰)

فرانس میں اپنے قیام کے دوران میں مسعود صاحب لسانی تنقید کے بارے میں غور و فکر کرتے تھے۔ چامسکی کے اسلوبیاتی مباحث سے ڈاکٹر صاحب کو اپنے نظریے تنقید بنانے میں مدد ملی۔ یہ بات اس وقت کی ہے جب کہ چامسکی کو دوسرے نقادوں نے قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ اس کا اعتراف مسعود صاحب اس طرح کرتے ہیں:

" ہارورڈ میں میں نے خود کو کسی پروفیسر یا لکچرروں کے سلسلے سے وابستہ نہیں کیا۔ لیکن اس کی شہرہ آفاق لائبریری سے استفادہ کرتے ہوئے فن شعر پر بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس زمانے میں میرے سر میں سودا سمایا ہوا تھا کہ زبان کے نازک ترین استعمال یعنی شاعرانہ استعمال کی کنہہ تک پہنچ سکوں ۔۔۔۔۔۔۔ جب ادبی نقادوں کی لفاظی سے گھبرا جاتا تو پھر لسانیات مین غوطہ زن ہوتا۔ قدما کے علم بیان و بلاغت کے بارے میں مشاہدات اور فرمودات کو لسانی علم کی کسوٹی پر پرکھنے کوشش کرتا۔ اس میں چامسکی کے نظریے سے بہت مدد ملی کیوں کہ اس نے علم لسانی کی آنکھیں باہر کی بجائے اندر کی جانب سے مرکوز کر دی تھیں۔" (۸۱)

اسلوبیاتی تنقید میں یا مطالعہ میں جن امتیازات کو مدنظر رکھا جاتا ہے ان میں

(۱) صوتیاتی آوازیں، معکوسیت، ہکاریت یا غنیت، (۲) لفظیاتی تراکیب، تناسب (۳) نحویاتی کلمے۔ (۴) بدیعی، عروضی امتیازات میں اوزان، بحروں، زحافات وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔

گوپی چند نارنگ بتاتے ہیں کہ اسلوبیات کی مدد سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کس عہد میں کونسا اسلوب رائج تھا؟ اکسی عہد کی زبان کے لسانیاتی امتیازات کیا تھے؟ ان امتیازات کی لسانی، سماجی اور تہذیبی تاویلات کیا ہو سکتی ہیں؟ ان کا جائزہ لینا بڑا مشکل ہے۔ اسی لیے اسلوبیاتی مطالعہ میں نتائج کے اخذ کرنے میں اس مرحلہ میں جن خطرات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان کے متعلق گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> "اسلوبیات میں نتائج اخذ کرتے ہوئے اس خطرے سے آگاہ رہنا ضروری ہے کہ اسلوبیاتی تجزیہ محض ہیئتی تجزیہ نہیں جس پر" نئی تنقید کا دارو مدار ہے۔ کیوں کہ اسلوبیات کی رو سے فن پارہ صرف لفظوں کا مجموعہ یا ہیئت محض Verbal Construct یا اطلاع محض یا معنی محض (Pure Semantic information) کی مثال ہے بلکہ اس کی نوعیت ان دونوں کی بیچ کی ہے۔" (۸۲)

جدید اسلوبیات کے بانی روح رواں چارلس بیلی (Charles Baily) اور رومن جیکسن (Roman Jakson) ہیں۔ جیکسن نے ۱۹۵۸ء میں انڈیانا یونیورسٹی میں ایک مقالہ Linguastic and Poetic کانفرنس میں پڑھا تھا۔ اس میں شعریت اور زبان کی طرف توجہ مبذول کروائی تھی:

> "شعریت کس طرح اپنا اظہار خیال کرتی ہے۔ دراصل کوئی لفظ بحیثیت ایک لفظ ادراک میں آتا ہے۔ لفظ کسی نام دیے گئے۔ معروض کے بدل کی حیثیت سے استعمال نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ جذبات مسوسہ کو برانگیختہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔" (۸۳)

جیکسن کے نظریے کی بنیاد پر اسلوبیات کا Structural نظریہ تشکیل پاتا ہے ۔ اسلوبیاتی تنقید میں لسانیاتی اصولوں اور جمالیاتی قدروں کی آمیزش کے ذریعہ کسی فن پارے کی لسانی اور جمالیاتی خصوصیات کا تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے ۔ چناں چہ ہوئیس نے اپنی کتاب نیچرل سائنس کے تناظر میں اسلوبیات کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک ماہر لسانیات تین اصولوں پر ساختیات کا مطالعہ کرتا ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) پیغام ۔ (۲) پیغام دینے والے کی معروضی زبان ۔ (۳) مابعد الزباں

" A linguest in confronted with three Data Groups, object, language of the the message or the sender, the code of the sender and the Meta Language or theory of Linguist. (۸۴)"

ادبی فن پارے میں اسلوبیاتی مطالعہ کے لیے ماہر لسانیات نے سب سے اہم چیز تخلیق اور اس کی کلیت کو قرار دیا ہے ۔ تخلیق ہی پیغام ہے جو الفاظ اور اصوات کو اَ نئے معنی سے روشناس کراتی ہے ۔

" الفاظ اور اصوات کے آپسی رشتے کی گہرائی کو تخلیق کی کلیت کو سامنے رکھ کر ہی پرکھا جاسکتا ہے ۔" (۸۵)

فن کار کی زبان پر تخلیقی زبان اس مطالعہ کا دوسرا عنصر ہے ۔ زبان کے ذریعہ ہی تخلیق کی اہمیت ہوتی ہے اور تخلیق کو اسلوبیات کے مطالعہ ہی سے پرکھ کر ایک خاص زاویہء نظر طے کیا جاتا ہے ۔ تخلیق کار اپنے فکر و تخیل سے جذبات و احساسات کو زبان کی شکل دیتا ہے جو قاری یا سامع کو اپنی جانب کھینچتا ہے اور قاری تخلیق کی دنیا میں گم ہوجاتا ہے ۔ تخلیق میں زبان کی ترکیب اور بندش کی اہمیت ہوتی ہے ۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کے بعد بعض لسانیات کے اساتذہ نے بھی اس طرف توجہ کی، ان میں پروفیسر گیان چند جین اور گوپی چند نارنگ کا نام سرفہرست آتا

ہے۔ مسعود صاحب کے شاگردوں میں پروفیسر مغنی تبسم اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے اس موضوع پر لسانی تنقید کی ہے۔ خلیل احمد بیگ ڈاکٹر صاحب کے عزیز شاگرد ہیں۔ انھوں نے اپنی تحقیق کا زیادہ تر حصہ لسانیات، صوتیات و اسلوبیات پر ہی صرف کیا ہے۔

اسلوبیاتی تنقید میں ناقد لسانیاتی موضوعی تاثر کو معروضی اوزار کی شکل میں، اسلوب شناسی کے اصول متعین کرتا ہے۔ لیکن اس کی اچھائی یا برائی سے اس کو سروکار نہیں۔ لسانی مطالعہ کے ذریعہ اسلوبیاتی نقاد فن شعر اور شاعر کی لسانی مہارت کے داخلی حسن و قبح کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اس تنقید کا دائرہ شاعر کی لسانی مہارت کے مطالعہ تک ہی محدود ہوتا ہے۔ اس مطالعہ سے ادب کو سائنسی زاویہء فکر ملتا ہے اور فن کار کے اصول یا اس کی ذات سے کہیں زیادہ فن پارے کی خصوصیات اور اہمیت کا تخمینہ کیا جاتا ہے۔ ادبی تنقید میں قدریں متعین کی جاتی ہیں لیکن لسانیاتی یا اسلوبیاتی تحقیق میں قدروں کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔

شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

> "اسلوبیات کا زیادہ تر تعلق زبان شناسی سے ہے۔ زبان شناسی (Linguistics) بہرحال ایک علم ہے فن نہیں جب کہ ادب ایک فن ہے۔ علم نہیں۔ علم کی بنیاد حقائق پر ہوتی ہے۔ فن کی بنیاد قدر پر۔" (۸۶)

عبدالستار ردلوی نے اسلوبیات کی چار منزلیں متعین کی ہیں۔

"(۱) صوتی عکاسی۔ (۲) صرفی و نحوی عکاسی۔ (۳) معنوی عکاسی۔ (۴) حشوی عکاسی"

گوپی چند نارنگ نے خالص لسانی تجربے کو صوتیات لفظیات، نحویات اور معنیات کی چار سطحوں میں دیکھا ہے۔ جو چامسکی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے نظریے کے مطابق ہے۔ اسلوبیاتی تجزیہ میں فن پارے کی خصوصیات کا تفصیلی جائزہ

اس طرح لیا جاتا ہے کہ فن کی خصوصیات واضح ہو جائے۔
منظر عباس نقوی اسلوب کی اصطلاح کو یوں واضح کرتے ہیں:

" بنیادی اسلوب سے عام طور پر سادہ اور صاف مراد ہے جو اردو زبان کی لسانی ساخت Lingual Structure سے قریب تر ہوں۔" (۸۷)

اس مختصر سے تعارف کے بعد اردو زبان کی لسانی ساخت اور اسلوب کی تشکیل کا جائزہ لیتے ہوئے پانچ اجزا کی نشاندہی کی ہے۔ وہ یہ ہیں۔ مصنف کا ماحول، موضوع، مقصد اور مخاطب۔ کیوں کہ موضوع کے اعتبار سے خیال کی ادائی ہوتی ہے ایک ہی طرح کا اسلوب بیان نہیں اپنایا جا سکتا۔ پروفیسر اشرف رفیع نے اسلوبیاتی مطالعہ کی ادبی و معنوی حیثیت اور اس کی شناخت کے وسیع تر امکانات پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

" اسلوبیات کے مطالعہ سے مصوتوں اور مصمتوں کے باہمی ربط کے علاوہ تشبیہات، علائم، استعارے اور تراکیب، لفظوں کے انتخاب اور جملوں کی ترتیب سے فن پارہ کی ادبی و معنوی حیثیت کا پتہ چلتا ہے اور اس کے تاثر کا اندازہ ہوتا ہے۔" (۸۸)

مسعود صاحب کے اس موضوع پر جو مضامین یا مقالات ملتے ہیں وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مطالعہ شعران کا پہلا مقالہ ہے جو اس موضوع پر لکھا گیا پہلی بار اردو کے صوتی نظام، مختلف آوازوں، آہنگ اور ان کی کیفیات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلوبیات میں شعر کا مطالعہ طویل مصوتوں اور مختصر مصوتوں کے ساتھ معنویت کو مد نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ مختصر مصوتوں (Short vowels) میں اِ اَ اُ اور طویل مصوتوں (Long vowels) میں آ، او، اے کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے اور تمام اصوات کو فن پارے کے زاویہ میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں واضح کیا ہے

کہ اردو کے صوتیاتی نظام میں عربی، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں کی آوازیں شامل ہیں لہذا مطالعہ شعر کے وقت مصمتوں کو مختلف خانوں میں رکھ کر تفصیلی جائزہ لینا پڑتا ہے۔

گوپی چند نارنگ نے اسلوبیات میں صوتیات، لفظیات اور نحویاتی سطحوں سے بحث کی ہے۔ وہ اسلوبیاتی تجزیہ کو نحوی بھی بتاتے ہیں لیکن مسعود صاحب نے مطالعہ شعر میں لسانیات کی پہلی سطح کو صوتیات سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے:

"ہر زبان کی بنیادی آوازوں کے باہمی آہنگ ہی سے شعر و نغمہ کے تار و پود تیار ہوتے ہیں۔" (۸۹)

صوتیاتی مطالعہ میں مسعود صاحب نے صوتی مخارج کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان کا خیال ہے شاعر شعر میں چاہے چھوٹی بحر ہو یا طویل حزن و یاس کی کامیاب ترجمانی اس وقت ہی کر سکتا ہے جب کہ حروف علت کثرت میں ہوں۔ چھوٹے بڑے دونوں مصوتوں کو حزن و یاس کا امین بتایا ہے۔ ڈاکٹر خلیل احمد بیگ، مسعود صاحب کے شاگرد رشید ہیں اور ماہر لسانیات و اسلوبیات بھی۔ مسعود صاحب کے اس نظریہ کی تائید انھوں نے بہ حیثیت شاگرد نہیں کی ہے بلکہ تائید کرتے ہوئے اس کا منطقی ربط تہذیبی روایات میں تلاش کر کے اس نظریہ کو اور بھی تقویت بخشی ہے کہتے ہیں:

"اگر شاعری جذبات و احساسات کے اظہار کا نام ہے تو ان آوازوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔۔۔۔۔۔ کسی زبان کی آواز کا اس زبان کی تہذیبی روایات سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ زبان کی ان ہی تہذیبی روایات کے مطابق آوازیں خود کو معنی و مفہوم سے آراستہ کرتی ہیں۔" (۹۰)

انھوں نے مطالعہ شعر کے پہلو کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے اقبال اور فیض کی نظم "تنہائی" کا صوتی نقطہ نظر سے بڑے دلچسپ انداز میں جائزہ لیا ہے اور لسانی پہلو سے اسلوب کی تعریف و توضیح کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"لسانیات میں اسلوب کا مطالعہ صرف تحریری زبان ہی تک محدود نہیں رہتا اور نہ ہی اس کا تعلق زبان کے کسی ایک پہلو سے ہوتا ہے بلکہ اس میں زبان کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ لسانیاتی مطالعہ اسلوب میں معنی سے زیادہ زبان کی ساخت اور ہیئت پر زور دیتا ہے۔" (۹۱)

صوتیاتی مطالعہ شعر کے وسیع تر امکانات کی طرف سب سے پہلے مسعود صاحب نے توجہ مبذول کروائی اور اردو تنقید کو ایک نیا نظریہ دیا لیکن اپنی اس کاوش کو "قدما کے مشاہدات کی جانب مراجعت" ہے کہہ کہ ایک دیانت دار عالم ادب کی حقیقت پسندی اور صداقت پسندی کا ثبوت دیا ہے مسعود صاحب نے تشکیلات کے ساتھ معنیات کے باہمی ربط پر زور دیا ہے جس سے اسلوب بنتا ہے مسعود صاحب کے اس نظریے میں بھرپور جامعیت ہے۔ اپنے اس متوازن نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے بڑے لطیف انداز میں آج کے بعض ناقدین کو ان کی کھوکھلی علمی بنیادوں کا احساس بھی دلایا ہے:

"صوت و معنی میں جو باہمی رشتہ ہوتا ہے اس کا بھی ذکر مغربی تنقید اور اس کی پیروی میں کبھی کبھی اردو تنقید میں بھی مل جاتا ہے لیکن یہ تمام تنقیدی کاوشیں کسی مربوط لسانیاتی نقطہ نظر کے تحت نہیں ملتیں ان کی نوعیت عام طور پر تاثراتی یا ذوقی ہوتی ہے اس لیے نا قدین کو اپنے مشاہدات کی علمی بنیاد کا علم نہیں۔" (۹۲)

○ ○ ○

ادبی تنقید

۱۔ رفیعہ سلطانہ ڈاکٹر۔ روزنامہ منصف۔ ۵/مارچ ۱۹۹۰ء
۲۔ مغنی تبسم، پروفیسر۔ اردو تنقید کو پروفیسر مسعود حسین خاں کی دین، مشمولہ۔ نذر مسعود۔ فکر ونظر۔ صفحہ نمبر ۱۷۴ء
۳۔ مسعود حسین خاں۔ اردو زبان وادب ص ۴۹
۴۔ مسعود حسین خاں۔ اردو زبان وادب ص ۶۸
۵۔ مسعود حسین خاں۔ اردو زبان وادب ص ۷۹
۶۔ مسعود حسین خاں۔ اردو زبان وادب ص ۱۱۲
۷۔ مسعود حسین خاں۔ اردو زبان وادب ص ۱۵۸
۸۔ مسعود حسین خاں۔ مقالات مسعود۔ ص ۱۰۵
۹۔ گوپی چند نارنگ۔ اسلوبیاتی تنقید۔ ص ۱۴۴۔۱۴۵
۱۰۔ گوپی چند نارنگ۔ اسلوبیاتی تنقید۔ ص ۱۵۲
۱۱۔ گیان چند جین۔ پرکھ اور پہچان۔ ص ۲۵
۱۲۔ مسعود حسین خاں۔ اقبال کی نظری اور عملی شعریات۔ صفحہ نمبر۔ ۲۶
۱۳۔ مسعود حسین خاں۔ اقبال کی نظری اور عملی شعریات۔ صفحہ نمبر۔ ۳۴
۱۴۔ مسعود حسین خاں۔ اقبال کی نظری اور عملی شعریات۔ صفحہ نمبر۔ ۳۶
۱۵۔ مسعود حسین خاں۔ اقبال کی نظری اور عملی شعریات۔ صفحہ نمبر۔ ۷
۱۶۔ مسعود حسین خاں۔ اقبال کی نظری اور عملی شعریات شعریات۔ صفحہ نمبر۔ ۸
۱۷۔ مسعود حسین خاں۔ "مطالعہ شعر" مشمولہ شعر وزبان۔ ص ۱۷
۱۸۔ مغنی تبسم، پروفیسر۔ "اردو کو مسعود حسین خاں کی دین" مشمولہ نذر مسعود۔ ص ۱۷۹
۱۹۔ پروفیسر مسعود حسین خاں۔ اقبال کی نظری اور عملی شعریات۔ ص ۶۶
۲۰۔ آل احمد سرور، پروفیسر۔ پیش لفظ اقبال کی نظری اور عملی شعریات ص ۹
۲۱۔ مسعود حسین خاں۔ اقبال کی نظری اور عملی شعریات۔ ص ۹۶
۲۲۔ مسعود حسین خاں۔ اقبال کی نظری اور عملی شعریات۔ ص ۳۸
۲۳۔ سلیم اختر۔ "مسعود حسین خاں بحیثیت نقاد" مشمولہ۔ نذر مسعود۔ ص ۱۶۹
۲۴۔ سلیم اختر۔ نذر مسعود۔ ص ۱۶۹
۲۵۔ سلیم اختر نذر مسعود۔ ص ۱۷۱
۲۶۔ مسعود حسین خاں۔ اردو زبان وادب۔ ص ۵۷

۲۷۔ مسعود حسین خاں۔اردوزبان وادب۔علی گڑھ۔ص ۷۳
۲۸۔ڈاکٹر وحید اختر۔غالب کی عظمت۔ادیب۔اپریل۔جون ۱۹۹۱ء۔ص ۱۴
۲۹۔ مسعود حسین خاں۔ مقالات مسعود۔ص ۱۲۴
۳۰۔ مسعود حسین خاں۔ مقالات مسعود۔ص ۱۲۹
۳۱۔ مسعود حسین خاں۔ غالب کے اردو کلام کا صوتی آہنگ۔ مشمولہ بین الاقوامی غالب سمینار۔ ۱۹۶۹ء ص ۲۷
۳۲۔ مسعود حسین خاں۔ غالب کے اردو کلام کا صوتی آہنگ۔ مشمولہ بین الاقوامی غالب سمینار۔ ۱۹۶۹ء ص ۲۷
۳۳۔ مسعود حسین خاں۔ "فانی کی ایک غزل کا صوتیاتی تجزیہ مشمولہ"۔ مقالات مسعود صفحہ نمبر ۱۵۳
۳۴۔گیان چند جین "پرکھ اور پہچان" صفحہ نمبر ۸
۳۵۔ مسعود حسین خاں۔شعر وزبان۔ص ۱۰
۳۶۔ مغنی تبسم، پروفیسر۔ نذر مسعود۔ص ۱۷۲
۳۷۔ مسعود حسین خاں۔ مقدمات شعر وزبان۔ص ۱۸
۳۸۔ مغنی تبسم، پروفیسر۔ نذر مسعود۔ فکر ونظر۔ص ۱۷۴
۳۹۔ مسعود حسین خاں۔ مقدمات۔شعر وزبان۔ص ۴۷
۴۰۔ مسعود حسین خاں شعر وزبان۔ص ۴۷
۴۱۔ مسعود حسین خاں۔اردوزبان وادب۔ص ۵۰
۴۲۔ مسعود حسین خاں۔ زبان وادب۔ص ۸۳
۴۳۔ مسعود حسین خاں۔ زبان وادب۔ص ۹۹
۴۴۔ مسعود حسین خاں۔ مقالات مسعود۔ص ۱۶۰
۴۵۔ مسعود حسین خاں۔ مقالات مسعود۔ص ۱۶۱
۴۶۔ مسعود حسین خاں۔ مقالات مسعود۔ص ۱۴۸
۴۷۔ مسعود حسین خاں۔ مقالات مسعود۔ص ۱۶۷
۴۸۔ مسعود حسین خاں۔ مقالات مسعود۔ص ۱۶۸
۴۹۔ مسعود حسین خاں۔ "میرا شعری تجربہ" مشمولہ مقالات مسعود۔ص ۱۷۴
۵۰۔آل احمد سرور، پروفیسر۔ خواب باقی ہیں۔ص ۱۱۲
۵۱۔ ۱۸۹۴ء تاریخ پیدائش کے بارے میں سلیمان اطہر جاوید نے رشید صاحب کی تحریر کردہ بتلایا ہے جسکی تفصیل انھوں نے اپنی تصنیف میں دی ہے۔ لیکن بعد ازاں عبدالطیف اعظمی

صاحب نے سلیمان اطہر صاحب کے حوالے سے مذکورہ تاریخ درج کر کے رشید صاحب کو بھیجا تھا اور انھوں نے ۲۴/ دسمبر ۱۸۹۴ء لکھا تھا جس پر رشید صاحب نے خاموشی اختیار کر لی تھی

۵۲۔ مسعود حسین خاں۔ تعارف۔ رشید احمد صدیقی۔ شخصیت اور فن۔ ص ۷

۵۳۔ محمد معین الدین دردائی۔ جلوہء ادارے فروغ اردو لکھنوء۔ ۱۹۵۸ء

۵۴۔ مسعود حسین خاں۔ خدا بخش جرنل ۴۶۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ ص ۱۱، ص ۱۲

۵۵۔ رشید احمد صدیقی۔ خط مشمولہ۔ رقعات رشید۔ مرتبہ مسعود حسین خاں ۱۵/اکتوبر ۱۹۶۴ء۔ ص ۸۵

۵۶۔ رشید احمد صدیقی۔ خط مشمولہ۔ رقعات رشید۔ مرتبہ مسعود حسین خاں ۱۵/اکتوبر ۱۹۶۴ء۔ ص ۲۰

۵۷۔ مسعود حسین خاں۔ قلی قطب شاہ ص ۱۲

۵۸۔ پیدا کرنے والی۔ قلی قطب شاہ۔ ص ۱۲

۵۹۔ مسعود حسین خاں۔ قلی قطب شاہ۔ ص ۱۵

۶۰۔ سیدہ جعفر پروفیسر۔ انتخاب قلی قطب شاہ۔ ص ۷

۶۱۔ مسعود حسین خاں۔ قلی قطب شاہ۔ ص ۱۸

۶۲۔ مسعود حسین خاں۔ قلی قطب شاہ۔ ص ۱۷

۶۳۔ مسعود حسین خاں۔ قلی قطب شاہ۔ ص ۱۹

۶۴۔ مسعود حسین خاں۔ " " ص ۷۳

۶۵۔ مسعود حسین خاں۔ " " ص ۷۷

۶۶۔ مسعود حسین۔ قلی قطب شاہ۔ ص ۸۳

۶۷۔ مسعود حسین خاں یوسف حسین خاں۔ ص ۱۱

۶۸۔ مسعود حسین خاں یوسف حسین خاں۔ ۱۶

۶۹۔ مسعود حسین خاں یوسف حسین خاں۔ ۳۰

۷۰۔ مسعود حسین خاں یوسف حسین خاں۔ ۲۱

۷۱۔ مسعود حسین خاں یوسف حسین خاں۔ ۲۳

۷۲۔ مسعود حسین خاں یوسف حسین خاں۔ ۲۵

۷۳۔ مسعود حسین خاں یوسف حسین خاں۔ ص ۲۸، ۲۹

۷۴۔ مسعود حسین خاں یوسف حسین خاں۔ ص ۳۰

۷۵۔ مسعود حسین خاں یوسف حسین خاں۔ ۳۷

۷۵۔ مسعود حسین خاں   یوسف حسین خاں ۔ ۳۷

۷۶۔ مسعود حسین خاں   یوسف حسین خاں ۔ ص ۶۶

۷۷۔ مسعود حسین خاں   یوسف حسین خاں ۔ ص ۶۶

۷۸۔ گوپی چند نارنگ   ادبی تنقید اور اسلوبیات ۔ ص ۳

۷۹۔ علی رفاد فتحی   اسلوبیاتی تنقید ۔ ص ۵۵

۸۰۔ علی رفاد فتحی   اسلوبیاتی تنقید ۔ ص ۵۴ ۵۵

۸۱۔ مسعود حسین خاں   ورود مسعود ۔ ص ۱۸۲

۸۲۔ گوپی چند نارنگ   ادبی تنقید اور اسلوبیات ۔ ص ۱۹

۸۳۔ ریاض صدیقی "جدید اسلوبیات" مشمولہ ۔ اسالیب نثر پر ایک نظر ۔ ص ۸۷

۸۴۔ ریاض صدیقی "جدید اسلوبیات" مشولہ ۔ مرتبہ ریاض الدین انصاری ۔ ص ۹۲

۸۵۔ علی رفاد فتحی   "اسلوبیاتی تنقید" ۔ ص ۷۷

۸۶ ۔ شمس الرحمن فاروقی ۔ "مطالعہ اسلوب کا ایک سبق" مشمولہ ۔ اردو ادب شمارہ ۲۵ ۔ ۱۹۷۲ء ص ۷

۸۷۔ عبدالستار دلوی ۔ اردو میں لسانیاتی تحقیق ۔ ص ۳۱۲

۸۸ ۔ ڈاکٹر اشرف رفیع ۔ "اسلوبیاتی تنقید" مشمولہ نصابی کتاب ادبی تنقید ۔ اوپن یونیورسٹی حیدرآباد ۔ ص ۳۷

۸۹۔ گوپی چند نارنگ ادبی تنقید اور اسلوبیات ص ۱۶

۹۰۔ مرزا خلیل احمد بیگ ۔ زبان اسلوب اور اسلوبیات ۔ ص ۴۸

۹۱۔ مرزا خلیل احمد بیگ ۔ زبان اسلوب اور اسلوبیات ۔ ص ۱۶۴

۹۲۔ مضمون مطالعہ شعر ۔ مشمولہ اردو زبان و ادب ۔ ص ۲۸

لسانیات

اردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں لسانی جائزہ لینے والے محققین کو ان کی تحریروں کی روشنی میں دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو زبان کے آغاز و ارتقا پر تاریخی نقطۂ نظر سے اردو کی جنم بھومی اور پیدائش کے عہد کا تعین کرتا ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جس نے جدید اصولوں کی روشنی میں غور و فکر اور تحقیقی نقطہ نظر سے اردو کے آغاز و ارتقا کے دھارے تلاش کیے ہیں۔ یہ گروہ لسانی محققین کا ہے۔ اس فہرست میں بہت کم نام ملتے ہیں۔

ہندوستانی محققین کے پہلے گروہ میں میرامن، انشاء اللہ خاں انشا، رنگین، محمد حسین آزاد اور سرسید وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

سرسید نے آثار الصنادید میں اظہار خیال کرتے ہوئے اردو تاریخ کو عہد خلجی میں دریافت کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شاہ جہاں کے عہد میں اردو زبان نے اپنی ایک شکل اختیار کر لی تھی۔ محمد حسین آزاد آب حیات میں عہد شاہ جہانی کو اردو تعمیر و تشکیل کا عہد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسے فقط شاہ جہاں کا اقبال سمجھنا چاہیے کہ یہ زبان خاص و عام میں اس عہد میں اردو کی طرف منسوب ہو گئی، ورنہ جو نثر و نظم کی مثالیں بیان ہوئیں ان سے خیال کو وسعت دے کہ کہہ سکتے ہیں کہ جس وقت مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہوگا اسی وقت سے ان کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر کرنا شروع کر دیا ہوگا۔" (۱)

عبدالغفور نساخ نے رسالہ "تحقیق زبان" میں بھی اس قسم کی رائے دی ہے ڈاکٹر گل کرائسٹ نے ۱۸۰۱ء میں لکھا تھا کہ تیمور نے ہندوستان پر جس وقت حملہ کیا تھا تب ہی سے اردو کی شکل بننی شروع ہو گئی تھی۔ گارساں دتاسی کے ایک بہی خواہ

ایڈورڈ پامیر نے انڈین میل (Indian Mail) میں ۲۳ / جنوری ۱۹۶۸ء میں ایک مضمون " السنہ ء مشرقیہ کا مطالعہ " کے عنوان سے لکھا تھا۔ اردو زبان کے آغاز کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کولبرک کے حوالے سے لکھا تھا:

" اردو زبان کا آغاز پندرھویں صدی عیسوی نویں صدی ہجری میں برج بھاشا کے تغیر سے ہوا اور اس نے ترقی پاکر ایک جدید زبان کی صورت اختیار کر لی۔" (۲)

دوسرا گروہ جدید لسانیاتی محققین کا ہے۔ ان محققین میں پروفسر حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، سید سلیمان ندوی، عبدالقادر سروری، پروفیسر احتشام حسین، چٹرجی جی، شوکت سبزواری، ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں شامل ہیں۔

عہد حاضر کے ماہرین لسانیات میں مسعود حسین خاں کا نام سرفہرست آتا ہے انھوں نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کا مطالعہ جدید اور سائنٹیفک طریقہ سے انجام دیا ہے۔ مسعود صاحب کی تحقیق کا موضوع اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا تھا۔ اس مقالہ کے رسمی نگراں پروفیسر آل احمد سرور تھے۔ ۱۹۴۵ء میں یہ مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے داخل کیا تھا۔ اس مقالہ پر انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی جس کے ممتحن سلیمان ندوی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور تھے۔ (۳) یہ مقالہ ۱۹۴۸ء میں " مقدمہ تاریخ زبان اردو " کے عنوان سے پہلی بار کتابی شکل میں شائع ہوا۔

اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۸ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی میں چھپا۔ یہ کتاب علمی اور ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ بہت ہی جلد اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا۔ ۱۹۵۸ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔ یہ کتاب اردو زبان و ادب کے محققین کے لیے حوالہ کی کتاب ثابت ہوئی اور برصغیر کی کئی جامعات کے نصاب میں اسے بھی شامل کیا گیا۔ طبع سوم میں نظرثانی کر کے نئے مواد کا مزید اضافہ کیا گیا۔

۱۹۶۶ء میں اردو مرکز لاہور سے اس کی ایک اور اشاعت عمل میں آئی ۔ ساتواں ایڈیشن ۱۹۸۷ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا۔ اس ایڈیشن کے تیسرے باب میں جدید تحقیق کی روشنی میں نئی معلومات کا اضافہ کیا گیا ۔ ترمیم و اضافہ سے اتنی تبدیلیاں ہوئیں کہ تیسرا باب پورا ہی از سر نو لکھا گیا۔

اس کے متعلق مسعود صاحب لکھتے ہیں:

"اب اس ساتویں اشاعت میں صرف پچھلے ۲۸ سال کی نئی معلومات کی روشنی میں اضافہ و ترمیمات کی گئی ہیں ۔ بلکہ اس کا تیسرا باب از سر نو لکھا گیا ہے ۔" (۴)

۱۹۹۰ء میں آٹھواں ایڈیشن شائع ہوا ۔ یہ ایڈیشن ساتویں اڈیشن کا طبع ثانی ہے ۱۹۷۸ء سے ۱۹۹۴ء یعنی ۴۲ سال کے عرصے میں اس کتاب کے دس ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں، جس سے اس کی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ مسعود صاحب خود رقم طراز ہیں:

" میری بے اطمینانی کی وجہ اس میں اردو کے ارتقا کے سلسلے میں ناواجب اختصار تھا ۔ ہر نئے ایڈیشن کے وقت اس کمی کو پورا کرنے کا ارادہ کرتا تھا اور اس سے باز رہ جاتا تھا ۔ یہ توفیق جا کر مجھے ۱۹۸۷ء میں ۲۸ سال بعد ہوئی ــــــــــــ مجھے علمی شہرت زیادہ تر اسی تصنیف سے ملی ہے ۔ یہ اب برصغیر، ہندو پاکستان میں ایم ۔ اے کے نصاب اور حوالے کی ایک مستند کتاب بن چکی ہے ۔" (۵)

گیان چند جین نے اس کو لسانیات کی نہیں بلکہ "تاریخی لسانیات" کی کتاب کہا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں:

" مقدمہ تاریخ زبان اردو ـــ تاریخی لسانیات کی کتاب ہے لیکن اس میں اردو کی بہت سے کتابوں اور مصنفین کے حوالے آئے ہیں

جن کا تعلق ادبی تحقیقات سے ہے۔" (۶)

تاریخی لسانیات، لسانیات کی اہم شاخ ہے جس میں ایک زبان یا بولی کا ایک یا ایک سے زیادہ ادوار کے دورانِ مطالعہ میں مماثلتیں، تضاد یا تبدیلیوں کا تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے یا پھر کسی دو یا دو سے زیادہ ہم خاندان زبانوں کے ارتقا کا دو الگ الگ علاقوں میں لسانیاتی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں تعنیہ دور میں ذخیرہ الفاظ میں ترک، واختیار، تلفظ و معنی کی تبدیلی، لب و لہجہ کے اختلاف کی لسانیاتی بنیادوں کا پتہ چلتا ہے۔

مقدمہ تاریخ "زبان اردو" کے تعلق سے پروفیسر گیان چند کا یہ خیال کہ یہ تاریخی لسانیات کی کتاب ہے، کسی حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔ دراصل یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کے مقالہ اردو زبان کا آغاز وارتقا پر مبنی ہے جس کے عنوان ہی سے پتہ چلتا ہے کہ اردو زبان اپنے ارتقائی مراحل کے مختلف ادوار میں کس طرح بدلتی رہی ہے۔ اس مطالعہ کے لیے تحقیقی مواد مختلف بولیوں، زبانوں اور خود اردو کے ابتدائی وارتقائی ادبی نقوش سے حاصل کیا ہے۔ مسعود صاحب نے مقدمہ کو تاریخی لسانیات کے تمام تر اصول و قواعد پر پیش نہیں کیا ہے بلکہ لسانی مطالعہ میں ادبی تحقیق کے اصولوں کو زیادہ استعمال کیا ہے اسی طرح مخصوص عہد کے ادب کو پرکھنے میں لسانیاتی نقطہ نظر سے کام لیا ہے:

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے جو ۲۶۳ صفحات پر مبنی ہے۔

پہلا باب ۔ ہند آریائی کا ارتقا۔ اس باب میں آریاؤں کے وطن اور داخلہ ہند، ہند آریائی کا عہد قدیم اوران کی زندگی، عہد وسطیٰ اور عہد جدید کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔

دوسرا باب ۔ ہندوستان کی جدید آریائی زبانیں ۔ اس عنوان کے تحت جدید آریائی زبانوں میں گروہ بندی، مغربی ہندی اور اس کی بولیوں کا تفصیل سے جائزہ لیا

ہے۔

تیسرا باب۔ اردو زبان کے ارتقا کا تفصیلی مطالعہ ۔۱۲۰۰ تا ۱۸۵۷ء کے درمیان شمالی ہند، دکن اور پھر شمالی ہند کے پس منظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔یہی باب مقالہ کی جان ہے۔ساتویں ایڈیشن میں جدید نظریہ ابھر آتا ہے۔

چوتھا باب۔ اردو کی ابتداء ہے اس میں لسانی نظریات، اردو اور برج بھاشا، اردو اور پنجابی کے بارے میں محققین کے نظریات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

پانچواں باب۔ "دہلی اور پیراِمنش" میں جدید نظریات کی روشنی میں اردو اور ہریانوی اردو اور کھڑی بولی کی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

مسعود صاحب نے آریاؤں کے داخلہ ہند کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ۱۵۰ قبل مسیح میں ہندوستان میں داخل ہوئے اور یہ داخلہ ہند سے قبل مشرقی میدان میں قیام کر چکے تھے۔جہاں ان کی بولی ہندیورپی تھی۔لکھتے ہیں:

> "ہندوستان کے زرخیز میدانوں میں آریاؤں کا داخلہ کسی منظم سیاسی تحریک کی شکل میں نہیں تھا۔یہ عمل کئی صدیوں تک جاری رہا اور اس میں جہاں گیری سے زیادہ جہاں پیمائی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ (۷)

مسعود صاحب نے آریاؤں کا وطن والگا کے دہانے کو بتایا ہے جہاں یہ گروہ کی شکل میں پھیل جاتے ہیں۔پہلا گروہ یورپ میں موجودہ آرمینین، یونانی، البنین، کٹیلک، جرمن، ہلوانک زبانوں کو جنم دیتا ہے اور دوسرا گروہ مزید دو شاخوں میں تقسیم ہو کر دریائے کابل کی وادی کے راستے ہندوستان میں داخل ہوتا ہے۔یہ کاکیشیا کے راستے سے ایشیائے کوچک اور مشرق کی طرف بڑھتا ہے۔وسطی ایشیا کا نظریہ اس لئے مسلمہ قرار دیا گیا ہے کہ ۱۹۰۶ء میں ایشیائے کوچک میں ۱۵۰۰ء ق۔م کے دریافت شدہ ریکارڈ میں بھی (اندرا۔ارونا میترا وغیرہ) دیوی دیوتاؤں کے نام ملتے ہیں۔یہ

راستہ درہ دانیال سے ہی سے عبور کیا جاسکتا ہے۔

آریوں کی ہند میں آمد اور وطن کے بارے میں مختلف نظریات ملتے ہیں۔ ڈاکٹر زور نے "ہندوستانی لسانیات" میں آریاؤں کے وطن اور داخلہ ہند کے بارے میں مختلف نظریات سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سب سے زیادہ قابل وثوق جگہ روس کا جنوب اور مغربی علاقہ ہے۔ وسط ایشیاء کے والثائی سیاحن پہاڑوں تک دریائی علاقہ ہے جوان آریاؤں کا وطن کہلایا جاسکتا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہندوستان میں آریاؤں کے دو گروہ آئے ایک پہلے آیا اور پہلا گروہ گنگ جمن میں قیام پذیر تھا۔ دوسرا گروہ ۔۔۔۔۔۔ پہلے گروہ کو شمال اور جنوب مغرب کی طرف ڈھکیل دیا۔ اس طرح اندرونی آریا بن گئے اور ہزیمیت خوردہ بیرونی آریا کہلائے۔" (۸)

ڈاکٹر زور نے آریاؤں کے داخلہ ہند اور وطن پر کئی ایک مفکرین کے نظریوں کے حوالوں کی روشنی میں بحث کی ہے۔ اور محققین و مورخین کے نظریات کی بنا پر یہ واضح کیا ہے کہ آریا وسط ایشیا یا یورپ کے کس حصہ سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔

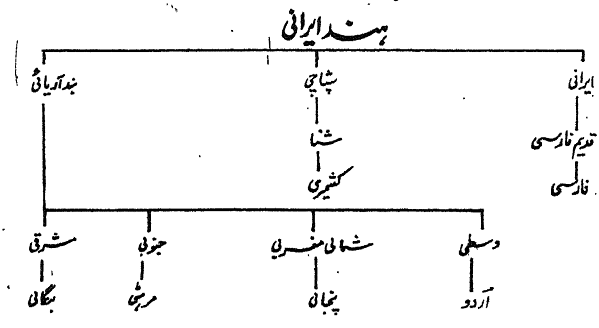
مسعود حسین خاں نے تاریخی، جغرافیائی مطالعہ کے ساتھ اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ لسانیات کے موضوع پر تحقیق کے لیے محققین کو تاریخی اور جغرافیائی حالات کا جاننا بھی ضروری ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے ابتدا میں ایم۔اے تاریخ میں داخلہ لیا تھا بعد میں شعبہ اردو میں منتقل ہوئے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں تاریخ سے دلچسپی رہی ہے۔ اس وجہ سے اپنی تحقیق میں انھوں نے تاریخ سے خوب مدد لی ہے

آریاؤں کے داخلہ، ہند اور وطن کے بارے میں مستند مورخین کا نظریہ یہ ہے

" Linguistic and archaelogical evidence trace their Russian steppe s and the origion to the southern land East of caspian Sea. The Indo - European migration started from that region."(۹)

آریاؤں کے مستقل قیام کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ان کے تہذیب و تمدن اور ادب کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں ۔آریا ہندوستان میں درہء خیبر اور بولان سے داخل ہوئے اور پنجاب کی سرحد پر ہڑپہ اور موہنجو دارو کے علاقوں میں قیام پذیر ہوئے ۔یہی ان کا عرصے تک مسکن رہا۔ سندھ سے سرسوتی ندی تک کا علاقہ بہت زرخیز تھا۔یہی زرخیزی ان کے دیرپا قیام کا سبب بنی ۔آہستہ آہستہ گنگا اور جمنا کے دوآبہ پر قابض ہوکر بنگال تک ان کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں ۔اس کے آثار کھدائیوں میں مل چکے ہیں ۔ان کی سلطنتیں جب قائم ہوئیں تو ان کے حکمران ویدی مذہب سے تعلق رکھتے تھے ۔ان کی سرپرستی میں ویدک بھاشا کا ارتقا عمل میں آیا۔

تاریخی اور نسلی ارتباط کے لحاظ سے ماہرین لسانیات نے دنیا کی السنہ کو (۸) بڑے خاندانوں میں تقسم کیا ہے ۔ان میں ہر گروہ مزید کئی ذیلی گروہ میں تقسیم ہوتا ہے۔ ہند یورپی خاندان جو ان میں سے ایک ہے اس کو (۸) ذیلی جماعتوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔ہند ایرانی اس کی ایک ذیلی شاخ ہے ۔ڈاکٹر زور نے ہندوستانی لسانیات میں ہند ایرانی کی گروہ بندی اس طرح کی ہے:



محمد حسین آزاد نے قدیم آریائی زبان کے بارے میں لکھا ہے:

" مقدم آریائی زبان نے مقامی بولیوں سے متاثر ہو کر ویدک بھاشا سنسکرت پراکرت اور اپ بھرنش کی ارتقائی منازل میں بٹ گئی۔ پنجابی، شورسنی کی اپج ہے۔" (۱۰)

ڈاکٹر زور نے گریرسن کی لسانی گروہ بندی کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے ہند یورپی اور ہند ایرانی کی گروہ بندی کو مزید تحقیق کی روشنی میں دکھایا ہے۔ مسعود حسین خاں نے کئی ایک ماہرین کے نظریوں کے پیش نظر جدید لسانی نظریہ پیش کیا ہے جو محمود شیرانی، ڈاکٹر زور، شوکت سبزواری ان سب کے نظریوں سے الگ نوعیت رکھتا ہے۔"

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ۱۹۳۰ء میں ہندوستانی لسانیات پر تحقیقی کام کیا۔ جو اس نوعیت کا ڈگری کے اعتبار سے پہلا کام تھا۔ انھوں نے اپنی لسانی تحقیق کے ذریعے اردو اور پنجابی زبان کے مابین بہن کا رشتہ بتایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو کا اصل سرچشمہ پنجابی یا کھڑی بولی نہیں بلکہ وہ قدیم زبان ہے جس سے خود پنجابی اور کھڑی بولی نکلی ہے اور جو اس وقت سارے شمالی اور مغربی سرحدی علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ پنجابی کے بارے میں کئی ایک ماہرین لسانیات نے اپنا اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سدھیشور ورما پنجابی زبان کی خصوصیت کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

"پنجابی میں ہند آریائی مرکب، حروف صحیح میں جو تھا وہ اب تک برقرار ہے اور جب یہ مخلوط زباں دہلی کے گرد و نواح کی زبان سے مخلوط ہو گئی تو یہاں بھی یہ ہندوی کے نام سے یاد کی گئی۔" (۱۱)

کیفی دتاتریہ نے پنجابی زبان کو شورسینی، اپ بھرنش سے متاثر بتایا ہے۔ ان کا نظریہ "پنجابی زبان پر شورسینی کا اثر" بتاتا ہے:

"شور سینی اور پراکرت کے آثار جس قدر پنجابی میں ملتے ہیں وہ آج
تک موجود ہیں اور کئی دوسری زبانوں میں یہ الفاظ نہیں پائے جاتے (۱۲)

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کا خیال ہے کہ مشرقی اور پنجابی دو جدا زبانیں ہیں وہ گریرسن کے لسانی نظریہ سے متفق ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تحقیق سے یہ واضح ہو گیا کہ یہ دونوں زبانیں علاحدہ ہیں۔ مغربی پنجابی پر پشلچی کا زیادہ اثر ہے جب کہ مشرقی پر شور سینی کا۔ مغربی پنجابی کو ٹکسالی یا معیاری پنجابی کی ایک شاخ سمجھا جاتا ہے

عبد القادر سروری نے بھی پنجابی پر شور سینی اپ بھرنش کا اثر بتایا ہے۔(۱۳) مسعود حسین خاں نے اپنی تحقیق سے واضح کر دیا ہے کہ پنجابی الگ زبان ہے اور اردو پر اس کا اثر نہیں۔

ڈاکٹر زور نے پنجابی کی پیدائش میں شور سینی کے اثر کو واضح کیا ہے۔ اردو کی ابتدا سے متعلق جو نظریات ملتے ہیں وہ اس طرح ہیں۔

گریرسن پہلا محقق ہے جس نے واضح کیا کہ ساخت اور قواعد کے اعتبار سے پنجابی اردو سے قریب ہے۔ رام بابو سکسینہ نے "تاریخ ادب اردو" میں اس طرح لکھا ہے:

"زبان اردو، ہندی بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں تک دہلی اور میرٹھ کے اطراف بولی جاتی تھی اور جس کا تعلق شور سینی پراکرت سے بلاواسطہ تھا۔ یہ بھاشا جس کو مغربی ہندی کہا جاتا ہے اردو کی اصل اور ماں سمجھی جا سکتی ہے۔" (۱۴)

اختر اورینوی نے "بہار میں اردو کے آغاز و ارتقاء" میں لکھا ہے:

"ہندوستانی کھڑی بولی معیاری اردو کا خاص تنا ہے۔ مگر کھڑی بولی کی اصل کا دو ٹوک تعین بہت مشکل ہے اور مشتبہ ہے۔ دوم یہ کہ

قدیم ترین "ریختہ" کی بھاشا سے بنی۔اب تک تحقیقات کے لحاظ سے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ معیاری اردو کے نام پر کھڑی بولی کے لسانی سانچے کے علاوہ چند اور بولیوں کے سانچوں کا بھی اثر ہے ۔ مثلاً پنجابی ، برج اور اودھی بعض اہم ریختاؤں کے وسطی دور میں ہریانی یا پنجابی اثر نمایاں ہے ۔" (۱۵)

یہ نظریہ ڈاکٹر زور کے نظریے کی تائید کرتا ہے:

" اردو نہ پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کی مشترکہ سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے ۔" (۱۶)

اردو کے پنجاب سے نکلنے کے نظریہ کا سب سے پہلے شیر علی سرخوش نے اپنے تذکرہ اعجاز سخن میں ذکر کیا تھا۔اسی کی بناپر محمود شیرانی نے اپنا نظریہ پیش کیا۔ نظریہ کوئی نیا نہیں تھا جس کا محمود شیرانی نے بھی پنجاب میں اردو کے مقدمہ میں اظہار کر دیا ہے۔

سید سلیمان ندوی نے اردو کی جائے پیدائش سندھ بتایا۔پنجاب میں اردو کی نشوونما ہوتی ہے اور وہ دکن میں پروان چڑھتی ہے ۔نقوش سلیمانی میں انھوں نے اس طرح خیال ظاہر کیا ہے:

" ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی ۔ نشوونما دکن میں پائی ۔ تعلیم و تربیت دہلی میں حاصل کی لیکن تہذیب اور سلیقہ یہیں لکھنو میں سیکھا۔" (۱۷)

اس نظریہ میں زیادہ استدلال نہیں پیش کیا جاسکتا ہے کیوں کہ محقق نے کچھ اس قسم کا نظریہ پیش کیا ہے کہ اردو کے آغاز و ارتقا کا سراغ لگانا ہو تو مختلف علاقوں کے زبان و ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے ۔

ڈاکٹر زور کا اردو کے بارے میں لسانی نظریہ، محمود شیرانی کے نظریہ سے قریب قریب ملتا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے مستشرقین اور اہل ہند کے کئی ایک ماہرین لسانیات کے نظریوں کی تردید کی ہے اور استدلال کے ساتھ سائنٹیفک بنیادوں پر اپنا جدید نظریہ پیش کیا ہے، انھوں نے اپنے لسانی جائزے میں مسلمانوں کی آمد کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوستان میں غوریوں کے عہد میں دہلی اور اس کے نواحی علاقوں میں مسلمان آباد ہوگئے تھے۔ان کے عربی اور فارسی الفاظ کا اختلاط ہوا۔چوں کہ مسلمان آگرہ، دہلی، سہارن پور اور میرٹھ میں پھیلنے لگے سہاں کی بولی کو کھڑی بولی میں تبدیل کیا۔ وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ فتح دہلی سے کئی سو سال قبل مسلمان سندھ اور پنجاب پر قابض ہوچکے تھے۔ لہٰذا اردو کی داستان کا آغاز سندھ سے ہی ہوجاتا ہے۔اپنی تحقیق میں بتایا ہے کہ مسلمانوں کی فتح دہلی سے قبل زبان کی جو کڑیاں ملتی ہیں، وہ نہ تو برج بھاشا تھی اور نہ کھڑی بولی بلکہ اس عہد کی قدیم اپ بھرنش روایات میں جکڑی ہوئی تھی جس پر راجستھانی کا گہرا اثر ملتا ہے۔

مسعود حسین خاں نے جو لسانی نظریہ پیش کیا ہے اس پر سبھی نے اتفاق کیا ہے۔ کسی بھی ماہر لسانیات نے تنقید نہیں کی ہے اور اس نظریہ کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے۔ پنجاب سے اردو کے نظریہ کے بارے میں مسعود صاحب نے تنقید کرتے ہوئے اردو کا مولد و منشا دہلی اور نواح دہلی کا علاقہ بتایا ہے۔اس نظریہ کو سب سے پہلے نجیب اشرف ندوی نے "معارف" بمبئی جولائی / اگست ۱۹۲۸ء میں تنقید پنجاب میں اردو کے عنوان سے دو قسط وار مضامین کے ذریعہ پیش کیا تھا۔ راقمہ کو معارف کا ایک ہی مضمون جولائی ۱۹۲۸ء کا دستیاب ہوا، مسلسل کوشش کے باوجود بھی اگست ۱۹۲۸ء کا رسالہ فراہم نہ ہوسکا۔ مسعود صاحب نے اپنے نظریہ کی بنیاد میں نجیب اشرف ہی کی بنائی ہوئی اکثر کڑیوں ہی سے مدد لی ہے لیکن کہیں بھی اس کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

اپنی تحقیق میں مسعود صاحب نے اردو کے آغاز کے اسلسلہ یوں رقم کیا ہے:

"اردو کا نقطہ آغاز ۱۱۹۳ء میں مسلمانوں کے داخلہ ہند دہلی ہے۔اس کا پہلا مستند شاعر امیر خسرو دہلوی ہے جس کا ہندی کلام غیر مستند سہی لیکن جس کا شاعر ہندوی ہونا مسلم ہے ـــــــ خسرو نے زبان دہلی کے ساتھ "پیرامنش" کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ پیرامنش (اطراف) جاٹوں اور گوجروں کی زبان پر مشتمل تھا جاٹوں سے منسوب کھڑی بولی اور ہریانوی ہیں۔" (۱۸)

مقدمہ تاریخ زبان اردو کے ساتویں ایڈیشن میں اردو کے ماخذ کے بارے میں انھوں نے تھوڑی سی نظریاتی ترمیم بھی کی ہے۔یہاں انھوں نے امیر خسرو کی "نہ سپر" میں دی ہوئی بارہ ہندوستانی زبانوں کی فہرست سے زبان دہلی "پیرامنش" دہلی اور اس کے نواح کی بولیوں کو ہی اردو کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔

اردو کے پنجابی نظریے کو مسعود حسین خاں نے اپنی تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا۔ مسعود حسین خاں نے اپنی تحقیق میں زیادہ تر اسی پر توجہ کی ہے کہ اردو کی ابتدا ہریانوی سے ہوتی ہے اور کھڑی بولی اس کا جدید ڈول تیار کرتی ہے۔اور معیاری لب و لہجہ برج بھاشا سے تیار ہوتا ہے:

"ہریانوی نے قدیم اردو کی تشکیل میں حصہ لیا۔کھڑی بولی نے جدید اردو کا ڈول تیار کیا۔برج بھاشا نے اردو کا معیاری لب و لہجہ متعین کرنے میں مدد دی ہے اور میواتی نے قدیم اردو پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔" (۱۹)

مرزا خلیل احمد بیگ اس نظریہ کو پیش کرتے ہوئے اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

"یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ پروفیسر مسعود حسین خاں کی اس لسانی تحقیق سے تقریباً (۱۵) سال پہلے ۱۹۳۰ء کے آس پاس ڈول بلاک

(۱۸۸۰ ۔ ۱۹۵۳ء) اپنی تحریروں میں اردو پر ہریانوی کے اثرات کی
نشاندہی کر چکے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے صرف ہریانوی کی
اہمیت پر زور دیا ہے اور نواح دہلی کے دیگر بولیوں کو وہ نظرانداز کر
گئے ۔۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد ڈاکٹر زور نے بھی اردو ہریانی کے
اثرات کا ذکر کیا ہے ۔" (۲۰)

حقیقت یہ ہے کہ ہریانی کے اثرات کا ذکر سب سے پہلے نہ ژول بلاک نے کیا اور نہ ہی ڈاکٹر زور نے بلکہ اس سے دو سال قبل نجیب اشرف ندوی نے تنقید پنجاب میں اردو کے عنوان سے معارف جولائی ۱۹۲۸ء میں واضح کیا تھا:

"پنجابی زبان کی جو قدیم تصانیف بھی موجود ہیں وہ عہد مغلیہ سے
پہلے کی نہیں ہیں اور ان میں بھی بہت زیادہ عہد عالم گیر کے بعد کی
ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ دلی کی ہریانی زبان پنجابی سے متاثر نہیں ہوتی
اس لیے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا بلکہ یہ تو بدیہی بات ہے کہ
دہلی کی زبان ایک طرف اودھی یا بھوج پوری زبان سے متاثر ہوتی
ہے بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھائے اور چوں کہ شمال مغربی اور
ایک بڑی حد تک مرہٹہ علاقہ کی زبانیں سرسوتی ہی سے نکلتی ہیں ۔" (۲۱)

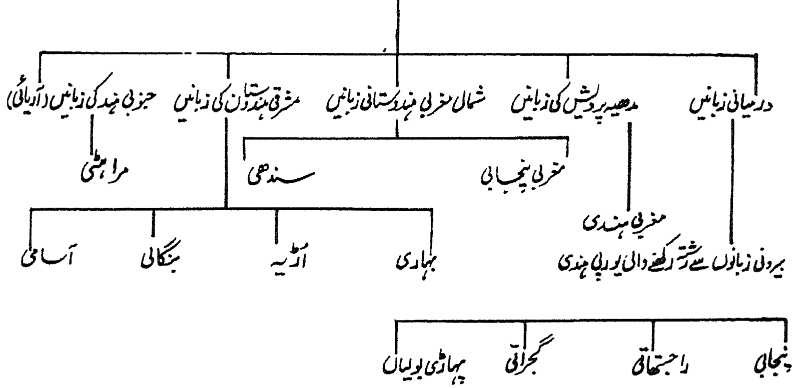
مسعود صاحب نے مقدمہ تاریخ زبان اردو کے پہلے باب میں آریوں کے داخلہ ہند اور اس کے مختلف ادوار اور علاقوں میں قیام پذیری اور ان کی بولیوں کا ۳۵ صفحات پر جائزہ لیا ہے ۔ اس دور کا احاطہ ۱۰۰۰ تا ۶۰۰ قبل مسیح تک کیا گیا ہے ۔ آخر میں یہ واضح کیا ہے:

"اشوک کا عہد اردھ ماگدھی پراکرت کے عروج کا زمانہ تھا جس نے
مغربی ہندوستان کی تمام پراکرتوں کو متاثر کیا ۔ ہرش وردھن اور

راجپوتوں کی فتوحات کے ذریعے دوآبہ کی زبان سر اٹھاتی ہے اور پہلے شورسینی اپ بھرنش اور بعد کو برج بھاشا کی شکل میں سارے شمالی ہندوستانی کی مانی ہوئی ادبی زبان بن جاتی ہے۔"

دوسرے باب میں "ہندوستان کی جدید آریائی زبانیں" کے عنوان سے جدید آریائی زبانوں کی گروہ بندی کی گئی ہے۔اس باب میں گریرسن کی لسانی گروہ بندی کے نظریہ پر تنقیدی جائزہ شامل ہے گریرسن کے لسانی دلائل پر تنقید کرتے ہوئے ہندوستان کی جدید زبانوں کی گروہ بندی اس طرح کی ہے جس کو اس خاکے کے ذریعہ واضح کر سکتے ہیں۔

ہندوستان کی جدید زبانوں کی گروہ بندی



جنوبی ہندوستان کی آریائی زبان کے متعلق لکھتے ہیں کہ مرہٹی ادبی سرمایہ کے لحاظ سے خاص زبان ہے جو ہندوستان کی ممتاز ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔اس کا رسم الخط دیوناگری ہے۔ نواح دہلی کی بولیوں اور قدیم دور کے تحریری مواد کے لسانیاتی تجزیہ کے بارے میں مسعود حسین خاں نے جس نظریہ کی تشکیل کی اس کی تمام محققین تائید کرتے ہیں۔ڈاکٹر خلیل بیگ لکھتے ہیں:

"پروفیسر مسعود حسین خاں نے جس بنیادی نظریہ کی تشکیل کی ہے
وہ یہ ہے کہ نواح دہلی کی بولیاں اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہیں اور
حضرت دہلی اس کا صحیح مولود و منشا۔ لیکن اردو کی ابتدا اس وقت تک
ممکن نہ ہو سکی جب تک شہاب الدین محمد غوری وفات (۱۲۰۶ء) نے
۱۱۹۱ء" میں دہلی فتح کر کے اسے اپنا پایہ تخت نہیں بنا دیا۔" (۲۳)

ڈاکٹر زور نے اپنے تحقیقی مقالہ میں اردو پر ہریانی کے اثرات کی نشاندہی کی تھی۔ مگر مسعود حسین خاں کی تحقیق پر ڈاکٹر زور نے ۱۹۶۲ء میں اردو کی ابتدا کے عنوان سے ایک مضمون میں بحث کرتے ہوئے تنقید کرتے ہیں۔ پروفیسر گیان چند نے ڈاکٹر زور کے اس خیال سے بجا طور پر اتفاق نہیں کیا ہے:

"ہریانی زبان کی پیدائش اردو کی پیدائش کے بعد عمل میں آئی اور
اگر قدیم دکنی اردو کی بعض خصوصیات ہریانی زبان میں ملتی جلتی
ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اردو ہریانی سے بنی بلکہ اس کا اصل
سبب یہ ہے کہ اردو ہریانی دونوں کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔" (۲۴)

شوکت سبزواری نے اردو کے ماخذ کو مغربی ہندی کی درمیانی کڑی سے نکال کر اپ بھرنش کو بتایا ہے جو مغربی ہندی اور پراکرت کے درمیان کی کڑی ہے۔

سہیل بخاری نے اپنے نظریے میں اردو کے آغاز کو کھڑی بولی سے مربوط کیا ہے۔ انھوں نے نقوش مئی ۱۹۶۵ء میں "اردو کا قدیم ترین ادب" کے عنوان سے ایک مضمون پیش کیا جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا تو انھوں نے اپنے نظریے کو بالکل بدل ڈالا اور اردو کے آغاز کے سلسلے میں اڑیسہ سے رشتہ جوڑا ہے۔ اسی نظریے کو محققین نے اپنی تحقیق کا موضوع نہیں بنایا۔ ابھی تک لیجاد بندہ سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے ہیں۔

تیسرا باب۔ اردو کے ارتقا سے متعلق ہے۔ یہ باب شمالی ہند میں اردو کی ابتدا

کے بارے میں ہے۔ شمال میں ایک تاریخی تبدیلی کے بعد اردو دکن کی طرف رخ کرتی ہے۔اسی کے ساتھ ترویج ہوتی ہے۔ ۱۳۰۰ء تا ۱۷۰۰ء دکن میں اردو کا ارتقا بڑی تیزی سے ہوتا ہے۔ شمالی ہند میں اردو کو دوبارہ ۱۷۰۰ء کے بعد بازیابی حاصل ہوتی ہے۔ تقریباً ۵۰ صفحات پر اس باب میں اردو کے مختلف ارتقائی منازل کا جائزہ لیا ہے۔ ساتویں ایڈیشن میں اس باب میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ کیا گیا ہے۔

۸۰۰ء کے بعد ادبی نمونوں میں اور قدیم دوہوں میں اردو الفاظ کی تلاش کی ہے۔ جیسے:

"بدھ سدھوں اور ناتھ پنتھوں کے دوہوں میں اردو کے ماضی کی اشکال ملتی ہیں۔
پوچھیا، ماریا، بوجھیا، جو، تاب حباب۔" (۲۵)

۱۱۷۲ء تا ۱۲۸۸ء کی اہم تصنیف ہیم چند شبدانوشاسن میں یہ دوہا ہے:

بھلا ہوا جو ماریا بہنی مہارا کنت
لجے جم تو داسیا ہو ، جب بھیگا ، گھر وانت (۲۶)

لکھتے ہیں کہ اس دوہے کا پورا کینڈا قدیم کھڑی بولی اور قواعد کی شکل میں ملتا ہے۔ اردو کے آغاز یا پیدائش کو مسلمانوں سے مربوط کرنا اب غلط ثابت ہو گیا ہے۔ اردو کے پیدائشی مقام کو مسلمانوں کی آمد یا ان کے مسکن سے مربوط کرنے کے نظریے کے بارے میں مولوی عبدالحق نے ایک صدارتی خطبہ میں کہا تھا:

"ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ یہ بدیسی زبان ہے یا مسلمانوں کی زبان ہے یہ سراسر غلط اور لغو ہے اور جان بوجھ کر آنکھوں میں خاک ڈالنی ہے۔ مسلمان اسے کہاں سے لائے تھے۔ یہ خاص ہندوستان کی پیداوار اور دونوں قوموں یعنی ہندو مسلمانوں کے لسانی ، تہذیبی اور معاشرتی اتحاد کا نتیجہ ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بنانے

والے زیادہ تر ہندو ہیں۔" (۲۷)

اس حوالے کی تصدیق شمالی ہند میں ہندوؤں کے ہاں ملنے والے اردو زبان کے کینڈے سے ہوتی ہی۔

پرتھوی راج اور اس کی بہن پرتھا بائی سے منسوب "دان پتر" کی زبان میں کھڑی بولی کا زیادہ عنصر ملتا ہے۔

مسلمان بحیثیت فاتح سندھ میں ۷۱۲ سے داخل ہوئے لیکن شمال میں ان کا داخلہ صحیح طور سے ۱۰۰۰ء میں محمود غزنوی کے حملے کے بعد سے سروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل مسلمان جنوب میں ساحل مالابار اور جزائر انڈومان مالدیپ میں بس چکے تھے اور یہ عربی النسل تھے۔ اردو کے جنوب یا شمال میں سندھ کے نظریہ کو تقویت اس لیے نہیں دی جاتی کیوں کہ ہندوستان میں سندھ اور جنوب میں آنے والے مسلمانوں کی زبان عربی اور فارسی تھی۔ فاتح حکمرانوں کو نئی زبان کی ایجاد سے زیادہ اپنی زبان مسلط کرنا آسان تھا اس کا ثبوت مسعود سلمان کی تصنیف سے بھی ملتا ہے جو فارسی اور ترکی زبان میں ہے۔ مسعود سلمان کا عہد ۱۱۲۵ء تا ۱۱۳۰ء کے درمیان کا ہے جب کہ ہندوستان پر عربوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور لاہور کو مرکزی حیثیت حاصل ہو چکی تھی:

> "یہ خیال درست نہیں کہ اردو کی پیدائش کے اصل ذمہ دار مسلمان ہیں۔ اردو کی ابتدا یا اس کے آغاز کو جو ایک لسانی مظہر ہے مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے منسوب کرنا گمراہ کن نظریہ ہے ــــــــ اردو کا ابھار مسلمانوں کی دہلی میں آمد سے تقریباً دو سو سال قبل ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ شروع ہو چکا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ۱۱۹۳ء کے بعد اس کی ترقی کی رفتار تیز ہو گئی۔" (۲۸)

اکٹر شوکت سبزواری نے اردو زبان کے آغاز کے چار ادوار بتائے ہیں۔ لیکن تفصیلی ئزہ صرف چوتھے ہی دور کا دیا ہے اور لکھتے ہیں:

"اردو کے چار ارتقائی ادوار ہیں۔ پہلا دور قدیم ہے۔ ۶۰۰ ق۔م پر ختم ہوا۔ دوسرا ۵۰۰ ق۔م پر تیسرا ۱۰۰ ق۔م اور چوتھے دور کا آغاز میرے خیال میں ۱۲۰۰ء کے لگ بھگ ہوا اور ۱۸۰۰ء پر اختتام کو پہنچا۔ درمیان کے دو سو سال ۱۰۰۰ء تا ۱۲۰۰ء اردو کے عبوری یا تعمیری زمانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (۲۹)

تقریباً تمام ماہرین لسانیات اس سے متفق ہیں کہ پراکرتوں کا دور ۶۰۰ ق۔م کا ہے۔ اور ۶۰۰ ق۔م میں اپ بھرنش منظر عام پر آئی۔ اشوک کے کتبوں کا مشاہدہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت پالی زبان جنم لے چکی تھی۔ پالی اپ بھرنش کا ہی ایک روپ ہے۔ اس کی نشو و نما ۶۰۰ء تا ۱۰۰۰ء تک ہوتی رہی ہے۔ اس کے بعد تقریباً دو سو سال تک زبان کا ارتقار کا رہا جس کے پس پردہ بیرونی حملہ آوروں کا پے در پے داخلہ اور مہمات تھے۔ اس کے بعد اپ بھرنش سے مختلف جاید ہند آریائی زبانوں کا ارتقا ہوا۔ اردو کا زمانہ باقاعدہ طور پر ۱۱۹۳ء سے شروع ہوتا ہے جب کہ مسلمان فتح دہلی کے بعد مستقل حکمران کی حیثت سے ہندوستان میں مقیم ہو چکے تھے۔

شورسینی اپ بھرنش اردو کی اصل ہے جو ۶۰۰ء تا ۱۰۰۰ء تک ارتقائی منازل پر تھی اس بیان کی روشنی میں یہ تصدیق ہوتی ہے کہ اردو کا آغاز مسلمانو کی آمد سے پہلے تقریباً دو سو سال قبل ہو چکا تھا۔ لیکن اس کو صحیح طور سے منظر عام پر لانے کے لیے مسلمان ذمہ دار ہیں۔

سنیتی کمار چٹرجی اپنے تحقیقی مقالہ دی اورجن اینڈ ڈولپمنٹ آف دی بنگالی لینگویج
(The Origin And Development of the Bangali Language)
جو محمود شیرانی کی "پنجاب میں اردو" سے دو سال قبل کی تصنیف ہے واضح کیا تھا کہ اگر

مسلمان ہندوستان میں نہ آتے تب بھی جدید آریائی زبانوں کی پیدائش ہو ہی جاتی لیکن ان کے ادبی آغاز وارتقا میں ضرور تاخیر ہو جاتی ۔(۳۰)

اپ بھرنش سے جو زبان منظرعام پر آئی ہے اس کو "پیش اردو ۔ Proto Urdu) کہا جاتا ہے اور اس سے قبل وہ زبان جو گرفت تحریر میں نہیں تھی اس کو (Posts Urdu) کہاجاتا ہے ۔Pre ۔ Urdu میں زیادہ تر وہ خصوصیات ملتی ہیں جو اپ بھرنش میں پائی جاتی ہیں ۔

" مسعود حسین خاں نے اس باب میں اپ بھرنش کے آٹھ مصوتے (Vowels) کی نشاندہی کی ہے ۔

ا(अ) ـ آ(आ) ـ اِ(इ) ـ ای(ई) ـ اُ(उ) ـ
او(ऊ) ـ اے(ए) ـ اے(ऐ) ـ او(औ)

پائے جاتے ہیں ۔پیش اردو میں دو نئے مصوتے اے(ऐ) اور (औ) وجود میں آئے (۱

بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں شمالی ہند میں جو پیش اردو ۔ Pre Urud) رائج تھی اس کے لسانی نمونے امیر خسرو کی غرۃ الکمال ، ہیم چند کی شبدانوشاسن ، میں ملتے ہیں اور بعد کو یہی مثالیں بکٹ کہانی (افضل) میں بھی ملتے ہیں جس کو قدیم اردو کہا جاتا ہے ۔

قدیم اردو میں مادے کے ساتھ لاحقہ کا استعمال کیا جاتا تھا:

ہو میوں تیسے سنت ہوں ماتا (بکٹ کہانی)

علاوہ دوسے لوواں چلت ہیں (بکٹ کہانی)(۳۲)

ماضی مطلق بنانے کے طریقے جو ضمائر اور حروف گیارھویں اور بارھویں صدی عیسویں میں شمالی ہند میں مستعمل تھے وہ تقریباً وہی تھے جو بعد کے زمانے میں دہلی اور اس کے اطراف کے علاقہ میں ترقی پذیر رہے ۔یہی بولی بعد میں دکن منتقل ہوتی ہے ۔جنوب میں اردو کی ارتقا کے ڈانڈے لسانی محققین نے علاؤ الدین خلجی کے

دکن پر حملوں سے ملاتے ہیں۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ دکن میں اردو کے ارتقا کی رفتار محمد تغلق کے مستقل پائے تخت سے تیز ہوتی ہے ۔ صوفیائے کرام اور امرائے سلطنت، فوج اور تجار کی جوق در جوق آمد نے اس کی ترقی کو پر پرواز عطا کیے ۔ بہمنی سلطنت کے قیام کے بعد صوفیائے کرام کی آمد سے تصانیف کی طرف باضابطہ توجہ کی گئی ۔ بہمنی دور کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ آج بھی قدیم اردو کی پہلی مثنوی ہے جو شمالی ہند کی زبان کی ترجمانی کرتی ہے ۔

صوفیائے کرام کے ملفوظات میں جو قدیم اردو کے نمونے ملتے ہیں وہ بھی شمالی ہند کے ابتدائی نمونوں کے قریب قریب ملتے ہیں ۔ ان کی زبان مثنوی کدم راؤ پدم راؤ سے قدرے مختلف ہے ۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ صوفیائے کرام کے مخاطب عوام تھے لہذا اس میں عوامی زبان کا عمل دخل ضروری ہو جاتا ہے جب کہ مثنوی اہل علم کے لیے لکھی گئی تھی ۔

مرزا خلیل احمد بیگ اس سلسلے میں کئی شہادتیں خسرو کے کلام سے پیش کی ہیں ۔ ان میں سے دو یہ ہیں:

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نہ ہوئے

کالا ہنسا نہ ملایے سمندر تیر
پنکھ پسار یکہ ہرے نرمل کرے (۳۴)

شمالی ہند میں امیر خسرو کی شاعری کو قدیم اردو کی ابتدائی زبان تسلیم کیا گیا ہے اور یہ زبان دہلوی کہلائی ۔

جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ: "ان کے کلام کو دیکھ کر دو باتوں کا پتہ چلتا ہے ۔ ایک یہ کہ اب یہ زبان قدیم اپ بھرنش کے دائرے سے

باہر نکل آئی ہے اور دہلی اور اطراف دہلی کی زبانوں سے مل کر اپنی تشکیل کے ایک نئے دور میں داخل ہو گئی ہے جس پر کھڑی بولی اور برج بھاشا دونوں اثر انداز ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اب دھل منجھ کر اتنی صاف ہو گئی ہے کہ اس میں شاعری کی جاسکے۔" (۳۴)

مسعود صاحب رقم طراز ہیں کہ کبیر اور گرونانک کے کلام میں کھڑی بولی کا نمونہ ملتا ہے جو زبان دہلوی کا صاف اور نکھرا ہوا روپ تھا۔یہی تاثر جنوب کی بولیوں میں بھی ہو سکتا ہے۔نواح دہلی کی بولیوں میں بھی اردو کا ماخذ ملتا ہے۔یہ بولیاں دکن میں زبان دہلی کی شکل میں پہنچتی ہیں جب کہ وہ سیال تھیں اور اس پر مختلف لسانی اثرات کار فرما تھے۔اسی کی تصدیق سید قدرت نقوی کے لسانی نظریہ سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے دکن میں ضمائر کے نمونے کو کھڑی بولی کا دوسرا روپ قرار دیا ہے جو شمالی ہند کی زبان سے مماثلت رکھتی ہیں۔لکھتے ہیں:

"دکنی اردو اور قدیم شمالی اردو اور کھڑی بولی میں ضمیر اضافی بطور ضمیر مطلق استعمال ہوتی تھیں اور اب بھی ان علاقوں میں جہاں اردو کا قدیم ادب عوام میں باقی ہے یہی استعمال میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً: لپنے کو بڑا دکھ ہوا۔ہمارے کو بتاؤ تمھارے سے کون بولتا ہے قدیم اردو یعنی دکنی اور کھڑی بولی میں بھی یہی طریقہ رائج تھا بلکہ "نا کے علاوہ صرف (ن) بھی علامت اضافت کے طور پر استعمال کرتے تھے۔" (۳۵)

جس نے پیدا کیا سب عالم کو ہمنا کو عقل ہور دین دیا

شمالی ہند میں اردو کے ارتقا اور فروغ کے باوجود نثر کے نمونے بہت بعد کو ملتے ہیں جب کہ جنوب میں نثری اور شعری دونوں نمونے بہت قبل کے ملتے ہیں۔ قدیم اردو کا زیادہ تر سرمایہ شعری سرمایہ ہے۔ایک رسالے کا ذکر مالک رام اور مختار

الدین احمد نے کربل کتھا کے مقدمے میں کیا ہے۔ "عماد الدین قلندر پھلواری" سے منسوب رسالہ "صراط مستقیم" کا ذکر کیا ہے وہ بھی ۶۹/ ۱۶۶۸ء کی تصنیف ہے۔اس کو مستند نہیں مانا گیا۔ شمالی ہند میں اردو کی سب سے پہلی نثری تصنیف "کربل کتھا" ہے جو ۳۳۔۱۷۳۲ء کی تصنیف ہے۔ کربل کتھا تخلیقی تصنیف نہیں بلکہ ملا واعظ حسین کاشفی کی فارسی کتاب "روضتہ الشہدا" کا اردو ترجمہ ہے۔ کربل کتھا کے تحقیقی مرتبین کا کہنا ہے کہ فضلی نے "روضتہ الشہدا" کا لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ اس میں کچھ ترمیم بھی کی گئی ہے۔ یہ کتاب مذہبی نوعیت کی ہے۔

شمالی ہند کا دوسرا نثری کارنامہ "قصہ مہر افروز و دلبر" ہے۔ مکمل قصہ نثر میں ہے۔ یہ قصہ خسرو کی دہلوی زبان کی ترقی یافتہ شکل میں ہے۔ "قصہ مہر افروز و دلبر" کو مسعود حسین خاں نے مرتب کر کے مع مقدمہ شائع کیا ہے جس کی اردو حلقے میں بہت پذیرائی ہوئی۔ اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے جن میں سے ایک ہندی ایڈیشن ہے۔ اس کے بعد نو طرز مرصع کا نمبر آتا ہے۔ یہ بھی قصہ چہار درویش کا اردو ترجمہ ہے

مسعود حسین خاں نے شمالی ہند میں اردو کے ابتدائی دور کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے ابتدائی نمونوں کا ذکر کیا ہے اور جنوب کے ارتقائی دور کا جائزہ لیا ہے۔ "دکنی" کے نام کے بارے میں کہتے ہیں:

> "عہد بہمنی کے کسی مصنف نے اپنی زبان کو دکنی کے نام سے نہیں پکارا ہے۔ اس کے ہندی، ہندوی، اور گجراتی نام زیادہ قدیم ہیں۔ قطب شاہی اور عادل شاہی ریاستوں کے قیام کے بعد ہی اس کا نام دکنی پڑا۔" (۳۶)

پروفیسر عبدالقادر سروری دکنی کی نشو و نما سے بحث کرتے ہوئے اسے اودھی کی ہم عصر بتلاتے ہیں:

"دکنی اردو کا وہ روپ ہے جس کی ادبی نشو و نما ابتدائی زمانے میں دکن اور گجرات میں چودھویں صدی کے نصف آخر سے سترھویں صدی کے اواخر کے دوران ہوئی۔ یہ زبان بھی جدید ہند آریائی کی ایک شاخ ہے اور اس کا آغاز بھی جدید ہند آریائی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہوا۔ لیکن نشو و نما کے اعتبار سے یہ اودھی کی معاصر ہے۔ دکن کا سارا سرمایہ الفاظ ہند آریائی ماخذوں پر مبنی ہے اور قواعد کا ڈھانچہ بھی ہند آریائی بولیوں سے مطابقت رکھتا ہے۔" (۳۷)

اس زبان کو مختلف محققوں نے الگ الگ نام دیے ہیں کیوں کہ یہ زبان اس وقت تک مختلف ناموں سے منسوب ہوتی رہی جب تک کہ یہ خود ایک مسلمہ لسانی حیثیت اختیار نہیں کرتی ہے۔ اس کو سب سے پہلے "پرت نامہ" کے مصنف قریشی بیدری نے "بھوگ بل" (۱۶۱۴ء) میں دکھنی کے نام سے پکارا ہے۔ (۳۸)

مسعود صاحب لکھتے ہیں:

"لسانی تجزیہ کے نقطہ نظر سے پہلی "مخلوطہ بنیاد" تصنیف جس سے ہم دو چار ہوتے ہیں فخر دین نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ہے جو ۱۴۲۱ء اور ۱۴۲۵ء کے درمیان کی تصنیف ہے۔۔۔۔۔۔

اس میں اردو زبان کا جو چہرہ ابھرتا ہے وہ تیرھویں صدی عیسوی کی زبان دہلوی کا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شمال میں اس زبان کے مستند نمونے نہیں ملتے۔۔۔۔۔ جس وقت دکن میں دکنی اردو محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی اور عبدل کے ہاتھوں ادبی اور لسانی دونوں اعتبار سے اپنے بام عروج کو پہنچ چکی تھی۔۔۔۔۔ جب کہ ابھی نواح دہلی کی بولیاں اس زبان کی تشکیل کے لیے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔" (۳۹)

زبان دہلوی دکن میں تین زبانوں سے متاثر ہوتی ہے۔ یہ تین زبانیں تھیں: (۱) مراٹھی۔(۲) کنٹر۔(۳) تلگو۔ ان میں مراٹھی ہند آریائی کی شاخ ہے۔ مسعود صاحب نے اپنی تحقیق میں بتایا ہے کہ مراٹھی سے دہلوی زبان کا اچھا لین دین رہا۔

کتاب کے ساتویں ایڈیشن میں اس باب میں بہت کچھ ردو قبول، ترمیم و اضافے ہوئے ہیں۔ اس حصہ میں اردو کے آغاز و ماخذ کے بارے میں نئے نظریہ کو واضح کرتے ہیں۔ پہلے انھوں نے اردو کے ماخذات کو کھڑی بولی اور ہریانوی سے مربوط کیا تھا اس ایڈیشن میں پروفیسر مسعود حسین خاں نے جو ترمیم کی اس پر یہ تبصرہ ہوا کہ:

"امیر خسرو کہ سنہ سپہر، میں دی ہوئی بارہ ہندوستانی زبانوں کی فہرست سے دہلی پیرامنش (دہلی اور اس کے نواح کی بولیاں) کو اردو کا سرچشمہ ثابت کیا ہے۔۔۔۔۔ نواح دہلی کے تقابلی مطالعے کے بعد اردو کے آغاز و ماخذ کے بارے میں جو نیا نظریہ قائم کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ قدیم اردو کی تشکیل براہ راست ذوآبہ کی کھڑی بولی اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیر اثر ہوتی ہے ورنہ اس سے پہلے ان کا نظریہ یہ تھا کہ قدیم اردو کی تشکیل براہ راست ہریانی کے زیر اثر ہوئی ہے اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑتے ہیں۔ اب انھوں نے ہریانی بولی کے تقدم و تفوق کو ختم کر کے نواح دہلی کی تمام بولیوں اور بالخصوص کھڑی اور ہریانی کو اردو کا ماخذ قرار دیا ہے۔(۴۰)

وہ لکھتے ہیں:

"۱۷۰۰ء تک ریختہ کی شکل میں کھڑی بولی اردو کا ادبی ارتقا ہو چکا تھا۔" (۴۱)

پروفیسر گیان چند جین نے اردو کے آغاز کے نظریے کے متعلق ہندوستانی

زبان میں مسعود حسین خاں کے نظریے سے کچھ اتفاق اور کچھ عدم اتفاق کرتے ہوئے اس طرح لکھا ہے:

"اردو کے آغاز کو دو منزلوں میں ڈھونڈنا چاہیے۔اول کھڑی بولی کا آغاز دوسرے کھڑی بولی میں عربی فارسی لفظوں کا شمول، جس کا نام اردو ہو جاتا ہے میرامن سے لے کر ڈاکٹر مسعود حسین خاں تک نے دوسری منزل کے بارے میں بات کی ہے جب کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری نے پہلی منزل پر زور دیا ہے۔" (۴۲)

لیکن اس نظریے میں موصوف نے یہ نہیں واضح کیا کہ ہر زبان کی ایک اصل ہوتی ہے اور اصل السنہ کو معلوم کرنے کے لیے جن محققین نے قلم اٹھایا ہے ان میں محمود شیرانی، پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر زور اور دوسرے ہندوستانی اور غیر ملکی ماہر لسانیات ہیں جب کہ میرامن اور چند محققین نے اردو کو مخلوط زبان ہی تصور کیا ہے۔

مسعود حسین خاں نے مقدمہ تاریخ زبان اردو کے ساتویں ایڈیشن میں ۴۱ صفحات پر دکنی اردو کے بارے میں بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ دکن میں اردو کا تاریخی پس منظر ۱۳۰۰ء تا ۱۷۰۰ء کے درمیان لیا ہے۔ دکن ہندوستانی سطح مرتفع کا وہ علاقہ ہے جو دریائے نربدا اور کوہ وندھیاچل کے درمیان واقع ہے۔اس میں موجودہ آندھرا پردیش، کرناٹک، تامل ناڈو اور مہاراشٹرا کا علاقہ شامل ہے۔یہاں کی زبان کو دکنی اردو یا اردوئے قدیم کا نام دیا ہے۔اس کے متعلق مسعود صاحب اس خطہ کی زبان کی صرف و نحو کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے حسب ذیل نتائج اخذ کیے ہیں:

"دکنی با استثنا چند الفاظ اور اختلافات تلفظ کے، سلاطین دہلی کے عہد کی اردوئے قدیم کے سوا کچھ اور نہیں نکو، اور رچ

تاکیدی ہیں۔" (۴۳)

چ کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ مخصوص دکنی نہیں بلکہ ہند آریائی کے ناطے مرہٹی میں اس کا عنصر ملتا ہے جو اردو پر اثر انداز ہوتی ہے:

اسمٰعیل امروہی کی مثنوی وفات نامۂ حضرت فاطمہ ۱۶۹۳ء میں چ تاکیدی ملتا ہے۔

"کہ تھا آب کوثر اسیکاچ نام" (۴۴)

ڈاکٹر آمنہ خاتون کا نظریہ ماہرین لسانیات و محققین سے جداگانہ ہے۔ وہ دکن میں اردو کے آغاز کو شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد سے کئی سو سال قبل بتاتی ہیں۔ لکھتی ہیں:

"شورسینی اپ بھرنش اور بلاشبہ اس کی مقامی پیداوار مراٹھی تھی اور اس کے شواہد موجود ہیں کہ شورسینی اپ بھرنش اور مرہٹی میں عربی فارسی کی سات سو سال کے عرصے میں بتدریج آمیزش اور پڑوس کی جدید آریائی زبانوں کی لین دین اور راہ و رسم کی وجہ سے مرہٹی کے دوش بدوش دکنی کی نشو و نما ہوئی۔" (۴۵)

اس طرح آمنہ خاتون نے دکنی کے آغاز کے بارے میں واضح کیا ہے کہ یہاں کی مرہٹی میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش سے دکنی کی داغ بیل پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ عرب جب جنوبی ساحل میں داخل ہوئے اس وقت دکن میں علاقائی زبانوں کے علم و ادب کے اچھے دبستان تھے۔ کنڑا، ملیالم اور تلگو یہاں کی قدیم زبانیں تھیں لیکن ان میں سے کسی کا بھی تعلق ہند آریائی سے نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو دکنی اردو تشکیل پا سکتی تھی جب کہ اردو میں ان علاقائی زبانوں کے الفاظ کی بجائے فارسی، عربی اور شمالی ہند کی بولیوں کے الفاظ ملتے ہیں۔

عرضی، راضی نامہ، تلگو میں مروج ہے۔ دشوار، دعا سلام ملیالم میں مروج ہے

مسعود صاحب نے افعال، جملوں کی ساخت، نحوی ساخت، حروف استدارک، حرف و تشبیہہ، علامت مفعول۔ ان سب کا تقابلی جائزہ لیا ہے اور اس طرح دکنی کو قدیم اردو اور شمالی ہند کی بولی کا ماخذ بتایا ہے۔یہاں صرف چند مثالوں کو پیش کیا جاتا ہے

(۱) دکنی اردو کی ایک مسلسل صوتی خصوصیت (شمال میں بھی گاہے بگاہے مل جاتی ہے) ق کا خ میں تبدیل کر دینا۔ خطرہ کو قطرہ۔ عقل کو اخل

(۲) دکنی زبان کی فرہنگ اور خصوصیات، صرف و نحو کی توجیہہ نواح دہلی کی بولیوں بالخصوص ہریانی اور کھڑی بولی سے مکمل طور پر کی جا سکتی ہے۔

"ہور درود اپنے رسول پر بھیجا اور ان کے فرزندوں پر اور سب امت کے خاصاں پر۔"

شرح مرغوب القلوب کے اس جملے کی روشنی میں مسعود صاحب لکھتے ہیں:

> "سولھویں صدی عیسوی سے دکنی نثر کے جملے کی بناوٹ زیادہ باقاعدہ ہونے لگی۔ آج کل کی اردو کے مطابق اس میں بھی جملے میں پہلے فاعل مفعول اور آخر میں فعل آتا ہے۔" (۴۶)

صرفی خصوصیات میں جمع کے متعلق دوسرے محققین نے "ان" سے جمع کے قاعدے کو دکنی سے مختص کیا ہے۔ مسعود صاحب نے تحقیق سے یہ واضح کیا ہے کہ یہ طریقہ جمع پنجابی، ہریانی اور کھڑی دوآبہ کی زبان میں مروج ہے۔ افضل کی تصنیف میں بھی یہ مثالیں ملتی ہیں۔

ون کی جمع جو کھڑی بولی سے متعلق ہے دکن کے قدیم مخطوطات میں جا بجا ملتی ہیں:

پروفیسر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں:

> "زبان کے ماہرین جانتے ہیں کہ دکھنی قدیم اردو کا ادب ہے جس کا نشوونما دکن میں ہوا۔۔۔۔۔ اصل میں اردو اور دکنی کا قضیہ جدید دور اور قدیم دور کا قضیہ ہے اور ماہرین لسانیات جانتے ہیں کہ کوئی

بھی قدیم زبان صوتی تبدیلی کا مرحلہ طے کرکے جدید دور میں داخل ہوتی ہے ۔۔۔۔جدید اور قدیم کے مابین اس تغیر اور تبدیلی کا سبب صوتی انتقال یا صوتی تبدیلی ہے ۔جسے ماہر لسانیات ایک اہم اصول سمجھتے ہیں ۔۔۔۔۔دکھنی ان تمام محرکات کے زیر اثر جدید معیاری اردو میں بدلی ہے ۔" (۴۷)

اس کے بعد مسعود صاحب ۳۷ صفحات پر شمالی ہند میں اردو ۱۷۰۰ء تا ۱۸۵۷ء کی تفصیل پیش کی ہے اس دور میں:

"اردو زبان اپنی صوتیات، صرف و نحو اور کسی حد تک لفظیات کے نقطہ نظر سے ایک ایسی شکل اختیار کر چکی تھی کہ دہلی اور اس کے باہر کے شعرا اور ادیب اس کا تتبع کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے ۔" (۴۸)

اس سے قبل مسعود حسین خاں نے عاشور نامہ کو سترھویں صدی کی تصنیف بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ شمال کا قدیم ترین شہادت نامہ ہے اور اسمعیل امروہی کی مثنوی وفات نامہ بی بی فاطمہ کو اس صدی کی آخری اہم تصنیف مانا ہے لیکن مثنوی جمجاہ فیض کا سنہ کتابت ۱۰۹۹ھ ہے ۔

چوتھے باب میں مسعود صاحب نے اردو کی ابتدا کو لسانی نظریات کی روشنی میں جانچا ہے ۔جس میں انھوں نے محمد حسین آزاد کے نظریہ "اردو اور برج بھاشا" سے بحث کی ہے ۔

مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

"ہمارے یہاں لسانی تحقیق کے مرد میدان آزاد ہیں جنھوں نے سب سے پہلے آب حیات میں اردو زبان کی تاریخ کو سلسلہ وار بیان کرنے کی کوشش کی ہے ۔" (۴۹)

اس کے بعد پروفیسر شیرانی کی پنجاب میں اردو کے نظریہ کا جائزہ لیتے ہیں اور

اردو کے پنجابی سے ماخذ کے نظریے سے اختلاف کرتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ پنجابی جو ایک عرصہ تک بولی رہی ہے، ابھی ابھی اس کو زبان کا درجہ ملا ہے۔ یہ کیسے اردو زبان کا ماخذ ہو سکتی ہے۔ کھڑی بولی کے متعلق متضاد رایوں میں اس کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اور قواعد، صرف و نحو کے ذریعے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ دکنی اور پنجابی کے بنیادی اختلافات ضمائر ہیں جیسے میں، میرا، اور کا، کی، کے حالت اضافی کی بجائے دا، دی، دے، آتے ہیں توں، تیرا۔

پانچواں باب ساری کتاب کا نچوڑ ہے جس میں اس مقدمہ کا خلاصہ ہے۔ اس باب میں پروفیسر ژول بلوک کے مضمون "ہندوستانی لسانیات کے بعض مسائل" میں جو حوالہ دیا تھا اس کی تائید میں اپنا نظریہ قائم کرتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ پنجاب پہلا صوبہ ہے جو مسلمانوں کے زیر اقتدار آیا اور ایک عرصے تک رہا۔ اسی لیے پنجابی اور اردو کی مماثلت یاد رکھیے لیکن اس کے مانع نہیں کہ ہندی لشکروں میں کے جو لوگ پہلے پہل اپنی زبان کو دکن سے لے گئے پنجاب سے متعلق تھے بلکہ مشرقی پنجاب کے ضلع انبالہ اور شمالی دوآبہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مغربی روہیلکھنڈ کے متعلق میں تحقیق سے نہیں کہہ سکتا" کیوں کہ اضلاع کی اردو نما زبان شائد بعد کے اثرات کی پیداوار ہے۔" (۵۰)

مسعود حسین خاں اس نظریہ کو لسانی تحقیق کا ایک نیا باب تصور کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ بعض دشواریوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

(۱) قدیم ادبی نمونوں کا فقدان

(۲)۔ ہریانوی زبان کی کسی قواعد کا دستیاب نہ ہونا۔ (۵۱)

پہلی دشواری کو پروفیسر شیرانی کے مضامین اور تحقیق سے جانچا ہے اور دوسرے کو گریرسن کے "لسانیاتی جائزہ ہند" سے۔ اس باب میں بھی اضافہ کیا گیا

ہے جس کا ذکر یوں ملتا ہے۔

"اس سلسلے میں حال کی دو اہم تصانیف کا ذکر ضروری ہے جو مقدمہ تاریخ زبان اردو کی پچھلی اشاعتوں کے وقت دستیاب نہیں تھیں۔ پہلی ڈاکٹر جگدیو سنگھ کی، "بانگرو کی توضیحی قواعد" (انگریزی ۱۹۷۰ء) اور دوسری ڈاکٹر رام بلاس شرما کی "بھارت کے پراچین بھاشا پریوار اور ہندی" (۱۹۷۹ء) جس میں ہریانوی کی لسانی اہمیت اور تاریخی کردار پر نہایت عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔" (۵۲)

ہریانوی اور قدیم اردو کی مماثلتوں کے بارے میں ڑ، ڈ، کی نشاندہی کی ہے۔

(۱)۔ بھ، دھ کا تلفظ سہل ہو جاتا ہے۔

(۲)۔ جمع ان سے بنتی ہے۔ غریب، غریباں۔ جھوٹ، جھوٹاں

(۳)۔ ماضی قریب، سے، سوں، س اور سا اور زمانے حال دونوں میں ملتے ہیں۔ یا کے ذریعہ مصادر بنانا۔ رہیا، چلیا، کہیا وغیرہ۔

اس کے بعد اردو اور کھڑی بولی کا جائزہ لیا ہے۔ کھڑی بولی جو اپنی صوتیات کے لحاظ سے معیاری اردو سے مختلف ہے اسے عام بول چال کی بولی کہا ہے۔

کھڑی بولی میں مشدد کا استعمال اضلاع میں زیادہ ملتا ہے۔

مثلاً: روٹی (رٹّی)، چادر (چدّر)، گاڑی (گڈّی) وغیرہ۔

ان میں بھی دکن سے مماثلت ملتی ہے۔ سنّا (سونا)، چُلّا (چولا)

کھڑی بولی میں دکن کی طرح درمیانی (ہ) کی ہائیت کھو جاتی ہے اس کا بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔

عاشور نامہ میں نیں (نہیں)، کاں (کہاں)

"ان" سے جمع بنانا بھی دکنی اردو میں عام ہے۔

اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"آج بھی میرٹھ مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع میں سنائی دیتی ہے جیسے دنان، کھیتاں وغیرہ۔" (۵۳)

عاشور نامہ میں اس قسم کی جمع ملتی ہے۔تب یہ اعتراض ختم ہوجاتا ہے کہ عاشور نامہ کا مصنف سارنگ پور کا ہے۔ جس کے بارے میں گیان چند جین اور قدرت نقوی نے کئی صفحات بحث میں صرف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس میں زبان کا اثر جنوبی ہند کی دکنی سے قریب ہے۔ لہٰذا اس کا مصنف مالوے کے "سارنگ پور" سے تعلق رکھتا ہے جب کہ یہ مماثلت کھڑی بولی کا اشتراک ہے۔

جمع متکلم میں ہمن، افضل، چندر بھان اور دکنی کلام میں ملتا ہے

حرف ربط کا، کی، کے، کونسا، سیتی، ستے، وغیرہ دونوں زبانوں میں ملتے ہیں۔ آخر میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

"ہمارا پہلا ماہر لسانیات اور لغت نگار خان آرزو ہے جس نے سب سے پہلے پہل اردو کا معیار متعین کیا۔اس سے ہندوستان کی مختلف ہندی، سنسکرت، راجستھانی، کشمیری، پنجابی، اکبرآبادی، شاہ جہاں آباد کی زبانوں کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہیں۔" (۵۴)

دکن میں شمال کی کئی بولیاں داخل ہوتی ہیں اور یہاں قدیم اردو کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب مزید تحقیق کے متلاشی ہیں۔ لکھتے ہیں:

"اردو کی ابتدا پر مزید کام کرنے کے لیے نواح دہلی ہی کی بولیوں کی جدید و قدیم شکلوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے جن سے عام طور پر دکن کے محققین ناواقف ہیں۔" (۵۵)

اس طرح بقول مسعود حسین خاں کے کھڑی بولی کے ساتھ ہریانوی بھی اردو کی پیدائش میں برابر کی حصہ دار ہے۔اس طویل تحقیقی مقدمہ کو جدید نظریات کے بعد انھوں نے مختصراً تلخیص میں واضح کر دیا ہے:

"اس لیے زبان دہلی و پیرامنش اردو کا اصل منبع اور سر چشمہ ہے اور حضرت دہلی اس کا حقیقی مولد و منشا۔"

مسعود حسین خاں نے اپنی لسانی تحقیق میں لسانی دلائل کے ساتھ پہلی بار سائنٹیفک طور پر ہریانی کے اثرات کو واضح کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں میں ہریانی کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ ہریانوی جاٹو اور بانگڑو کی ایک ہی بولی کے نام ہیں۔

ہریانی کی خصوصیات کو تفصیل سے پیش کرتے ہوئے جن اصولوں کو بتایا ہے اس کے مطابق ہریانونی میں معکوس آواز میں ڑ کی بجائے ڈ کا استعمال ہوتا ہے مثلاً : بڑا (بڈا) پڑھنا (پڈھنا) لفظ کے شروع میں آنے والے مصوتوں کو لمبا کر کے کہا جاتا ہے جیسے سچ (سانچ)۔ بڑھ (باڑھ) وغیرہ۔ ہکار آوازوں مثلاً: بھ، پھ، جھ، چھ، کا تلفظ سادہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً: مجھ (مج)، کچھ (کچ) وغیرہ۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے مسعود حسین خاں کی علمی شہرت کی بنیاد ان کے تحقیقی مقالے "مقدمہ تاریخ زبان اردو" پر قائم ہے۔ جہاں اس مقدمہ کو ہند و پاک کے برصغیر میں شہرت و مقبولیت ملی اور بیشتر یونیورسٹیز میں اسے داخل نصاب کیا گیا وہیں اس کے خلاف علمی حلقوں میں کچھ رد عمل بھی ہوا ہے جس کی یہاں وضاحت کرنا ضروری ہے۔ ۱۹۴۸ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوتے ہی لاہور کے علمی حلقوں میں کافی چہ میگوئیاں رہیں۔ اس لیے کہ اس تصنیف میں مسعود حسین خاں نے محمود شیرانی کی تصنیف "پنجاب میں اردو" کے بعض پہلوؤں پر تنقید کی ہے۔ اس رد عمل میں کچھ تو علاقائی اور صوبائی رنگ تھا اور کچھ ہند آریائی زبانوں کی تاریخ سے ناواقفیت سبب تھی۔

مسعود حسین خاں نے اپنی تصنیف میں جہاں اردو اور پنجابی کی مشترک خصوصیات سے بحث کی ہے وہیں اردو اور پنجابی کی بنیادی اختلافات کا بھی تذکرہ کیا

ہے ۔ وہ بعض دیگر مصنفین کی طرح یہ نہیں مانتے کہ اردو لاہور یا پنجاب سے نکلی ہے بلکہ اس کا مولد و مسکن (جائے پیدائش) دہلی اور نواح دہلی کے علاقے ہیں اور اس نواح دہلی کے علاقوں میں خاص طور پر کھڑی بولی کے علاوہ ہریانوی اور برج بھاشا کی بولیاں رائج ہیں۔ محمود شیرانی نے قدیم دکنی قواعد کی خصوصیات کا موازنہ جدید و قدیم پنجابی کی خصوصیت سے کیا ہے اور ہرچند جیسا کہ خورشید حمرہ صدیقی نے لکھا ہے یہ دعویٰ تو نہیں کیا ہے کہ اردو پنجابی سے نکلی لیکن یہ دعویٰ ضرور کیا ہے کہ مسلمان چوں کہ داخلہ دہلی سے قبل کئی سو برس تک لاہور میں قیام کر چکے تھے اس لیے اردو ایک قسم کا لسانی تسلسل ہے پنجابی کا۔

خورشید حمرہ صدیقی نے مسعود حسین خاں کی تحقیق میں تضادات کا ذکر بڑی شدومد کے ساتھ کیا ہے اور لکھا ہے:

> "ان کے یہاں بھی تضاد بیانات کی اس قدر بھرمار ہے کہ گو یم مشکل نگو یم مشکل ۔" (۵۶)

لیکن ان کے مذکورہ بالا مقالہ کا سارا زور اس بات پر ہے کہ قدیم اردو اور پنجابی میں گہری لسانی مماثلت پائی جاتی ہے جس کا اعتراف مسعود حسین خاں نے بھی اپنے مقالے میں کیا ہے ۔ وہ مقدمہ تاریخ زبان اردو سے ذیل کا اقتباس درج کرتی ہیں:

> یہ کہنا کہ اردوئے قدیم یا دکنی "نے "پنجابی سے لی ہوں گی محض بے بنیاد وقیاس آرائی ہو گی ۔یہی صرفی خصوصیات دہلی کے قرب وجوار کی بولیوں میں آج بھی لکھی جاتی ہے ۔انبالہ کی کھڑی بولی اور ہریانہ کے علاقوں کے قدیم ترین مصنفوں محمد افضل، شیخ محبوب عالم وغیرہ کے یہاں ملتی ہیں ۔ مثلاً ان کی جمع اناں، کھیت کی جمع کھیتاں، گھر کی جمع گھراں وغیرہ آج بھی ہریانہ کے علاقے میں بولی جاتی ہیں ۔ مسعود

صاحب نے مذکورہ بالا بیان میں جو کچھ فرمایا وہ بحث طلب ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ شیرانی نے یہ کہاں کہا کہ مذکورہ بالا خصوصیات اردوئے قدیم یا دکنی نے پنجابی سے لی ہیں۔ انھوں نے تو صرف اردو اور پنجابی کی مشترکہ خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔" (۵۷)

موصوفہ محض بحث کی خاطر محمود شیرانی کی تصنیف کے ان حصوں کو پس پشت ڈال دیتی ہیں جن میں انھوں نے لاہور سے دہلی تک کے لسانی اور تاریخی تسلسل کا ذکر کیا ہے۔ قدیم اردو اور پنجابی کی مشترکہ خصوصیات کا ذکر اپنے اسی لسانی مفروضے کی تشریح اور تائید کے سلسلے میں کیا ہے جو انھوں نے "پنجاب میں اردو" کے مختصر دیباچہ میں پیش کی ہیں۔

"مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں تضادات کی بات نادر علی خاں نے اپنے مضمون "اردو لسانیات کا المیہ" (نقد و نظر جلد ۲ شمارہ (۲) جلد نمبر (۱۳) نمبر (۱) میں کی ہے۔ ان کا خیال ہے:

"مذکورہ مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں تمام اوصاف اور محاسن کے باوجود سیاسی حیثیت سے تضاد و نقائص کا بڑا سرمایہ جمع ہو گیا ہے۔" (۵۸)

اس کے بعد مسعود حسین خاں نے مختلف مسائل پر جو مختلف محققین کی متضاد آراء نقل کی ہیں انھیں وہ مصنف کی تحریر کا تضاد بتاتے ہیں۔ نادر علی خاں کے اس مضمون کے بارے میں پروفیسر نذیر احمد نے صرف عنوان دیکھ کر ایک موقع پر یہ کہا تھا کہ کسی بھی علمی مضمون کا یہ عنوان نہیں ہو سکتا۔ اس میں تو ابتدا سے ایک قسم کی مخالفت کی بو ملتی ہے گویا کہ مصنف اس بات پر تلا ہوا ہے کہ مقدمہ تاریخ زبان اردو کو اردو کا المیہ ثابت کرے سہتاں چہ دو قسطوں میں شائع شدہ اس طویل مضمون کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا محرک کون سا جذبہ ہے۔ ہمیں پتہ

چلا کہ دراصل پروفیسر مسعود حسین خاں نے ورود مسعود میں ایک اور صاحب کے بارے میں جو لسانیات سے ناواقف ہوتے ہوئے مقدمہ پر چھینٹے اڑاتے رہے ہیں ان کو "کم سواد" لکھا تھا اور ان کی شان میں فارسی کا یہ مشہور شعر نقل کر دیا ہے:

آں کس کے نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابدالدہر بماند

نادر علی خاں کی عقل سلیم کو کیا کہیے کہ انھوں نے "کم سواد" کی ترکیب کو اپنی ذات گرامی پر اوڑھ لیا اور اپنی کم سوادی کے اظہار کے لیے یہ تحقیق رائیگاں کر ڈالی چناں چہ اپنے مضمون کے آخر میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

"ڈاکٹر مسعود حسین خاں جیسے ہمہ صفت موصوف، دانشور اور عبقری پر لب کشائی بقول موصوف جہل مرکب کی دلیل اور ناقد کم سواد کے مترادف ہے لیکن اس کم سواد کے تجزیہ کے بعد موصوف کو خود بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ خود کتنے پانی میں ہیں اور مذکورہ شعر کا مصداق کون ہے۔" (۵۹)

---

(۱) انصار اللہ نظر نے مقدمہ تاریخ زبان اردو پر خدا بخش لائبریری کے سیمینار میں چند سال قبل یہ مضمون پڑھا تھا خدا بخش کے ڈائرکٹر نے اس مضمون کی ایک فوٹو پروفیسر مسعود حسین کو بھیجی کہ اگر وہ چاہیں تو اس کا جواب لکھ بھیجیں تاکہ انصار اللہ کے اس مضمون کے ساتھ اس کو بھی شائع کیا جائے۔ مسعود حسین خاں نے ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری کے جواب میں صرف یہ لکھ کر بھیجا کہ مضمون کا میرا جواب صرف یہ شعر ہے جو میں ورود مسعود میں لکھ چکا ہوں۔

آنکس کہ نداند و بداند کے بداند   در جہل مرکب ابدالدہر بماند

اس کے بعد خدا بخش سے نہ تو انصار اللہ کا مضمون شائع ہوا اور نہ مسعود حسین خاں کا جواب۔ انصار اللہ نے وہی مضمون انجمن ترقی اردو پاکستان کے رسالہ اردو میں شائع کروا دیا۔ (مقالہ نگار)

لسانیات

۱-فرمان فتحپوری ڈاکٹر-زبان اور اردو زبان-لاہور-ص ۲۹
۲-فرمان فتحپوری-زبان اور اردو زبان-ص ۳۹
۳-دونوں نے مقالے پر اس قدر اچھی رائیں لکھیں جسکی بنا پر یونیورسٹی اکیڈمک کونسل نے مسعود حسین خاں کیلئے مبارکباد کا ایک رزولیشن پاس کیا تھا-جو یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی بار ہوا-(بحوالہ ورود مسعود)
۴-مسعود حسین خاں-پیش لفظ-مقدمہ تاریخ زبان اردو-ص ۶
۵-مسعود حسین خاں-ورود مسعود-ص ۱۱۴
۶-گیان چند جین-پرکھ اور پہچان-ص ۲۵۹
۷-مسعود حسین خاں-مقدمہ تاریخ زبان اردو-ص ۶
۸-محی الدین قادری، زور-ہندوستانی لسانیات-ص ۵۶ تا ۵۹
Dr. O. Sambial - A Text Book of History . P . 28-۹
۱۰-ڈاکٹر کالا سنگھ بیدی-نوائے ادب بمبئی-جنوری ۱۹۶۶ء-ص ۷
۱۱-موہن سنگھ دیوانہ-پنجابی ادب کی تاریخ-ص ۱۷
۱۲-کیفی دتاتریہ-قدیم اڈیشن اردو-ص ۵۷
۱۳-عبدالقادر سروری-زبان اور علم زبان-انجمن ترقی اردو ہند-ص ۲۱۲
۱۴-رام بابو سکسینہ-تاریخ ادب اردو-ص ۳
۱۵-اختر اورینوی-بہار میں اردو کا آغاز و ارتقا-ص ۸۰
۱۶-محی الدین قادری، زور-ہندوستانی لسانیات-ص ۸۰ تا ۹۰
۱۷-سلیمان ندوی-نقوش سلیمانی-ص ۸۷
۱۸-مسعود حسین خاں-اردو زبان کی تاریخ تشکیل تقدیر-ص ۶
۱۹-مرزا خلیل احمد بیگ-اردو کی لسانی تشکیل-ص ۲۰
۲۰-مرزا خلیل احمد بیگ-"اردو کے آغاز و ارتقا کے نظریے" مشمولہ ادیب جنوری تا جون ۸۴-صفحہ نمبر ۵۳-۵۴
۲۱-نجیب اشرف ندوی، پروفیسر-تنقید پنجاب میں اردو-ص ۱۰۷
۲۲-مسعود حسین خاں-مقدمہ تاریخ زبان اردو-ص ۳۵
۲۳-مرزا خلیل احمد بیگ-اردو کے آغاز و ارتقا کے نظریے-ادیب جولائی ۸۴ء-ص ۵۴
۲۴-محی الدین قادری، زور-مشولہ اردو کی لسانی تشکیل-مرتبہ خلیل احمد بیگ-ص ۵۴

۲۵-مسعود حسین خاں -مقدمہ تاریخ زبان اردو-ص ۲۷-۳۷
۲۶-مسعود حسین خاں -مقدمہ تاریخ زبان اردو-ص ۲۷ ۳۷
۲۷-مولوی عبدالحق -خطبات عبدالحق -جلد دوم-ص ۸
۲۸-مولوی عبدالحق -خطبات عبدالحق -جلد دوم-ص ۱۸
۲۹-شوکت سبزواری -اردو لسانیات-ص ۱۷
۳۰-سنیتی کمار چٹرجی -انڈو آرین اینڈ ہندی-ص ۱۰۳
۳۱-مرزا خلیل احمد بیگ -اردو کی لسانی تشکیل-ص ۴۹
۳۲-مرزا خلیل احمد بیگ -اردو کی لسانی تشکیل-ص ۴۹
۳۳-مرزا خلیل احمد بیگ -اردو کی لسانی تشکیل-ص ۵۷
۳۴-جمیل جالبی -تاریخ ادب اردو-جلد اول-ص ۲۷
۳۵-سید قدرت نقوی -لسانی مقالات-ص ۵۰
۳۶-مسعود حسین خاں -شعر و زبان-ص ۱۶۸
۳۷-عبدالقادر سروری -دکنی زبان مشمولہ دکنی اردو-مرتبہ عبدالستار دلوی ۱۹۸۷ء ص ۳۲۹
۳۸-جمیل جالبی، ڈاکٹر-تاریخ ادب اردو جلد اول-ص ۱۵۶
۳۹-مسعود حسین خاں -مقدمہ تاریخ زبان اردو-صفحہ نمبر ۱۱۱
۴۰-ادیب-علیگڑھ-سہ ماہی-تعارف و تبصرہ-جنوری تا دسمبر ۱۹۸۷ء-ص ۶۳
۴۱-مسعود حسین خاں -مقدمہ تاریخ زبان اردو-صفحہ نمبر-۱۰۷
۴۲-گیان چند جین -ہندوستانی زبان بمبئی-جولائی اکتوبر ۷۷ء-ص ۱۴
۴۳-مسعود حسین خاں -اردوئے قدیم-مجلہ عثمانیہ دکنی ادب نمبر-ص ۲۰
۴۴-مسعود حسین خاں -اردوئے قدیم-مجلہ عثمانیہ دکنی ادب نمبر-ص ۲۱
۴۵-امنہ خاتون-دکنی کی ابتدا-بنگلور-ص ۳۴
۴۶-مسعود حسین خاں -مقدمہ تاریخ زبان اردو-ص ۱۴۷
۴۷-رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر-مشمولہ حوالہ-قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ-مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن-ص ۹۳
۹۴
۴۸-مسعود حسین خاں -"مقدمہ تاریخ زبان اردو"-ص ۱۸۲
۴۹-ڈاکٹر مسعود حسین خاں "مقدمہ تاریخ زبان اردو"-ص ۱۸۸
۵۰-بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز-جلد ۵-۸-۱۹۳ء-ص ۲۰
۵۱-مسعود حسین خاں -"مقدمہ تاریخ زبان اردو"-ص ۲۸۲
۵۲-مسعود حسین خاں -"مقدمہ تاریخ زبان"-ص ۲

۵۳- مسعود حسین خاں - مقدمہ تاریخ زبان اردو - ص ۲۵۱

۵۴- مسعود حسین خاں - مقدمہ تاریخ زبان اردو - ص ۲۶۰

۵۵- مسعود حسین خاں - مقدمہ تاریخ زبان اردو - ص ۲۶۱

۵۶- نقد و نظر علیگڑھ کا ایک شش ماہی ہے جسکے مدیر اسلوب احمد انصاری ہیں - ورود مسعود اور نذر مسعود شائع ہونیکے بعد سے موصوف کے سینے میں رقابت کی آگ بھڑک رہی تھی چنانچہ انھوں نے نادر علی خاں کو اکسایا کہ وہ مسعود حسین خاں کے خلاف لکھیں - نادر علی خاں نے ورود مسعود میں انصار اللہ نظر کے بارے میں بغیر نام لئے "کم سواد" کا لفظ استعمال کیا ہے نادر علی خاں نے اپنے اوپر اوڑھ لیا اور مسعود حسین خاں پر ایک دکم سواد کے جانب سے مہمل اعتراضات کی بھرمار کردی - نقد و نظر کے تازہ شمارے میں دتیسری قسط کے تحت انھوں نے یہ مضحکہ خیز اعتراض کیا ہے کہ مسعود حسین خاں کی مادری زبان تو پشتو ہے اسلئے کہ ان کے جداعلیٰ صوبہ سرحد سے آئے تھے! یہ بات تو ایسی ہی ہے کہ کوئی کہے نادر علی (جن کے آباو اجداد "رانگڑ" سے مسلمان ہوئے تھے) مسلمان کیسے شمار کیے جاسکتے ہیں کیوں کہ وہ دراصل بت پرست تھے - وہ اسلام کو کیا جانیں اور انہیں تبلیغ اسلام کا حق کہاں سے پہنچا ہے - ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے اپنے ایک تازہ مضمون (جو کتاب نما کے گوشہ مسعود حسین خاں میں شائع ہوا ہے) حاشیہ میں کتنا بلیغ جملہ لکھا ہے کہ "اس کو کہتے ہیں چور کی ڈاڑھی میں تنکا!"

۵۷- نادر علی - "اردو لسانیات کا المیہ" - نقد و نظر - صفحہ نمبر ۸۷-۸۸

۵۸- نادر علی - اردو لسانیات کا المیہ، مشمولہ نقد و نظر علی گڑھ - جلد ۱۲ شمارہ ۱۹۹۲ء - ص ۱۵۵

۵۹- نادر علی خاں - اردو لسانیات کا المیہ - مشمولہ مضمون - نقد و نظر - جلد ۱۳-۱۹۹۱ء - صفحہ نمبر ۹۰

اردو کا المیہ

انجمن ترقی اردو ہند کا دفتر جس وقت علی گڑھ میں تھا اس دوران پروفیسر آل احمد سرور انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری تھے اور سہ ماہی اردو ادب ہفتہ وار رسالہ " ہماری زبان " کے ایڈیٹر تھے۔ پروفیسر آل احمد سرور کی غیر موجودگی میں مسعود صاحب کچھ عرصہ انجمن ترقی اردو ہند کے قائم مقام سکریٹری اور ان رسائل کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کارگزار رہے۔ یکم اکٹوبر / ۱۹۶۹ء تا یکم مئی ۱۹۷۰ء اور ۸ / ستمبر ۱۹۷۲ء تا ۲۲ / اکتوبر ۱۹۷۲ء وہ اس کی ذمہ داری کو سنبھالے رہے۔ اس دوران انھوں نے ہماری زبان کے لیے اداریے لکھے اور " میرا صفحہ " میں مضامین بھی تحریر کرتے رہے۔ ان مضامین کو مسعود صاحب کے شاگرد ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے ۱۹۷۳ء میں مرتب کر کے شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے " اردو کا المیہ " کے عنوان سے شائع کیا۔ اس مرتبہ کتاب میں ۲۸ اداریے اور انیس ایسے مضامین ہیں جو " میرا صفحہ " کے عنوان سے ہماری زبان میں شائع ہوتے رہے۔ اس تصنیف پر انھیں یوپی اردو اکیڈیمی سے انعام بھی ملا۔

اس کتاب کا پیش لفظ مسعود صاحب کے استاد محترم رشید احمد صدیقی صاحب کے خطوط سے اخذ کیا گیا ہے۔ پیش لفظ کے بارے میں خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں:

> " یہ دراصل ان خطوط و واقعات کے اقتباسات پر مشتمل ہے جو مسعود صاحب کو ان کے اداریوں اور مضامین کے بارے میں وقتاً فوقتاً لکھتے رہے تھے۔ "(۱)

اس مجموعے کے آخر میں " اردو مردم شماری کے آئینے میں " کے عنوان سے ایک مضمون شامل ہے جس میں ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی مجموعی تعداد

پیش کی گئی ہے۔ان تمام مضامین میں ہندوستان میں اردو کی لسانی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اردو کے موقف کی وضاحت اور اس کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔
رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"اس مجموعہ مضامین کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اردو کے طالب علم کو اردو کے مسائل پر معمولی قسم کی کتابوں کے مطالعہ کی محتاجی نہیں رہے گی۔یقین ہے اس گراں قدر مجموعہ کی پذیرائی غیر معمولی ہوگی۔"(۲)

"اردو کا المیہ" کی اردو حلقہ میں بڑی قدر دانی ہوئی۔اب یہ کتاب کمیاب ہو چکی ہے۔اس کا ہر مضمون فکر انگیز اور مسائل و تجزیہ سے بھرپور ہے۔
سری نواس لاہوٹی نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

"اردو کا المیہ مسعود صاحب کا اردو کے لیے بہت بڑا کنٹری بیوشن ہے جس کا ثانی نہیں۔"(۳)

اردو کے بارے میں ان اداریوں میں مسعود صاحب نے بڑی بے باکی سے قدم اٹھایا ہے جس میں اردو کو درپیش خطرات اور اس کے تاریک مستقبل کے جواز کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔اس کتاب میں "اردو ایک تہذیبی قدر اور ضرورت"، "مہاتما گاندھی نے کیا سوچا تھا"، "ہندوستانی پرچار سبھا"، "گرو گرنتھ صاحب اور اردو"، "اترپردیش سرکار کا اردو بورڈ"، "اردو بنام ہندی"، "۱۹۷۱ء کی مردم شماری اور اردو مادری زبان"، "زبان کا عروج وزوال"، "یہ گونگی بہری نسلیں"، "اردو کا محضر نام"، "اردو کی شہادت"، "اردو اور دیوناگری"، "اردو کا مینو فسیٹو"، "لسانی انفرادیت کی تلاش"، "بنگلہ دیش اور اردو"، "اردو لغت نویسی"، "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اردو"، "اردو کا المیہ"، "نوام چامسکی" وغیرہ اردو زبان کے لسانی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔خالص اردو کی لسانی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اردو

کے مسائل اور ان کے حل کی بھی تلاش کی ہے ۔ان مضامین کے بارے میں ایک تبصرہ نگار اعجاز علی ارشد لکھتے ہیں:

"یہ پورا مجموعہ ایک دل دردمند کی آواز ہے اردو کی اس دردمندی میں ڈاکٹر خلیل احمد بیگ بھی شریک ہیں ۔۔۔۔۔۔ مسعود صاحب نے اپنی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لے کر لسانی موضاعات پر لکھے گئے اداریوں کو زبان و بیان کی بے لطفی اور خشکی سے محفوظ رکھا ہے ۔" (۴)

عام طور پر اردو کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اردو والے جذباتی ہوجاتے ہیں لیکن ان مضامین میں ڈاکٹر صاحب نے معروضی انداز میں مسائل کا تجزیہ کیا ہے اور اردو والوں کو ان کی کوتاہیوں سے بھی آگاہ کیا ہے ۔اردو کے تعلق سے موجودہ نسل کی بے راہ روی ، مادری زبان سے عدم واقفیت کو ڈاکٹر صاحب نے اردو کی غیر یقینی صورت حال کا ذمہ دار قرار دیا ہے ۔ مسعود صاحب نے اردو والوں کو تہذیبی اقدار کے سمجھنے کی ضرورت پر زور دیا ہے ۔وہ لکھتے ہیں ۔

"جب کسی سیاسی انقلاب کے تحت کوئی جماعت اپنی زبان کے ترک پر مجبور ہوجاتی ہے تو اس کی تہذیبی انفرادیت ختم ہونے لگتی ہے اور تخلیقی اعتبار سے وہ مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے ۔" (۵)

اپنے ان مضامین کے بارے میں خود مسعود صاحب لکھتے ہیں کہ ہماری زبان کے اداریوں نے انھیں اردو داں طبقے میں بہ حیثیت صحافی متعارف کروایا۔ان میں سے بیش تر اداریوں پر استاد محترم رشید احمد صدیقی صاحب کی داد ملتی تھی ۔ہر اداریہ پر رشید صاحب ایک خط ضرور لکھتے تھے جس میں حوصلہ افزائی اور پذیرائی شامل ہوتی تھی ۔ مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

"میں ان کی حوصلہ افزائی کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتا اور میرے قلم

کو مہمیز ملتی ۔" (۶)

اردو کا المیہ آزادی ہند کے بعد اردو کے زوال کی داستان سے شروع ہوتا ہے اور یہ مضامین ایک تحریک کی صورت اختیار کرنے لگتے ہیں ۔ مفتی عتیق الرحمن نے ان مضامین پر ایک فقرہ کہا تھا" ان سے اردو کی تحریک چل پڑی ہے ۔" ان میں بعض ایسے مضامین ہیں جن کی صورت حال آج کے دور میں بدل چکی ہے ۔

جس زمانے میں گاندھی جی "ہندوستانی" کے بارے میں سوچ رہے تھے اور بالآخر فیصلہ دے دیا تھا اس زمانے میں ذاکر حسین صاحب کے ہم عصروں نے یہ سب دیکھا اور سنا تھا ۔ ان کے گھر میں اردو کی تباہی کے آغاز کے چرچے تھے ۔ مسعود صاحب کے لیے یہ سب دیدہ و شنیدہ تھا ہی مگر ان کے مطالعہ نے فکر انگیز نتائج اس سے اخذ کیے مہاتما گاندھی ہی نے اردو اور ہندی میں خط فاصل قائم کیا تھا اور ان دونوں زبانوں کو ایک زبان قرار دینے کی تجویز کو ایک بے کارسی حقیقت بتلایا تھا ۔ اردو رسم الخط کا جہاں تک تعلق ہے اب اس سائنسی دور میں کئی ایک تبدیلیاں ہو چکی ہیں ۔ اب اردو کا ٹائپ رائٹر ہی نہیں بلکہ کمپیوٹر کا بھی عام رواج ہو چکا ہے اور اب ہمارے ملک میں کتب اور اخبارات وغیرہ کمپیوٹر سے چھپنے لگے ہیں ۔

جن ریاستوں میں اردو کا مستقبل تاریک ہو گیا تھا ، اردو کے قدم ڈگمگانے لگے تھے اب یہ لڑکھڑاتے قدم جمنے لگے ہیں ۔ مختلف ریاستوں میں اردو کے بجھتے ہوئے چراغ روشن ہونے لگے ہیں ۔

" مضمون وعدوں کا موسم " اردو کے سیاسی استحصال کی جانب رجوع کرتا ہے اردو کو الیکشن کے وقت سیاسی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے ۔ اس کے لیے وعدے ہوتے ہیں اور بعد الکشن کے سب ختم ہو جاتے ہیں ۔ اردو کے حق کے بارے میں مسعود صاحب کے خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے اعجاز علی ارشد نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے ۔

"اردو میں غیر معیاری ہندی آمیز زبان کی آمیزش کے سبب اردو کی لا مرکزیت کا جو دور شروع ہو گیا ہے وہ کب اور کہاں ختم ہوگا مسعود صاحب جیسے بالغ نظر کے لیے مناسب نہ تھا وقت نے ان سوالوں کا جواب دینا شروع کر دیا ہے۔ اردو کے تعلق سے جو مایوس کن فضا ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں نظر آئی تھی وہ اب موجود نہیں ہے۔" (۷)

فاضل مضمون نگار نے مکمل جائزہ کے بغیر ہی تنقید کی ہے۔ صرف ایک ریاست میں اردو کا جائز مقام مل جانا کافی نہیں اور وہ بھی آئینی حق کے تحت جب کہ دوسرے شعبوں میں اس کا کوئی قومی کردار نہیں۔ آج ہماری تحریکیں چلتی ہیں اور اکیڈیمیاں بنتی ہیں لیکن عملی اعتبار سے ہمارا لسانی اور تہذیبی ورثہ ختم ہو رہا ہے۔ مسعود صاحب نے جہاں ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء کی تجاویز، مسائل اور مستقبل کے بارے میں اظہار خیال کیا تھا وہی بات ۱۹۸۸ء میں کے خطبہ میں بھی پیش کی ہے اور یہ آج بھی حقیقت بنی ہوئی ہے۔

امرت رائے کے بیان کی روشنی میں گیان چند جین نے اردو کو ہندی کا دوسرا روپ کہا ہے۔ اپنی کتاب لسانی مطالعے میں وہ لکھتے ہیں:

"کھڑی بولی کے دونوں روپوں کا ادب اور لسانی سرمایہ اتنا مختلف ہو گیا ہے کہ انھیں دو زبانیں نہ ماننا حقیقت کی جانب سے آنکھیں موند لینا ہے۔" (۸)

مسعود صاحب کو اس بات پر اعتراض ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو اور ہندی دو الگ زبانیں ہیں۔ جب کہ گیان چند جین ایک ہی زبان کہتے ہیں اور ایک سکے کے دو رخ بتاتے ہیں۔ انھوں نے تقسیم ہند سے قبل کی مثال دے کر بتایا ہے کہ آزادی سے قبل مردم شماری میں مادری زبان کے خانے میں اردو اور ہندی کا الگ خانہ نہیں ہوتا تھا بلکہ صرف ہندوستانی ہی لکھا جاتا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو سے خبریں بھی صرف

ہندوستانی میں نشر ہوتی تھیں۔ گیان چند جین نے نہ صرف اپنی بات منوانے یا امرت رائے کے بیان کی روشنی میں مختلف دلائل پیش کیے ہیں۔ جہاں تک اردو اور ہندی کی بات آج کے دور میں کی جارہی ہے وہ آزاد ہندوستان کے جمہوری دستور کی روشنی میں ہے جبکہ جین صاحب نے ہندوستانی کی بابت جو لکھا ہے وہ تقسیم ہند کے پہلے کی بات ہے۔ تقسیم ہند کے بعد دستور ہند کے آٹھویں شیڈول میں دفعہ ۳۴۵ اور ۳۴۷ کے تحت زبانوں کے موقف کو واضح کیا گیا ہے۔ دفعہ ۳۴۷ میں علاقائی زبانوں کے موقف کی وضاحت کی گئی ہے جب کہ دفعہ ۳۴۵ کے سرکاری زبانوں کے موقف پر مبنی ہے۔

دستور ہند کے آرٹیکل ۳۴۵ کے بارے میں مسعود صاحب کی بحث کے سامنے اردو کے موقف کے بارے میں امرت رائے ہو کہ گیان چند جین کے اعتراضات بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے اعتراضات صرف لسانی پرخاش معلوم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ گیان چند جین خود لکھتے ہیں۔

> "واضح ہو کہ تقسیم ملک سے پہلے کی کسی مردم شماری میں اردو اور ہندی کو الگ زبانوں کے طور پر درج نہیں کیا۔ ان کے بجائے "ہندوستانی" کا رواج ہوتا تھا۔ تقسیم ملک سے پہلے کی نسل کو یاد ہوگا کہ ۱۹۴۷ء تک آل انڈیا ریڈیو سے صرف ہندوستانی میں خبریں نشر ہوتی تھیں اردو یا ہندی میں نہیں۔ قانونی طور پر آزاد ہند کے آئین نے ہندوستانی کو ختم کر کے اردو اور ہندی کو دو الگ الگ حیثیت دی۔" (۹)

"جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں۔" یہ فقرہ مسعود صاحب نے ضرب المثل کے طور پر امرت رائے کے سلسلے میں لکھا تھا لیکن گیان چند جین نے اپنے پر قیاس کیا اور کہنے لگے کہ "امرت رائے تو ہندی والے ہیں اور ہندی کا کھاتے ہیں

جب کہ میں اردو کا کھاتا ہوں۔" گیان چند جین نے اپنے اس جملہ سے یہ تو اعتراف کیا ہے کہ وہ اردو کا کھاتے ہیں ہندی کا نہیں ایسی صورت میں مندرجہ بالا بیان کیوں کر درست ہوگا کہ اردو اور ہندی ایک ہیں۔ نہ یہ لسانی حقیقت ہے اور نہ تہذیبی۔ مسعود صاحب کا طرزِ تحریر نہایت واضح و شفاف ہے تاہم وہ بعض اوقات وہ اشارے و کنایے سے بھی کام لیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ اشارے کنایے کبھی کبھی "چور کی داڑھی میں تنکا" والی بات ہو کر رہ جاتے ہیں جب کہ ان کا ہدف کوئی اور ہوتا ہے۔

"اردو کا المیہ" میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جس کو مسعود صاحب نے گودان (پریم چند) کے سلسلے میں چھیڑا تھا۔ انھوں نے جو نکتہ اٹھایا ہے وہ پریم چند کے محققین کے لیے ایک نیا موضوع فراہم کرتا ہے۔

گودان کے متعلق پہلا مضمون ہماری زبان انجمن ترقی اردو ہند میں ۱۵/ دسمبر ۱۹۷۰ء کو شائع ہوا۔ جس میں گودان یا گئودان کی بحث اٹھائی گئی اس کے بعد اردو ہندی کے ادیبوں نے اس موضوع پر توجہ کی۔ ۲۲/ جنوری ۱۹۷۱ء ہماری زبان میں ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی نے سحر ہنگامی کے بارے میں ایک مضمون شائع کیا۔ پریم چند کے اردو مترجم "سحر ہنگامی" تھے۔ ۱۱/ ستمبر ۱۹۳۱ء کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب یہ ثابت کرتے ہیں کہ پریم چند اپنے ناول اور افسانے اپنے دوست اقبال بہادر ورما "سحر ہنگامی" سے کرواتے رہے ہیں جس کا انھیں باضابطہ معاوضہ بھی دیا جاتا تھا۔ پریم چند کے ایک خط سے جو انھوں نے مدیر "زمانہ" کو لکھا ہے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ پریم چند نے اپنے ناول گودان کے اردو ترجمہ کے لیے گئودان نام پسند کیا۔ گئودان سنسکرت گودان کی پراکرت ہے اردو میں گودان کو نظرانداز کرنے کی اصل وجہ ذم کا پہلو تھا جو اس لفظ سے نکلتا ہے۔

مسعود صاحب نے یہ بحث اس وقت اٹھائی تھی جب کہ ڈاکٹر جعفر رضا کا

مقالہ ۔ پریم چند اور تعمیر فن " ابھی منظر عام پر نہیں آیا تھا ۔ ۱۹۷۷ء میں یہ مقالہ منظر عام پر آیا لیکن انھوں نے دیانرائن نگم مسعود صاحب اور " سحر ہنگامی " سب کے بیانات سے اختلاف کرتے ہوئے اس ناول کو گودان اور گئوُدان ناموں سے یاد کیا ہے اور لکھا تھا کہ گودان کا مسودہ پریم چند نے زندگی ہی میں تیار کر لیا تھا۔

۱۹۷۹ء میں پریم چند صدی کے موقع پر بھوپال میں ایک سیمینار منعقد کیا گیا تھا مدھیہ پردیش اردو اکیڈیمی (۱۹۷۹ء) کے اس سیمینار میں مسعود حسین خاں اور جعفر رضا اور پریم چند کے بیٹے امرت رائے بھی موجود تھے ۔ گودان اور گئوُدان پر مسعود صاحب اور جعفر رضا صاحب کے مقالے اور بحثوں کو انھوں نے بھی بغور دلچسپی سنا۔ اس کے بعد اس موضوع پر بہت سے پرستاران پریم چند نے تحقیق کی ۔ اسی عرصہ میں انھیں ڈاکٹر حامد حسین کی معرفت عبدالقوی دسنوی کے ذخیرہ کا ایک خط ملا تھا جو ڈاکٹر صاحب کے لیے اپنے بیان کی تائید میں داخلی شہادت ثابت ہوا۔ اس میں ۱۹۳۷ء کے شمارے کی چند علمی خبروں کا نوٹ تھا جو گودان سے متعلق تھا۔

> " منشی صاحب کے قریب قریب تمام قصے اور ناول اردو زبان میں منتقل ہو چکے ہیں ۔ البتہ ان کا آخری ناول " گئوُدان " جو ان کی وفات سے چند ہفتے پہلے شائع ہوا ہے ابھی تک اردو میں منتقل نہیں ہوا ہے مسز پریم چند اور ان کے صاحبزادے اس کو اردو میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس کے لیے اڈیٹر زمانہ کی معرفت لائق مترجم کی تلاش میں ہیں جو صاحب اس خدمت کو اپنے ذمہ لینا پسند کریں وہ ایڈیٹر زمانہ کانپور کو اپنی شرائط سے مطلع کریں ۔" (۱۰)

اس خط کی بنا پر مسعود صاحب نے یہ ثابت کیا کہ گئوُدان پریم چند کا اردو ناول نہیں بلکہ اس کی حیثیت اردو ترجمہ کی سی ہے ۔ جب کہ جعفر رضا نے اپنے جدید ایڈیشن " پریم چند فن اور تعمیر فن " میں پھر بھی قدیم رائے ہی کو مقدم رکھا ۔ یہ علمی

ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہیں ۔ یہ رویہ اردو کے ادیبوں میں اس وجہ سے پیدا ہوا کہ پریم چند کا شاہکار ان کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے ۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے پریم چند صدی کے ایک سمینار میں جو علی گڑھ میں منعقد ہوا تھا ، مسعود حسین خاں سے درمندانہ لہجہ میں اپیل کرتے ہوئے کہا تھا کہ "آپ نے پریم چند صدی کے سمینار میں پریم چند کو تحقیق کے کٹھیرے میں لا کھڑا کیا ہے ۔"

پریم چند نے چند اور داخلی حوالوں کی روشنی میں " گوشہ عافیت " چوگان ہستی " میدان عمل کو ہندی کے ترجمہ ناول بتاتے ہیں جس پر گیان چند کو اعتراض ہے ۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب ہندی کی بات چلتی ہے تو گیان چند کہتے ہیں کہ اردو اور ہندی ایک سکہ کے دو رخ ہیں اور جب اس کے اردو ترجمہ کی بات چلتی ہے تو وہ کہتے ہیں اردو کے خزانے میں سے ایک ناول کو کم کیا جارہا ہے ۔ انھوں نے طویل بحث غافل انصاری ، قمر رئیس اور جعفر رضا کے مقالات کی روشنی میں کی ہے:

" مسعود صاحب اردو کے بڑے وکیل ہیں ۔ انھوں نے پریم چند کے ناولوں کے بارے میں جو انکشاف کیا وہ ان کا اکتساب ہے لیکن انھیں اردو ادب سے خارج کرتے وقت ان کے انداز بیان سے کسی احساس زیان کسی تاسف کا اندازہ نہیں ہوتا اسلیے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لپنے نتائج پر بڑی کامرانی اور طمانیت محسوس کر رہے ہیں ۔ ان کے لہجے کی تندی اور قطعیت اس کی شاہد ہے ۔" (۱۱)

ان طویل مضامین کو ایک مقالہ کی شکل میں مسعود صاحب نے مقالات مسعود میں گودان تا گئودان کے عنوان سے شامل کیا ہے ۔ اور دعوے سے یہ لکھتے ہیں ۔

" گوشۂ عافیت ، چوگان ہستی اور گئودان اردو میں حضرت سحر کے کیے ہوئے ترجمے ہیں ۔ ان کا یہ دعوی کہ میدان عمل اور نرملا اور

بہت سے قصوں کا اردو قالب میں انھیں کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں

کوئی وجہ نہیں کہ غلط ہو۔" (۱۲)

آخر میں یہ تشریح کرتے ہیں کہ گودان کے سوا باقی تمام ناول اور افسانے پریم چند کی زندگی میں شائع ہوئے ان کے مسودات پر پریم چند نے نظرثانی کی ہوگی لیکن گئودان کو تو یہ سعادت بھی نصیب نہیں ہوئی۔

==========

اردو کا المیہ

۱۔ مرزا خلیل احمد بیگ۔ نذر مسعود۔ ص ۳۴۸

۲۔ رشید احمد صدیقی۔ رقعات رشید۔ مرتبہ مسعود حسین خاں۔ ص ۲۵۷

۳۔ سرینواس لاہوٹی۔ ۷/ نومبر ۱۹۹۱ء۔ بمقام اردو ریسرچ سنٹر حیدرآباد۔

۴۔ اعجاز علی ارشد۔ نذر مسعود۔ ص ۳۵۰

۵۔ مسعود حسین خاں۔ ورود مسعود۔ ص ۲۵۰

۶۔ مسعود حسین خاں۔ ورود مسعود۔ ص ۲۱۰

۷۔ اعجاز علی ارشد۔ نذر مسعود۔ ص ۳۴۸

۸۔ گیان چند جین۔ لسانی مطالعے۔ ص ۳۰۴

۹۔ گیان چند جین۔ پرکھ اور پہچان۔ ص ۲۷۸

۱۰۔ مسعود حسین خاں۔ مقالات مسعود۔ ص ۲۰۴

۱۱۔ گیان چند جین۔ "ڈاکٹر مسعود حسین خاں بہ حیثیت ادبی محقق" مشمولہ نذر۔ مسعود صفحہ نمبر ۱۵۶

۱۲۔ مسعود حسین خاں۔ گودان تا گئودان۔ مشمولہ مقالات مسعود۔ صفحہ نمبر ۲۰۸

صوتیات

اردو میں صوتیات پر عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ابتدائی کام کیا تھا۔ اس کے بعد سے توضیحی لسانیات کے موضوع کے لحاظ سے صوتیات پر کام کرنے والوں کا سلسلہ چل پڑا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں، ماہرین لسانیات میں اس وقت سرفہرست کے محقق کہلاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی لسانی تحقیق میں توضیحی لسانیات کو اولیت دی اور لسانی تحقیق کے ساتھ ساتھ صوتیات اور اسلوبیات کو بھی مدنظر رکھا۔

وہ ۱۹۵۰ء میں جب انگلستان کو بغرض تحقیق گئے تو انھوں نے صوتیات کو موضوع تحقیق بنایا۔ انگریزی میں ایک تحقیقی مقالہ

A phonetic And phonalogical study of the word in Urdu

لکھا جو بعد میں مسعود صاحب کے شاگرد مرزا خلیل احمد بیگ نے ایک مختصر مفید مقدمہ کے ساتھ اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ "اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ ۱۹۸۶ء میں علاحدہ کتابی شکل میں شائع ہوا۔ پہلی بار یہ مقالہ علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات کی جانب سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کرپا شنکر نے Reading in Hindi , Urdu Linguestic میں "ہندی اردو لسانیات" کے عنوان سے شائع کیا۔ مسعود صاحب اپنے شاگرد عزیز کی اس علمی کاوش کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "آپ نے ترجمہ بڑی محنت سے اور عمدہ کیا ہے۔ دراصل اس پمفلٹ کا ترجمہ آپ ہی کر سکتے تھے۔" (۱)

اس کے بعد یہی مضمون "مقالات مسعود" انجمن ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۹ء کے

مجموعہ میں "اردو لفظ کا صوتی و تجز صوتیاتی تجزیہ" کے عنوان سے شائع ہوا۔

اس مقالہ میں مسعود صاحب نے اردو کے الفاظ کا صوتی تجزیہ، عروضی تجزیہ صوتیات کے نظریہ کی بنیاد پر کیا ہے۔ اصل مقالہ کتابی شکل میں ۶۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ جب کہ مقالات مسعود میں ۴۷ صفحات ہیں۔ صفحات کی سائز ایک ہی ہے۔ صرف طباعت میں کچھ فرق ہے۔

مسعود حسین خاں کی شخصیت اردو کے بحر ذخار میں ایک ایسے غوطہ زن کی ہے جس کو اندروں سمندر کی ہر شئے کے بارے میں علم رہتا ہے اور وہ اس کی حقیقت سے شناسا بھی رہتا ہے۔ اردو کے ہر موضوع پر تحقیق، تنقید، شاعری، دکنیات، اسلوبیات، لسانیات، ادبیات اور صوتیات و لغت نویسی سب میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے۔

اردو میں صوتیاتی جائزہ لینے والے محققین میں ابتدائی چند محققین کے نام ملتے ہیں۔ ان میں سے مسعود صاحب ایک ہیں۔ لسانیات، صوتیات اور اسلوبیات ان کے خاص موضوع رہے ہیں اسی لیے وہ اردو دنیا میں ماہر لسانیات کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

اردو صوتیات پر سب سے پہلے ڈاکٹر زور نے کام کیا۔ ہندوستانی صوتیات (Hindustani Phonetics) اردو لفظ کے صوتیاتی مطالعہ کی حیثیت سے اس موضوع پر اولین کتاب ہے۔ ابتداء میں قواعد نویسوں نے صوتیات پر سطحی انداز میں غور ضرور کیا لیکن اس علم کی سائنٹیفک انداز میں ترقی بیسویں صدی میں ہوئی۔

علم صوتیات (Phonetics) تکلمی آوازوں کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ صوتیات کا سائنس سے بھی رشتہ ہوتا ہے۔ مسعود صاحب نے اس تصنیف میں صوتیاتی مطالعہ، لفظ کی تعریف اور حد بندی سے شروع کیا ہے۔ لفظ کے تعین کے اصول کے بعد رکن اور صوتیاتی ساخت پر روشنی ڈالی ہے۔ زبان مختلف رصوان کے

فطری ربط اور مفہوم کی کی مطابقت سے پر ہوتی ہے۔ماہرین لسانیات نے واضح کر دیا ہے کہ لسانی اصوات کافی حد تک اپنے مفہوم کی خود عکاسی کرتی ہیں۔ان میں معنی کا فطری مفہوم وارتباط ہوتا ہے۔

"اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ پروفیسر مسعود حسین کا گراں قدر علمی کارنامہ ہے۔لسانیات بالخصوص توضیحی لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔" (۲)

لسانی تحقیق کے لیے صوتی تجزیہ ضروری ہوتا ہے۔صوت کے متعلق شوکت سبزداری کا کہنا ہے:

"آوازیں دو طرح کی ہیں کچھ منہ میں محض ہوا کی سرسراہٹ سے پیدا ہوتی ہیں۔یہ حرکات و علل کہلاتی ہیں۔ کچھ زبان اور منہ کے دو حصوں کے باہم ٹکرانے سے وجود میں آتی ہیں۔انھیں حروف صحیح کہتے ہیں۔ان دونوں قسم کی آوازوں کے خاص مقام ہیں جو اصطلاح میں "مخارج" کہلاتے ہیں۔ان کی تشریح و تفصیل کا تعلق صوتیات سے ہے۔" (۳)

زبان کا آغاز وارتقا جاننے کے لیے آواز کی تاریخ جاننا ضروری ہے۔لفظوں میں تبدیلی کے کچھ اسباب ہیں جس میں زمانہ اور حالات کو خاص دخل ہوتا ہے۔
جیسے چلنا سے چلوں یا چلے گا۔

اردو صوتیات کا علم محدود ہے۔اب تک تلفظی صوتیات پر ہی تحقیق کی گئی ہے۔نذیر احمد ملک لکھتے ہیں:

"اردو کی تمام تر صوتیاتی تحقیق، تلفظی صوتیات تک ہی محدود ہے۔ اس ضمن میں صرف چند گنے چنے محققین ہی نے خامہ فرسائی کی ہے۔ جن میں سید محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری، پروفیسر

مسعود حسین خاں، گیان چند جین، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر خلیل بیگ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔" (۴)

فاضل مضمون نگار نے کئی ایک صوتیاتی محققین کے نام نظر انداز کر دیے ہیں۔ کیوں کہ ان کا ذکر کسی بھی شمار میں نہیں جب کہ صوتیات کے لحاظ سے پہلا تحقیقی مقالہ ابوالحسن خاں متین کا ہے جس کا عنوان ہے "اردو میں علم ہجا" (۵) اس کا ذکر کہیں بھی نہیں ملتا یہ عبدالقادر سروری کے علم زبان سے بھی قدیم ہے۔

یہاں مسعود صاحب کی صوتی تحقیق سے سروکار ہے۔ انھوں نے صوتی تحقیق کا جائزہ لیتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ صوتیاتی نقطہ نظر سے اردو ایک ہندوستانی زبان ہے۔ ہر زبان کا ایک صوتیاتی نظام ہوتا ہے۔ کسی بھی صوتی نظام کے ارتقا کا جائزہ لینے کے لیے تاریخی لسانیات کی نشاندہی نیز اس کا تفصیلی جائزہ ضروری ہے۔ کیوں کہ حرف و صوت کا باہمی تعلق بہت دیر میں واضح ہوتا ہے۔

مسعود صاحب نے صوتیاتی نقطۂ نظر سے زبان کی آوازوں کو دو خاص شعبوں میں تقسیم کیا ہے جیسے کہ اور لسانی محققین نے کیا ہے۔

۱۔ مصوتے (Vowels) ۲۔ مصمتے (Consonents)

اس مقالے میں مسعود صاحب نے مصوتوں کو بین الاقوامی صوتی رسم الخط کے زاویہ نظر سے جانچا اور خاکوں کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ اردو مصوتوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ خالص ہند آریائی ہیں۔ اس سے قبل ڈاکٹر زور اور عبدالقادر سروری نے بھی صوتیات پر تحقیق کی تھی لیکن مسعود صاحب کا نظریہ اپنی نوعیت کا پہلا نمونہ ہے۔

"پروفیسر مسعود حسین کی یہ تصنیف اردو الفاظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ و تجزیہ عروضی نقطۂ نظر سے پیش کرتی ہے۔ اردو الفاظ کے اس قسم کے مطالعے اور تجزیہ کی یہ پہلی کوشش ہے۔" (۶)

مسعود صاحب نے لسانیات کی پہلی سطح کو صوتیات کہا ہے جبکہ گیان چند جین صوتیات کو تجزیاتی لسانیات کا ایک شعبہ بتاتے ہیں۔

"لسانیات کی جدید شاخ تجزیاتی لسانیات ہے۔ جس کا اہم ترین شعبہ صوتیات ہے۔" (۷)

اعضائے نطق کا تفصیلی مطالعہ صوتیات ہی کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس علم کا تعلق تشریح اعضا سے ہوتا ہے۔ صوتیات کا بیش تر تعلق طبیعات سے ہے۔ صحیح تلفظ کی ادائیگی یا اہل زبان کی نوعیت کا دار و مدار صوتیات پر ہی ہوتا ہے۔

مسعود صاحب نے ہند آریائی لسانی روایت کے مطابق اردو کے مصوتے دیوناگری رسم الخط میں ۸ بتائے ہیں۔ گیان چند جین کا خیال ہے کہ اردو میں ہندی سے مشترک دس مصوتے معروف ہیں۔ مسعود صاحب نے ان کو ماتراؤں کی شکل میں پیش کیا ہے۔

ان مصوتوں کو محققین میں سے بعض نے مرکب مصوتہ اور بعض نے واحد مصوتہ کا درجہ دیا ہے۔ ڈاکٹر شیام سندر داس بھاشا گیان میں ڈاکٹر دھریندر ورمانے ہندی بھاشا کے اتہاس میں ان کو جڑواں مصوتے کہا ہے۔

ڈاکٹر زور ہندوستانی صوتیات (Hindustani Phoetics) میں اے ए کو واحد اور آو औ کو جڑواں مصوتہ بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر گراہم بیلی کے نظریہ میں اردو میں یہ دونوں مصوتے واحد ہی استعمال ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار ہی انھیں جڑواں پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ ان میں خفیف اور طویل صوتی حرکت ہوتی ہے۔

مسعود صاحب نے اپنے صوتیاتی خاکہ میں جو اردوئے معلیٰ کے لسانیات نمبر میں شامل ہے اردو کے مصمتے (۳۷) (۸) بتائے ہیں اور ان مصوتوں کی تشریح کی ہے

جو عربی سے لیے گئے ہیں ۔ب، ھ، ر ہر مہمل ہو جاتے ہیں یا قریب المخرج صوتے میں ضم ہو جاتے ہیں ۔ان کی بھی تشریح کی ہے۔

ذ، ض، معلوم، مالوم، عرب، ارب وغیرہ

گیان چند جین نے اردو کے پانچ خاکوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک علاحدہ خاکہ بنایا ہے جو مسعود حسین خاں کے پیش کردہ اردو کے مصوتی خاکے سے تھوڑا بہت مختلف ہے ۔ مسعود حسین خاں "ل" کو دندانی مصوتہ لکھتے ہیں جبکہ گیان چند جین اسکو لثوی کہتے ہیں ۔

"ف" کو مسعود صاحب دولبی بتاتے ہیں اور گیان چند جین لب دندانی ۔ گوپی چند نارنگ اس کی تائید میں ہیں ۔ گیان چند جین نے صوتی تجزیہ میں اردو کے مصوتوں کی تعداد سولہ (۱۶) بتائی ہے ۔ان میں بارہ (۱۲) صوتیوں کا درجہ رکھتے ہیں ۔

مسعود حسین خاں نے بعد کی تحقیق میں اردو کے دس مصوتوں پر زور دیا ہے ۔توضیحی لسانیات میں انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

> "زبان کا بالکل اقلی عنصر ہونے کی وجہ سے لفظ کو ایک روایتی استحکام بھی حاصل ہے چوں کہ اردو دانی ان معنوں میں ایک مخلوط زبان ہے ۔ اس میں عربی اور فارسی لفظ کی حد بندی کا ایک درست اور برجستہ انداز رہتا ہے جب وہ اپنے رسم الخط میں دو لفظوں کا فاصلہ دے کر ظاہر کرتے ہیں ۔" (۹)

مسعود حسین خاں نے اپنے اس خاکہ اور صوتیاتی تجزیہ میں رکن کی ابتدا اور آخر میں وقوع پذیر ہونے والے تمام مصوتوں کی تفصیل کو واضح کیا ہے ۔ انفیت، معکوسیت، ہائیت، مسموعیت، ہی کو اردو کی ممیز صوتی خصوصیات بتایا ہے ۔

غنائی ، خشکی ، معکوسی ، وندانی اور دولبی آوازوں سے قبل اگر لثوی ، انفی ، بندشی مصمتے / ن / آجائیں تو ہم مخرج ہو جاتے ہیں ۔ کسی بھی زبان کا لسانی مطالعہ

بنیادی اہمیت رکھتا ہے جو صوتی تجزیہ کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ماہرین لسانیات نے ہماری تاریخی لسانیات پر باوجود تنگ دامنی کے بہت کچھ لکھا ہے۔لیکن توضیحی لسانیات کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔جبکہ اس کے بغیر کوئی بھی محقق لسانیاتی مطالعہ کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔

"کسی زبان کے لسانی مطالعوں کے سلسلے میں صوتی تجزیہ ہی بنیادی اہمیت رکھتا ہے جب تک ہم زبان کا صوتی مطالعہ نہ کریں زبان کے دیگر پہلو پر کام نہیں ہو سکتا۔اس لیے کہ آواز ہی سے زبان وجود میں آتی ہے۔صرف Morphalogical مطالعہ میں بھی قدم قدم پر صوتی خصوصیات ہی کے تعین کے بغیر ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔" (۱۰)

مسعود حسین خان نے اپنے صوتی تجز کو جے۔آر فرتھ (۱۱) کے نظریات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔فرتھ کو مشرقی زبانوں سے گہرا لگاؤ تھا۔صوتیاتی تجز کے نظریہ کو اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز (School of oriental and African Studies London University) میں پروفیسر فرتھ کی رہنمائی میں باقاعدہ حیثیت دی گئی۔مسعود حسین خاں قیام لندن کے دوران پروفیسر فرتھ کی تحریروں سے زیادہ متاثر ہوئے۔اس سلسلے میں عروضی تجز اور صوتیات Prosodic Phonology کے نظریے سے بھی استفادہ کیا۔

زبان کی دو بڑی شاخیں ہیں۔بسیط آوازیں جن سے معنی الفاظ بنتے ہیں اور آوازوں کی ترکیبیں بسیط آوازوں کا علم ہے صوتیات لسانیات کے شعبہ میں علم الاصوات (صوتیات) میں بسیط آوازوں سے بڑی جامع اور عمیق اور عام طور سے تین طرف سے بحث کی جاتی ہے۔تشریحی، تاریخی اور تقابلی نثری بحث میں آوازوں کے مخارج، تلفظ اور صفات کی وضاحت کی جاتی ہے۔اور ہر آواز کی تاریخ دی

جاتی ہے اور دوسری زبانوں سے مقابلے کے بعد اس کے مختلف
ارتقائی آوازوں کی صورت میں لایا جاتا ہے۔" (۱۲)

مسعود حسین خاں نے لفظ کی تعریف، حد بندی صوت رکن کی صوتیاتی اور تجز صوتیاتی ساخت کا مطالعہ اردو لفظوں میں انفیت اور معکوسیت کے مسائل سے بحث کرنے کے بعد کمیت کی عروضیات (Prosodies of quantity) او مربوطے کی عروضیات (Prosodies of function) کا بھی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔

" کمیت عروضیات اور مربوطے کی عروضیات سے متعلق مسعود صاحب کا مطالعہ بہت گہرا ہے اور وسیع ہے۔ صوتی امتیاز (Prominence) پر بھی انھوں نے اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ مربوطے کی عروضیات کی ضمن میں مصوتی تسلسل (Vowels of sequence) بین مصوتی تداخل (anaptyxis) تشدید (Gemination) ہائیت (aspiration) اور مسموعیت کی عروضیات سے کافی تفصیل اور باریک بینی کے ساتھ بحث کی ہے۔" (۱۳)

اس بحث میں مسعود حسین خاں نے اردو میں دو انفی مصوتے / ن / اور / م کا بھی حوالہ دیا ہے۔ یہ مصمتے حال میں ابتدائی وسط اور آخر میں پائے جاتے ہیں۔ مرزا خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں کہ صوتیاتی امتیاز سے متعلق مسعود صاحب کا نظریہ اردو میں ممیز نہیں لیکن پھر بھی انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ ایک سے زیادہ صوت ارکان پر مشتمل الفاظ میں کوئی رکن ایسا ضرور ہوتا ہے جو تمام صوتی رکن سے زیادہ صوتی امتیاز رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں ہر ایک صوت کے تحت مسعود حسین خاں نے صوتی امتیاز کے کئی اصول بتائے ہیں۔

ہائیت کے متعلق انھوں نے ٹھوس صوتیاتی بنیادوں پر اپنا نظریہ پیش کیا ہے ہائیت کو انھوں نے چند ٹھوس دلائل کی روشنی میں عروضی خصوصیت قرار دیا ہے۔

تشدید کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ برج بھاشا، اودھی اور فارسی کے زیر اثر اردو میں آئی لیکن یہاں پنجابی اور راجستھانی بولیوں کی طرح تشدید نہیں ہے۔ گو کہ یہ نظریہ فرتھ کے نظریے کی بنیاد پر ہے لیکن مسعود حسین خاں نے باریک بینی اور جامعیت و ژرف نگاہی سے اس میں وسعت پیدا کر دی ہے۔

"عروض کا تصور اگر چہ مسعود صاحب نے فرتھ سے لیا لیکن اردو کے تعلق سے اس نظریہ میں انھوں نے جو جامعیت اور وسعت پیدا کی ہے وہ ان کا اپنا کارنامہ ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اردو لفظوں کا اس نظریہ سے مطالعہ اور اس اعلیٰ معیار کا تجزیہ آج تک کسی عالم نے پیش نہیں کیا۔ اردو زبان میں اس قسم کے علمی مطالعات کا جو فقدان پایا جاتا ہے وہ اس تجربے سے کافی حد تک دور ہوگا اور ایک علمی خزانہ جو کافی عرصہ سے انگریزی زبان میں دفن تھا اس سے اردو داں طبقے کو بھی فیضیاب ہونے کا موقع ملے گا۔" (۱۴)

مسعود حسین خاں نے توضیحی لسانیات کی روشنی میں لسانیات کے ہر پہلو قواعد نویسی، عروض و بلاغت کے اصولوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ کیوں کہ موجودہ دور میں لسانی مسائل کے جائزہ کے لیے مندرجہ بالا اصولوں کا ہونا ضروری ہے۔

"آج لسانیات کی ہر سطح صوتیات صرف و نحو و معنیات پر چامسکی کا نظریہ اثر انداز ہو رہا ہے۔" (۱۵)

چامسکی کی معرکتہ الآرا تصنیف Synthetic Structure ۱۹۵۶ء میں جب شائع ہوئی تو جدید لسانیات کی دنیا ہی بدل گئی۔ نیز لسانیات کے موضوع پر

تحقیق کرنے والوں کے لیے نئے اصول وضوابط کے ساتھ نئی راہیں بھی ہموار ہوئیں۔

صوتی ہیئت کا معنیاتی، اسلوبیاتی اور داخلی رشتہ صنف غزل سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ طویل مصوتے گہرے اور سنجیدہ جذبات و احساسات کی عکاسی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ چناں چہ شاعری میں جب درد کا احساس بہت زیادہ ہوتا ہے تو مصوتے طویل صورت اختیار کرلیتے ہیں۔

اردو زبان، تاریخ، تشکیل، تقدیر،

۱۹۸۷ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مسعود حسین خاں کو ان کے علمی خدمات کے اعتراف میں پروفیسر ایمیرٹیس کا اعزاز عطا کیا۔ اس وقت انھوں نے ۱۳/ جنوری ۱۹۸۸ء کو علی گڑھ یونیورسٹی میں بہ عنوان "اردو زبان، تاریخ، تشکیل، تقدیر ایک خطبہ دیا تھا۔ اس مختصر سے خطبہ میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا اور تشکیل سے لیکر موجودہ صورت حال تک لسانی مسائل و مباحث پر علمی انداز میں گہری نظر ڈالی ہے۔ یہ خطبہ کتابی شکل میں ۱۹۸۸ء میں شعبہ، لسانیات علی گڑھ کی طرف سے شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالعظیم لکھتے ہیں:

"اس وقیع خطبہ کی اشاعت سے اردو زبان کی توسیع و ترقی کا ایک نیا باب کھلے گا۔" (۱۶)

اس کتاب کی علمی حلقوں میں اچھی پذیرائی ہوئی۔ یہ کتابچہ ۳۶ صفحات پر مشتمل ہے اس خطبے میں اردو زبان کی تشکیل و ترقی کے چار ادوار کئے گئے ہیں۔

۱۔ دور اول	قدیم اردو شمال میں	۱۲۰۰ء تا ۱۴۰۰ء
۲۔ دور دوم	قدیم اردو۔ دکن میں	۱۴۰۰ء تا ۱۷۰۰ء
۳۔ دور سوم	درمیانی دور	۱۷۰۰ء تا ۱۷۵۷ء
۴۔ دور چہارم	جدید دور	۱۷۵۷ء تا حال

تاریخ کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اردو کا نقطہ آغاز مسلمانوں کے داخلہ دہلی ۱۱۹۳ء سے ہوتا ہے۔لسانیاتی اصطلاح میں اردو ایک مخلوط زبان کہلاتی ہے اس کی ابتدا کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"اس اعتبار سے اردو کی نظیر کہیں ملتی ہے تو فارسی زبان میں جس کی ہند ایرانی بنیاد پر سامی النسل عربی کی کشیدہ کاری نے کلاسیکی فارسی کو جنم دیا۔عربی کے اسی عمل کی توسیع جب فارسی کے وسیلے سے تیرھویں صدی عسوی میں ہندوستان کی ایک ہند آریائی بولی امیر خسرو کی زبان دہلی و پیرامنش، پر ہوتی ہے تو اردو وجود میں آتی ہے۔" (۱۷)

اردو کا بیج مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے ساتھ اپجنا شروع ہوتا ہے جس طرح مسلمان ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اور خطوں میں بٹتے گئے ویسے ویسے اپنے اشتراک سے اس زبان کا پودا نمو پانے لگا۔ابتدا میں دلی کے بازاروں، حصاروں اور خانقاہوں میں یہی زبان بولی کی شکل میں تشکیل پاتی رہی ۔ پھر یہی زبان گجرات پہنچتی ہے تو گجری کہلاتی ہے۔ گجرات سے اس کا سفر دکن کی طرف ہوتا ہے۔وہاں اسے دکنی کے نام سے موسوم کیا گیا۔دکن کی مراٹھی زبان کے متعلق مسعود صاحب لکھتے ہیں کہ یہ زبان ہند آریائی زبان کی ایک شاخ ہے۔اس وجہ سے مراٹھی اور دکنی اردو میں کئی سو الفاظ ایسے ملتے ہیں جن کی شناخت شمال کی ہندوی میں بآسانی کی جاسکتی ہے۔

دوسرے دور میں قدیم اردو دکنی اردو کے صوتیات، صرفی خصوصیات، اسماء، ضمائر، افعال، واحد، مذکر، جمع، مونث، واحد مونث، صفت، صوتی خصوصیات اور صرفی خصوصیات کو تفصیل سے بتاتے ہوئے جدید اردو میں ان الفاظ کی نشاندہی کی ہے۔

تیسرا دور وہ ہے جب کہ اردو زبان میں صوتیات، صرف و نحو اور کسی حد

تک لغات کے نقطہ نظر سے اپنی معیار بندی کر چکی تھی۔اس دور میں ۱۷۹۲ء میں مرزا جان طپش دہلی کی لغت، شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان، سید انشاء اللہ خاں ۱۸۰۸ء میں دریائے لطافت۔ لیکن اس کے بعد میر تقی میر، امام بخش، ناسخ نے اردو کی نوک پلک درست کی۔انیسویں صدی کے ابتدائی ۲۵ سالوں میں نذیر احمد، حالی، شبلی اور شرر نے اردو کو کل ہند معیار کی تشکیل کے سانچے میں ڈھال دیا۔فرہنگ آصفیہ، امیر اللغات اور مولوی عبدالحق کی قواعد اردو کا پہلا اڈیشن شائع ہو چکا تھا۔اس کے بعد اردو زبان کی ہمہ جہتی ترقی ہوتی رہی۔

چار ادوار میں اردو کی تشکیل کا جائزہ لیتے ہوئے مسعود حسین خان نے موجودہ حالات میں اردو زبان کی حیثیت کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے اور مردم شماری کے لحاظ سے پانچ اہم ریاستوں میں اردو کے تناسب اور مسلم آبادی کا تجزیہ کیا ہے۔ لسانیات کی تاریخ کے لحاظ سے انھوں نے واضح کیا ہے کہ:

"ہندوستان میں اردو کے سلسلے میں اہل اردو کے سامنے دونوں صورتیں موجود ہیں۔اسی کی بقا یا فنا موت ہمیشہ زندگی سے آسان ہوتی ہے لیکن

زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا۔(۱۸)

آزاد ہندوستان میں زیادتیوں کے باوجود اردو کی زندگی و تابندگی قائم ہے۔ اردو کو آٹھویں شیڈول میں پندرہ قومی زبان میں ایک زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے اور قانونی حیثیت سے دستور کی دفعہ ۳۴۵ (Act 345) کے تحت اختیار دینے کے باوجود کشمیر اور بہار کے علاوہ کسی ریاست میں بھی اس کو تسلیم نہیں کیا گیا۔اردو کو دیوناگری رسم الخط میں فروغ دینے کے نظریے کے بارے میں مسعود صاحب شدت سے مخالف ہیں اور اردو کی بقا کے لیے جس مستعدی سے کام کرنا ہے اس کے بارے میں انھوں نے خطبہ میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

"اردو کی لڑائی ہمیں دو محاذوں پر لڑنی ہوگی سیاست کے میدان میں اور اپنے گھر کے آنگن میں ۔ گھر کے آنگن کی لڑائی کو بنیادی سمجھتا ہوں اس لیے کہ کسی بھی تہذیب کی اساس میں زبان کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے ۔" (۱۹)

مسعود صاحب نے اردو کی ترقی اور تحفظ کے لیے جو بات کہی ہے وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے بنیادی اصولوں کی اساس پر ہے ۔ اس سلسلے میں اردو کے آئینی حق کو تسلیم کروانے ، اردو کے تعلیمی نظام کی از سر نو تشکیل ، ذریعہ تعلیم میں جدید انداز دینی کے ساتھ دنیوی ، اردو ذریعہ تعلیم میں دوسری ملکی اور غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کا بندوبست ، غیر ہندی علاقوں میں اردو ذریعہ تعلیم والوں کو علاقائی زبانوں کا حصول بھی لازمی قرار دیتے ہیں

مسعود صاحب کو اس بات پر اعتراض ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ اردو کے تعلق سے اس خیال کی تشہیر صرف اس لیے کی جارہی ہے تاکہ مسلمانوں کی زبان بنا کر اسے پستی کی طرف ڈھکیلا جائے ۔ اردو دشمنوں کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس زبان کے فروغ سے ہندوستان کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے ۔

"ہندوستان میں اردو کے تعلق سے یہ ذہنیت آج بھی کام کر رہی ہے اکثریت کا خیال ہے کہ اردو کو بڑھاوا دینے سے ہندوستان کی سالمیت خطرہ میں پڑ جائے گی ۔" (۲۰)

ایسی ریاستیں جہاں اردو زبان کا موقف بہتر ہے انھیں عوامی تحریک کی شکل میں اردو کے آئینی موقف کو بحال کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ۔

"اگر ہندوستان کو خاندان کی سالمیت عزیز ہے تو ہندی کے ساتھ ساتھ اور اس کے برابر اردو کی ترقی کا سامان کرنا ہی ہوگا ۔" (۲۱)

اس بیان کے آخر میں مسعود صاحب نے ظاہراً بلند بانگ دعووں اور انعامات کی فروعات میں الجھانے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

"ہماری توجہ کو بنیادی مسائل سے ہٹا کر اکیڈیمیوں نے مناسب انعامات کی فروعات میں الجھادیا ہے۔خود اردو بولنے والوں کو اس بات کا احساس نہیں رہا کہ ہم کیا کھو کر کیا پارہے ہیں۔ ہم اردو زبان کو کھو کر کیا رہ جائیں گے۔" (۲۲)

اس خطبہ میں امرت رائے کی مغالطہ آمیز متعصبانہ اور شر پسندانہ کتاب خاندان) A House Divided (منقسم کا دلائل کے ساتھ جواب دیا گیا ہے۔امرت رائے نے دعویٰ کیا ہے کہ ولی کے بعد ہندی کا گھر تقسیم ہوگیا۔دراصل وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دکن کی قدیم زبان ہندی تھی مگر اس کے بعد فارسی سے یہ الگ ہو کر ایک نئی زبان اردو کہلائی۔ورنہ وہ زبان ہندی ہوتی۔امرت رائے کا یہ بیان صرف ایک الزام ہے۔دراصل اردو زبان نے اپنی شناخت دکنی عہد ہی سے بنانی شروع کردی تھی۔فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اس کے روپ کو عربی و فارسی زبان و ادب سے خوب جلا ملی۔جیسے جیسے ہندی اثرات کم ہوتے گئے اردو فارسی کے اثرات قبول کرتی گئی۔۱۸۵۷ء تک پورے ملک کی یہ مشترکہ اور مقبول عام زبان بن گئی۔

امرت رائے کے ایسے ہی بیانات کی وجہ سے بعض ہندی والے دکنی زبان و ادب کو دکنی ہندی ادب کہتے ہیں۔یہ ایک مضحکہ خیز تصرف معلوم ہوتا ہے کیوں کہ دکنی ادب کے تمام دھارے فارسی سے آئے ہیں ہندی سے نہیں۔مثلاً دکنی عہد کی سب سے مقبول صنف مثنوی ہے جو فارسی کی دین ہے۔

۱۔ اردو صوتیات کا خاکہ

مضمون مجموعہ شعرو زبان (۱۹۶۶ء) میں شامل تھا۔یہی مضمون بعد کو مقالات

مسعود میں شامل کیا گیا۔ صوتیات کے بارے میں لسانیات کے باب میں بحث ہو چکی ہے۔ یہ مضمون مقالاتِ مسعود، مرتبہ ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی (۱۹۸۹ء) میں ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ صوتیاتی نقطہ نظر سے زبان کو مصوتوں اور مصمتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اردو کے مصوّتے خالص ہند آریائی ہیں لیکن ان میں عربی، ہندی اور فارسی کی آمیزش ملتی ہے۔ اس مناسبت سے خالص مشترک مصوتوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے بعد اردو کا مخارج کے لحاظ سے ایک جدول پیش کیا گیا ہے۔

۲۔ اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ

مسعود حسین خان کا ایک انگریزی مقالہ ہے جو پروفیسر فرتھ کے توضیحی لسانیات کے نظریے کی بنا پر لکھا گیا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات کی جانب سے انگریزی میں اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں مرزا خلیل احمد بیگ ریڈر شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بسیط مقدمہ کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع کیا۔ اس مقالے کے تمام مباحث لسانیات کے باب میں تفصیل سے آچکے ہیں۔

۳۔ قومی یکجہتی اور ہندوستانی زبانیں

پروفیسر مسعود حسین خاں کے چند مضامین ایسے بھی ہیں جن میں قومی اور عالمی سطح پر اردو کے موقف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مضمون بھی اس نوعیت کا ہے۔ اس میں اردو زبان اور اس کے ہندوستان میں سیاسی موقف و رسم الخط کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے اسی مضمون میں مسعود صاحب نے انگریزی کی تائید کرنے والوں کی مخالفت کی ہے۔

دستور کے شیڈول میں اور دفعات کی روشنی میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اردو کی تائید میں ہندی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا ہے

بلکہ وہ لکھتے ہیں:

" ہماری قومی یکجہتی کیلیے لسانی وحدت شرط اولین ہے ۔ لیکن یہاں وحدت کا تصور اپنے اندر کثرت کا پہلو رکھتا ہے ۔ جس طرح ہندی کو ایک رابطہ کی زبان کی حیثیت سے ترقی دینا از بس ضروری ہے اس طرح چھوٹی اور اقلیتوں کی زبانوں کے پھلنے پھولنے کا مکمل موقع دینا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے ۔ کثرت میں وحدت ہمارا مقدر ہے ۔ زبان کی پاسداری ہمارا ایمان ہے ۔ ہندی کی اولیت ہماری قومی ضرورت ہے ۔" (۲۳)

ہندوستان میں جب لسانی بنیاد پر تنظیم جدید یا تقسیم کی جارہی تھی اس وقت لسانی بنیاد پر علاقوں کو از سر نو تقسیم کیا گیا اس وقت علاقائی زبانوں کی اہمیت کھل کر سامنے آچکی تھی ۔ یہی علاقہ واریت (Regionalism) اور لسانیات (Linguism) ہماری قومی یکجہتی میں ہمیشہ حائل رہی ۔

ہندوستان کے ہمہ لسانی ماحول میں ہندی ایک رابطے کی زبان کا کام کر رہی ہے ۔ جنوبی ہند کی زبانوں میں ہندی سے زیادہ اردو مقبول ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"جنوب میں اردو کے گہوارے ملتے ہیں ۔"

اردو بین قومی سطح پر ہندی کی حلیف ہے نہ کہ حریف ۔ دونوں ایک شاخ کے دو پھول ہیں ۔ اردو سے جنوبی ہند میں ہندی کو مہمیز ملتی ہے ۔

پھر وہ لکھتے یں:

" تمل ناڈو ہو یا کرناٹک یا آندھرا پردیش ہندی کا ایک ہراول دستہ اردو بولنے والوں کی شکل میں وہاں صدیوں سے موجود ہے ۔" (۲۴)

۴۔ کوائف اردو

ادیب جلد (۱۱) شمارہ (۴) ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کی روشنی میں اردو بولنے والوں کا جائزہ لیا ہے۔ اردو ہندوستان کی چھٹی بڑی زبان ہے لیکن ہر مردم شماری کے موقع پر اس کا صحیح تجزیہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں مسعود صاحب نے ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق دستور ہند کے آخر میں شیڈول کے تحت دی ہوئی زبانوں کا جائزہ لیتے ہوئے اردو کا موقف واضح کیا ہے۔

مختلف ریاستوں میں اردو کے موقف کو واضح کرتے ہوئے اردو کی پانچ ریاستوں کے نام گنائے ہیں۔

(۱)۔ اترپردیش (۲)۔ بہار (۳)۔ مہاراشٹرا (۴)۔ آندھراپردیش (۵)۔ کرناٹک

جغرافیائی حیثیت سے اردو آبادی کے دو حلقے بنائے ہیں۔

(الف)۔ پہلے حلقہ میں اترپردیش اور بہار شامل ہیں۔ ان دونوں ریاستوں میں کل اردو آبادی ۸۷۳، ۶۶، ۱۴۲ ہے۔

(ب) آندھراپردیش، مہاراشٹرا اور کرناٹک جہاں کل اردو آبادی ۹۵۹۸۴۴ ہے پھر ان ریاستوں کی بھی نشاندہی کی ہے جہاں اردو کو سرکاری موقف حاصل ہے یا پھر اردو کو استعمال کی اجازت تو مل گئی ہے لیکن دوسری زبان کا موقف دینے میں مقامی حکومتیں ٹال مٹول سے کام لے رہی ہیں۔

اردو کے سب سے زیادہ آبادی والے اضلاع کی نشاندہی کرتے ہوئے (۱۵) اضلاع کے نام دیے ہیں۔ پانچ ریاستوں میں مسلم آبادی اور اردو زبان کا تناسب واضح کیا ہے۔ اترپردیش اور بہار میں مسلمانوں کی آبادی کے اعتبار سے اردو آبادی کا تفاوت بہت ہے جبکہ جنوبی ہند کی ریاستوں، آندھراپردیش، مہاراشٹرا اور کرناٹک میں اردو کا تفاوت بہت کم ہے۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"ان ریاستوں میں اردو کے خلاف تعصب بھی کم ہے اور ان ریاستوں میں اردو بولنے والوں کا لسانی شعور بھی زیادہ بیدار ہے۔

ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ہندی کے علاقے کی طرح یہاں " دام ہم رنگ زمین " نہیں ہے ۔ تلگو اور کنڑا دراویڈی زبانیں ہیں جن میں اردو کو ضم کر دینا کسی طرح ممکن نہیں ۔" (۲۵)

۵۔ کوائف اردو لسانی چہ می گوئیاں

ادیب جلد (۱۲) (شمارہ ۱۔۳) ۱۹۸۸ء میں یہ مسلسل اور طویل مضمون اب تک دو قسطوں میں شائع ہوا ہے ۔ اس مضمون میں اردو زبان کے آغاز سے اردو الفاظ کی تلفظی تبدیلیوں کا تلفظ کے مقابلہ میں جائزہ لیا ہے ۔ اردو زبان کے عام چلن کا ذکر کیا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب انشاء کے طرفدار ہیں اور انشا کی رائے کو قول فیصل سمجھتے ہیں ۔

" جو لفظ اردو میں مشہور ہو گیا، عربی ہو یا فارسی ، ترکی ہو یا سریانی ، پنجابی ہو یا پوربی ، ازروئے اصل غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اردو کا لفظ ہے ۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر اصل کے خلاف مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اس کی صحت و غلطی اردو کے استعمال پر موقوف ہے ۔ کیوں کہ جو کچھ خلاف اردو ہے وہ غلط ہے گو اصل میں وہ صحیح ہو اور جو موافق اردو سے صحیح ہے گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو ۔" (۲۶)

اس کے بعد چند ایسے الفاظ پیش کیے ہیں جن کا تلفظ اردو میں غلط ہے لیکن ثقہ اور پڑھے لکھے لوگ بھی اسی طرح استعمال کرتے ہیں مثلاً:

صحیح	غلط
قطب منَار	قُطب مِینار
سِپاری	سُپاری

کوئی بھی پسپاری نہیں کہتا۔ آخر میں وہ لکھتے ہیں:

" مجموعی طور پر اردو کا یہ انتشاری دور ہے اس لیے اس کے تلفظ کی درجہ بندی اور اس کی حفاظت کی سخت ضرورت ہے تاکہ اس زبان کا اپنا لہجہ اور تشخص قائم رہے۔" (۲۷)

ادیب علی گڑھ شمارہ (۴) جلد (۱۲) کی دوسری قسط میں اردو زبان کے محاوروں کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ اس مضمون کی ابتدا میں محاورہ کی تعریف مختلف لغت کی روشنی میں کی ہے۔

" محاورہ کے لغوی معنی باہم کلام کرنا ہے۔ لیکن اس کی اصطلاحی تعریف ہمارے جملہ لغت نگاروں نے اس طرح کی ہے۔ ۔وہ کلمہ یا کلام ہے جسے چند ثقات نے لغوی معنی کی مناسبت یا غیر مناسبت سے کسی خاص معنی کے لیے مخصوص کرلیا ہو۔" (۲۸)

(آصفیہ، مہذب اللغاب)

مسعود صاحب نے اس کے بعد محاورہ کے ایک اور دلچسپ پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ محاورہ عام طور پر کچھ بازاری زبان اور کچھ زنانی زبان سے متعلق ہوتا ہے۔ عوام میں جب اس کی قبولیت ہوتی ہے تو اسی وقت محاورہ بنتا ہے۔ محاورے کچھ علاقائی یا مقامی حیثیت سے بھی بنتے ہیں۔

اردو لغت نویس اپنی لغات میں جن محاورات کو استعمال کرتے ہیں اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

" ہمارے لغت نگاروں کو اپنی فرہنگوں میں محاورات شامل کرنے کی عادت سی ہوتی ہے حالاں کہ انگریزی کی بڑی لغات آکسفورڈ یا فرانسیسی کی لغت عظیم میں کسی لفظ کے استعمال کو ذہن نشین کرنے کے لیے چند محاورات دیے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس

صاحب مہذب اللغات نے اس بات پر فخر کیا ہے کہ انھوں نے آنکھ
کے لفظ کے تحت امیر اللغات کے مقابلہ میں محاورات کی تعداد د
یوڑی درج کی ہے۔" (۲۹)

لیکن اس سلسلے میں مسعود صاحب نے دکنی اردو لغت میں مترادفات کی بجائے محاوروں کو لفظ کی شکل میں لیا ہے۔

اس مضمون میں انھوں نے لفظ، لغت اور فرہنگ کو مترادف شکل میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً:

"اگر ہمارے لغت نویس اپنی فرہنگوں میں محاورات کو حرف ہونے
کے طور پر جگہ دیں۔"

"ہمارے لغات نگاروں کو اپنی فرہنگوں میں محاورات شامل کرنے
کی۔۔۔۔۔"

لغت اور فرہنگ میں بعض نقادوں نے فرق کیا ہے اور بعض اس فرق کو نہیں مانتے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں بھی فرہنگ کو لغت سے جدا نہیں سمجھتے۔
(اس کی تفصیلی بحث لغت کے باب میں آئے گی)

۶۔ اردو اور الکشن

ادیب سہ ماہی علی گڑھ جلد (۱۳) شمارہ ا تا ۲ میں اردو اور الکشن کے عنوان سے الکشن کے دوران اردو والوں کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو والوں کی زبوں حالی جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جس قدر پائی جاتی ہے وہ عبرت ناک ہے۔ اردو کی جنم بھومی اترپردیش ہے لہذا وہ اردو والوں کو پرخلوص مشورہ دے رہے ہیں کہ اردو کی لڑائی کو اترپردیش سے شروع کرنا چاہیے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ الکشن کے وقت ووٹ کے دھارے پر اردو کا مقام حاصل کرنا چاہیے۔ اردو کی ترقی کا انحصار صرف بول چال یا بازاروں تک محدود نہیں

رہتا۔ زبان میں ترقی دفاتروں اور عدالتوں کے ماحول میں ہوتی ہے اسلیے اردو کو دفتر شاہی سے لے کر دفتر و عدالت تک پہنچانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اردو کی ترقی کے لیے چار اہم تجاویز بھی دیے ہیں۔

رسالہ ادیب جامعہ اردو علی گڑھ (شمارہ ۲، جلد (۱۵) ۱۹۹۱ء) میں لسانی چہ ئی گوئیاں کی تیسری قسط شائع ہوئی۔ اس میں صوتیاتی سطح پر اردو کی ان آوازوں سے بحث کی ہے جو معیاری اردو کی شناخت سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اردو کے ایک بڑے حلقے میں ان کی ادئیگی الگ ہوتی ہے۔

ق، ف، ز، ژ، خ، غ ان آوازوں کی ادئیگی پر بحث کی ہے۔ پنجاب کے علاقہ میں زیادہ ترق کو /ک/ پڑھاجاتا ہے جس کی بہترین مثال علامہ اقبال کی شاعری میں ملی ہے۔ق اور خ کے تلفظ کے سلسلے میں شمالی ہند اور دکن کی مثالیں دی ہیں۔

"اہل دکن / ق / کا تلفظ / خ / کے مانند کرتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں کہ اہل دکن / ق / کی ادائیگی پر بالکل قدرت نہیں رکھتے۔ اکثر/ خ / کا تلفظ / ق / کے مانند کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کالج میں ہرروز خلیفہ عبدالحکیم سے ملاقات کے وقت پوچھتے خلیفہ صاحب کیاقبریں ہیں۔" (۳۰)

شمالی ہند میں وخت (وقت)، صندوخ (صندوق) مستعمل ہوتا ہے۔ ان الفاظ کے تلفظ کو واضح کرتے ہوئے ریڈیو اور ٹی وی اناونسروں کے تلفظ کی بھی مثالیں دی ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ دخیل آوازوں کے زوال کو ایک ہی خاندان یعنی نہرو خاندان کی چار نسلوں میں تلاش کیا ہے۔

==== ○ ○ ○ ====

صوتیات

۱- پروفیسر مسعود حسین خاں - اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ - ص ۸
۲- صلاح الدین احمد - اردو لفظ کا صوتیاتی اور صوتیاتی مطالعہ - نذر مسعود - ص ۲۹۲
۳- شوکت سبزواری - اردو زبان کا ارتقا - ص ۱۲۴
۴- نذیر احمد ملک - مضمون پروفیسر مسعود حسین خاں کی صوتیاتی تنقید مشمولہ - نذر مسعود - ص ۱۲۸
۵- "اردو کے حروف ہجا" کے عنوان سے روزنامہ رہبر دکن کے سالنامہ - بابتہ ۱۳۳۹ ف م ۱۹۲۹ء میں معرکتہ الآرا مقالہ شائع ہوتھا بعد کو یہی مقالہ کتابی صورت میں "اردو میں علم ہجا کے عنوان سے شائع ہوا - یہ کتاب علم الکلام " (عبدالقادر سروری) سے قبل کی ہے -
۶- مرزا خلیل احمد بیگ - نذر مسعود - ص ۲۳۱
۷- گیان چند جین - مقدمہ - لسانی مطالعہ - ص ۹
۸- مسعود حسین صاحب نے اپنے مجموعہ مضامین شعر و زبان میں صوتیات کی تفصیلی بحث کرتے ہوئے اردو کے ۳۷ مصوتے بتائے ہیں -
۹- نذیر احمد ملک - مضمون "پروفیسر مسعود حسین خاں کی صوتیاتی تحقیق" مشمولہ نذر مسعود - ص ۲۳۲
۱۰- عبد الستار دلوی - ادبی اور لسانی تحقیق - ص ۲۱۹
۱۱- جے - آر - فرتھ کا شمار چوٹی کے برطانوی ماہرین لسانیات میں ہوتا ہے -
۱۲- شوکت سبزواری - - لسانی مسائل - ص ۶، ۷
۱۳- مسعود حسین خاں - اردو کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ - مرتب مرزا خلیل احمد بیگ - صفحہ نمبر ۱۳
۱۴- مرزا خلیل احمد بیگ - نذر مسعود - ص ۱۵
۱۵- مسعود حسین خاں - ورود مسعود - ص ۱۸۰
۱۶- پروفیسر عبد العظیم - اردو زبان کی تاریخ، تشکیل، تقدیر - ص ۴
۱۷- مسعود حسین خاں - اردو، زبان، تاریخ، تشکیل، تقدیر - ص ۵
۱۸- مسعود حسین خاں - اردو، زبان، تاریخ، تشکیل، تقدیر - ص ۱۴
۱۹- مسعود حسین خاں - اردو، زبان، تاریخ، تشکیل، تقدیر - ص ۳۴
۲۰- مسعود حسین خاں " " ص ۳۵
۲۱- عبد المغنی - نذر مسعود - ص ۳۴۳
۲۲- مسعود حسین خاں - اردو، زبان، تاریخ، تشکیل، تقدیر - ص ۳۴، ۳۵
۲۳- مسعود حسین خاں - مقالات مسعود - ص ۸۲
۲۴- مسعود حسین خاں - مقالات مسعود - ص ۸۱

۲۵- مسعود حسین خاں - ادیب سہ ماہی علیگڑھ ۱۹۸۷- ص ۴۸

۲۶- مسعود حسین خاں - ادیب سہ ماہی - جلد ۱۲ شمارہ ۱ تا ۳ ۱۹۸۸ء - ص ۱۴

۲۷- مسعود حسین خاں - ادیب سہ ماہی - جلد ۱۲ شمارہ ۴، ۱۹۸۸ء - ص ۹۶

۲۸- مسعود حسین خاں - ادیب سہ ماہی - جلد ۱۲ شمارہ ۴، ۱۹۸۸ء - ص ۹۵

۲۹- مسعود حسین خاں - ادیب سہ ماہی - جلد ۱۲ شمارہ ۴، ۱۹۸۸ء - ص ۹۵

۳۰- مسعود حسین خاں - ادیب جامعہ اردو علیگڑھ - شمارہ ۴، ۱۹۹۱ء - ص ۹۷

ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے جو ڈاکٹر زور کے شاگرد رہے ہیں ایک انٹرویو میں اس حوالہ کے آخری فقرہ سے اختلاف کیا ہے - ان کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر زور کا تلفظ نہایت درست تھا - وہ الفاظ کی ادائیگی صحیح مخرج کے ساتھ کرتے تھے (راقم الحروف)

تحقیق وتدوین متن

پروفیسر مسعود حسین خاں جامع الحیثیات شخصیت کے مالک ہیں ۔ وہ شاعر، ادیب، نقاد، ماہر لسانیات اور بے بدل محقق ہیں ۔ لسانیات سے انھیں فطری شغف ہے ۔ اس کی تحقیق ان کا دلچسپ مشغلہ ہے ۔ ان کے تحقیقی مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں ۔ تحقیقی مضامین شعر و زبان، اردو کا المیہ، زبان و ادب اور مقالات مسعود کی صورت میں منظرعام پر آچکے ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب کی تحقیق زیادہ تر تدوین متن سے متعلق ہے ان کی مدونہ اور مرتبہ چھ تصانیف ہیں جن میں چار مثنویاں شامل ہیں ۔

۱۔ پرت نامہ ۔ سولھویں صدی عیسوی ۔ از فیروز بیدری ۔ ۱۹۶۵ء مشمولہ قدیم اردو مجلہ عثمانیہ ۔

۲۔ بکٹ کہانی ۔ سولھویں صدی عیسوی ۔ از افضل ۔ ۱۹۶۵ء مشمولہ قدیم اردو مجلہ عثمانیہ ۔

۳۔ ابراہیم نامہ (۱۶۱۱ء) ۔ از عبدل ۔ ۱۹۶۹ء

۴۔ قصہ مہر افروز و دلبر ۔ عیسوی خاں بہادر ۔ ۱۹۶۶ء ۔ دوسرا ایڈیشن انجمن ترقی اردو دہلی ۔

۵۔ عاشور نامہ ۔ (۱۱۰۰ھ) روشن علی ۔ ۱۹۷۲ء

ان کے علاوہ ۱۹۸۱ء میں رقعات رشید احمد صدیقی بھی مرتب کر کے شائع کی ہے ۔ اس باب میں مسعود صاحب کی تحقیقی کاوشوں کا جائزہ لیا جائے گا ۔

بکٹ کہانی

ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۱۹۶۲ء میں حیدر آباد میں شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

کے صدر کی حیثیت سے فائز ہوئے۔ قیام حیدرآباد مسعود صاحب کے علمی اور تحقیقی کارناموں کے لیے بہت ہی سازگار رہا جس کا اعتراف خود ڈاکٹر صاحب نے اپنی تخلیقی کاوش "ورد مسعود" میں یوں کیا ہے۔

"علمی اعتبار سے عثمانیہ یونیورسٹی میں میرا چھ سالہ قیام (۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۸ء) خود میرے لیے بارآور رہا اسی دوران میں نے قدیم اردو کے نام سے اردو کے قدیم متون کو سائنسی انداز میں مرتب کر کے چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا جن میں پرت نامہ، بکٹ کہانی اور ابراھیم نامہ کے متون میرے مرتب کردہ ہیں۔" (۱)

حیدرآباد میں ڈاکٹر صاحب نے تحقیق و تدوین متن، ادب اور تنقید، لسانیات و اسلوبیات جیسے علوم کی گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اپنے غیر معمولی تحقیقی و تنقیدی شغف کی وجہ سے قدیم فنون کو سائنسی انداز اور بڑی گہرائی سے مرتب کیا ہے۔ خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں:

"دکنی اردو قدیم متون کی بازیافت اور ان کی ترتیب و تدوین مسعود صاحب کے قیام حیدرآباد کا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے دنیا میں ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔" (۲)

بکٹ کہانی ڈاکٹر صاحب کے تالیفات میں سے ایک ایسی تالیف ہے جس کے بعد اردو دنیا میں ایک تہلکہ بپا ہوگیا اور کئی ایک محققین ادب نے بکٹ کہانی، اس کے مصنف کا نام اور وطن کے بارے میں تحقیقی مضامین کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن چند ایک کے سوا سارے محققین مسعود حسین خاں کی تحقیق سے آگے نہ بڑھ سکے۔

بکٹ کہانی کو مسعود حسین خاں نے اپنے تحقیقی و تنقیدی

مقدمے کے ساتھ ۱۹۶۵ء میں قدیم اردو میں شائع کیا۔ اس کا علاحدہ ایڈیشن ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا اس کے بعد یوپی اردو اکیڈیمی کی جانب سے ۱۹۷۹ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ بکٹ کہانی کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن میں ڈاکٹر صاحب کا نام سرورق پر نورالحسن ہاشمی کے نام کے بعد ہے۔

اکیڈیمی کے پہلے ایڈیشن میں نورالحسن نے مقدمہ میں مسعود صاحب کے نام کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"نئی معلومات کی روشنی میں تحقیقی حصہ از سر نو لکھا یعنی لسانی تجزیہ کا حصہ مسعود صاحب کے مقدمہ سے ہے۔" (۳)

اردو اکیڈیمی کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچہ میں چیرمین مجلس انتظامیہ محمد حسن نے اس طرح وضاحت کی ہے:

"ہماری درخواست پر پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے دیباچہ میں کچھ اضافہ کیا ہے۔" (۴)

پیش لفظ میں چیرمین رضا انصاری نے لکھا ہے:

"بکٹ کہانی کا ایک معتبر ایڈیشن مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر اختلاف نسخ کی نشاندہی اور جامعہ مقدمہ کے ساتھ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے تیار کیا تھا۔ نظر ثانی اور مطالب کے بعد یہ کتاب اکاڈمی نے پہلی مرتبہ ۱۹۷۸ء میں شائع کی تھی اب اس کا دوسرا ایڈیشن پیش کیا جارہا ہے۔" (۵)

مندرجہ بالا تینوں بیانات سے بکٹ کہانی کا مرتب کون ہے؟ اس کی وضاحت نہیں ہوتی۔ نورالحسن ہاشمی نے مسعود صاحب کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے انھوں نے

صرف لسانی تجزیہ ہی کیا ہے اور بکٹ کہانی گویا ان ہی کی مرتبہ ہے اور سارا مقدمہ بھی انھیں کا لکھا ہوا ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے بھی نورالحسن ہی کے سر سہرا باندھا۔ یوپی اردو اکیڈمی کے چیرمین رضا انصاری نے کم از کم مسعود صاحب کا نام تو لیا۔ " ورود مسعود " میں ڈاکٹر صاحب نے بکٹ کہانی کی ترتیب و تہذیب میں اپنے گراں قدر حصہ کا ذکر کرتے ہوئے نورالحسن صاحب کی کوتاہی کی وضاحت کی ہے۔ بکٹ کہانی کو انھوں نے دس نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

" بکٹ کہانی کا قدیم ترین نسخہ نمبر (۹) میں جو ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کا مخزونہ ہے اور جس پر متن کی اساس ہے سراسر میرا مرتب کردہ ہے اس طرح بکٹ کہانی کے پہلے ایڈیشن کے پیش لفظ کا ایک ایک لفظ میرا لکھا ہوا ہے۔ ترتیب و تہذیب کے اس کام میں شریک غالب ہونے کے باوجود میں نے فراغ دلی سے سرورق پر اس کے مرتبین میں پہلی جگہ ان کے (نورالحسن ہاشمی) نام کو دی ہے۔" (۶)

مسعود صاحب نے افضل کے بارے میں قائم کے تذکرے سے اپنی تحقیق کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ کیوں کہ قائم پہلا تذکرہ نگار ہے اس نے افضل کو متعارف کروایا ہے۔ اس سے قبل کسی تذکرہ نگار نے افضل کا ذکر نہیں کیا۔ افضل کے وطن کے بارے میں مختلف آرا ملتی ہیں۔ قائم نے افضل کو جھنجھانہ کا متوطن بتایا ہے۔

"از سکان دیار مشرق از سکان قصبہ جھنجھانہ۔

محققین میں محمود شیرانی نے افضل کے بارے میں سب سے پہلے معلومات " پنجاب میں اردو " میں بہم پہنچائی ہیں۔ انھوں نے افضل کو پانی پت کا باشندہ بتایا ہے

"افضل پانی پت کے باشندے تھے جو فضائل، کمالات ظاہری و باطنی سے آراستہ اور عشق فقر کی چاشنی سے شیریں کام تھے۔" (۷)

مسعود صاحب نے والہ داغستانی اکرم رہتکی اور عبداللہ انصاری کے بارہ ماسہ کے اشعار سے تقابل کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ افضل پانی پت کا باشندہ تھا اور وہ ہندی فارسی کا باکمال شاعر تھا۔ اس مثنوی کے آخری دو اشعار سے شاعر کے نام، وطن اور مذہب کے بارے میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور قاری و محقق کو شک و شبہ میں ڈالتے ہیں۔

پہلا شعر نسخہ نمبر۲ کا ہے۔

"قصہ سارا کہا گوپال افضل　　شد معشوق سو عاشق کو واصل۔" (۸)

یہ مخطوط انڈیا آفس لائبریری کا ہے جس کے کل اشعار کی تعداد ۲۶۷ بتائی گئی ہے۔ اور کوئی بھی شعر دو بار نقل نہیں ہوا ہے۔ عبدالغفار شکیل نے تمام تذکروں اور محققین کی رائے کو مدنظر رکھتے ہوئے اور لسانی خصوصیات کا جائزہ لے کر بکٹ کہانی کے مصنف اور وطن کے بارے میں تفصیلات دی ہیں۔

"اکرم رہتکی اور والہ کے بیان میں مجھے کچھ تضاد نظر نہیں آتا۔ افضل باشندے تو نارنول ہی کے تھے لیکن درس و تدریس کے سلسلہ میں ان کا قیام پانی پت میں رہا ہوگا۔" (۹)

اس تحقیق میں انھوں نے اکرم رہتکی کی معلومات کی بنا پر افضل کا نام گوپال بتایا ہے۔ افضل کے نام "گوپال" پر پرکاش مونس کو سخت اعتراض ہے:

"اردو تحقیق کے دامن پر یہ تاریخی غلطی ہمیشہ ایک بدنما داغ کی صورت میں نمایاں رہے گی۔ کسی شہادت کے بغیر بکٹ کہانی کا مصنف ایک غیر متعلق شخصیت کو قرار دے دیا گیا۔ اور ایک کے بعد دوسرا محقق بغیر کسی جانچ پڑتال کے اس مفروضے کو حقیقت سمجھ کر دہراتا رہا۔" (۱۰)

بکٹ کہانی میں خود مصنف کا یہ کہنا کہ وہ "گہے افضل اور گہے گوپال رہا

پرکاش مونس کا یہ اعتراض مضحکہ خیز ہے خاص طور پر اکرم رہتکی کے تیرہ ماسہ کی دریافت کے بعد جو افضل کی وفات کے ۱۵۰ برس بعد لکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی افضل کے وطن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"زبان کے ادبی معیار اور لسانی امتزاج کے الگ الگ معیاروں سے قطع نظر دونوں کی لسانی خصوصیات قریب قریب یکساں ہیں۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ افضل کا لسانی حلقہ بھی وہی ہے جو مفتی صاحب کا ہے اور اس اعتبار سے افضل کا اصل وطن پانی پت کی بجائے جھنجھانہ ہونا چاہیے۔" (۱۱)

افضل کے وطن کے بارے میں جو متفرق رائیں ملتی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ اکرم رہتکی نے اسے نارنول کا باشندہ بتایا ہے۔

۲۔ والا داغستانی نے افضل کا وطن پانی پت قرار دیا ہے۔

۳۔ یادگار شعرا۔ اسپرنگر جھنجانہ۔

۴۔ نتائج الافکار۔ محمد قدرت اللہ، پانی پت۔

۵۔ آفتاب عالم تاب۔ قاضی محمد صادق، تھانیسر

۶۔ روز روشن محمد مظفر گوپالوی، تھانیسر

پانی پت، تھانسیر اور نارنول ہریانہ کے صوبے ہیں۔ جھنجھانہ یوپی میں میرٹھ کے قریب واقع ہے۔ بکٹ کہانی پرچوں کہ کھڑی بولی کے اثرات زیادہ نظر آتے ہیں اسی لیے گمان گذرتا ہے کہ کھڑی بولی کے اطراف کے رہنے والے ہوں گے اور کھڑی بولی سے قریب جو علاقہ ہے وہ جھنجھانہ ہے۔ جھنجھانہ نارنول اور راجستھان کی سرحد پر واقع ہے۔ ممکن ہے اکرم رہتکی نے اسے نارنول لکھا ہے۔ والہ داغستانی نے پانی پتی اور اسپرنگر نے تھانیسر

"داخلی (لسانی) شہادت اس بات کی آئینہ دار ہے کہ افضل کا تعلق

ہریانہ کے علاقہ (نارنول یا پانی پت) سے تھا۔ بلکہ وہ کھڑی بولی کے علاقہ جھنجھانے ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ غالباً اس چیز کے پیش نظر پرفیسر شیرانی نے والہ کی روایت نقل کرنے کے باوجود افضل کو جھنجھانہ کا باشندہ بتایا ہے۔" (۱۲)

مسعود حسین خاں بکٹ کہانی کے پہلے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"افضل نواح دہلی یعنی پانی پت کے رہنے والے تھے۔" (۱۳)

شعروزبان میں شامل مضمون شمالی ہند کا مستند شاعر "محمد افضل" میں لکھتے ہیں:

"افضل نواح دہلی یعنی پانی پت کے رہنے والے تھے۔ ان کی بکٹ کہانی کی زبان اس بات کی غماز ہے کہ شاعر کا تعلق کھڑی بولی یا اس سے ملحقہ علاقہ سے ہے۔" (۱۴)

عبدالغفار شکیل نے بکٹ کہانی کے مصنف کے بارے میں "نوائے ادب ۱۹۷۱ء میں بکٹ کہانی کے مصنف، وطن اور نام کے سلسلہ میں طویل مضمون لکھا تھا۔ بعد میں یہ مضمون ان کی کتاب "لسانی اور تحقیقی مطالعہ" میں شامل کیا گیا۔ اس مضمون میں لکھتے ہیں۔

"پانی پت، جھنجھانہ، تھانیسر اور نارنول کے اطراف ایک دائرہ کھینچ دیجئے تو ان شہروں میں فاصلہ کا تفاوت سو میل سے زیادہ نہ ہوگا۔ افضل کے بارے میں اکرم رہتکی اور والہ کے بیان میں مجھے کچھ زیادہ تضاد نظر نہیں آتا۔ افضل باشندہ تو نارنول ہی کے تھے لیکن درس وتدریس کے سلسلہ میں ان کا قیام پانی پت رہا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جھنجھانہ میں ان کی رشتہ داری رہی ہو۔" (۱۵)

مسعود حسین خاں "مقدمہ تاریخ زباں اردو" کے جدید ایڈیشن میں افضل کو نارنول کا باشندہ ہی بتاتے ہیں۔

"افضل کی بکٹ کہانی کے سلسلہ میں پہلا مستند اشارہ اکرم رہتکی المتخلص بہ قطبی کے تیرہ ماسہ میں ملتا ہے جو ۱۱۴۳ھ مطابق ۳۱/ ۱۷۳۰ء میں بھی افضل کے تقریباً ۱۰۵ برس بعد لکھا گیا ہے جس میں افضل کے بکٹ افسانہ اور اس کے وطن کے [redacted]نول (ہریانہ) کا ذکر ہے ۔۔۔۔۔۔۔سب سے قدیم شہادت کی رو سے نارنول ہی ا کا وطن قرار پاتا ہے اس لیے اسے ہریانوی علاقہ کا باشندہ تسلیم کیا جانا چاہیے" (۱۶)

اس طرح بکٹ کہانی کا مصنف نارنول ہریانہ کا باشندہ قرار پاتا ہے۔

وطن کے بعد مصنف کے نام اور اس کے مذہب کی بحث شروع ہوتی ہے۔ والہ نے افضل کی ایک رباعی پیش کر کے اس کو نیم مسلمان بتایا ہے جس کی مسعود حسین خاں نے اس طرح وضاحت کی ہے۔

" بازلف تو دہ ہائے عنبرچہ کنم باخال تو مشک ہائے ازفرفرچہ کنم کافروزلف کافرودل کافرمامن نیم مسلماں، بہ سہ کافرچہ کنم اسی نیم سلمان " کا انداز کافری اردو تاریخ شعر گوئی کی سب سے رنگین داستان ہے۔" (۱۷)

پرکاش مونس نے اپنی کتاب "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر" میں بکٹ کہانی اور قصہ برافروزو دلبر" کے بارے میں کچھ زیادہ ہی توجہ مبذول کی ہے۔وہ بکٹ کہانی کے مصنف کے بارے میں اکرم رہتکی کے نظریہ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"اکرم نے صراحتاً افضل کا نام گوپال بتایا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ کوئی ہندو شاعر گوپال نامی ہے جس کا تخلص افضل ہے۔" (۱۸)

اس سلسلہ میں انھوں نے انڈیا آفس لائبریری کے ہندوستانی مخطوطات کی

فہرست میں بکٹ کہانی کے مصنف کی حیثیت سے گوپال کے نام کا حوالہ دیا ہے۔

" Bikat Kahani Baramasa POEM describing the greif of a woman separated from her lover at each month of the year Gopal."

پرکاش مونس افضل کو ہندو شاعر مانتے ہیں اور اس کا وطن نارنول بتاتے ہیں جب کہ دوسرے تمام محققین اور مسعود حسین خاں مرتب نے اس کو "نیم مسلماں" کہا ہے میر حسن کا یہ قول کہ "افضل کدام ہندو بچہ گوپال بود کہ برو عاشق شد حسب حال خود۔"۔

"بارہ ماسہ عرف بکٹ کہانی گفتہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ گوپال کسی ہندو بچے کا نام نہیں بلکہ خود افضل کا اختیار کردہ نام تھا۔ جب وہ لباس برہمناں، متھرا کے مندر میں قیام پذیر تھا ہرچند والہ نے اپنے تفصیلی بیان میں افضل کے گوپال نام کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے لیکن بکٹ کہانی کے خاتمے پر یہ شعر اس نیم مسلمان کے نئے نام کی نشاندہی کرتا ہے۔

"بیا دلبر با خوش حال می باش　　گہے افضل گہے گوپال می باش" (۱۹)

پرکاش مونس افضل کو ہندو شاعر ہی مانتے ہیں اور اس کا وطن نارنول بتاتے ہیں۔ اس دور کے ہندو ماحول اور متھرا کے پجاریوں کا حال اور متھرا میں مخصوص طبقے کے لوگوں کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے پرکاش مونس اس بات پر ہی اٹل ہیں کہ بکٹ کہانی کا شاعر گوپال ہے جس کا تخلص افضل ہے۔ یہ ہندو صوفی شاعر ہے اور اس کا وطن نارنول ہے۔

لیکن داخلی شہادتیں ایسی ہیں جن سے شاعر کے "نیم مسلماں" ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔

شعر نمبر ۳۰۳ بحمد اللہ رہا جیو یار پایا تمام عمر کا دکھڑا بھلایا

اور نسخہ نمبر ۸ میں شعر ۳۱۰ کے بیچ جامی کے یوسف زلیخا کے اشعار میں بحمد اللہ کا ذکر آیا ہے۔ یہ لفظ شاعر کے غیر مسلم ہونے کی منافی کرتا ہے۔ مسعود حسین خاں لکھتے ہیں کہ بکٹ کہانی افضل کی سرتاسر رام کہانی ہے جس میں گوپال کی پریم کہانی ہے اس کے آخری شعر کی روشنی میں لکھا ہے:

"پیا دلربا خوش حال می باش　　گہے افضل گہے گوپال می باش"

سے یہ صاف ظاہر ہے کہ افضل نے اپنا بارہ ماسہ عشق کا یہ رنگین ناٹک کھیلنے کے بعد ہی لکھا ہے۔" (۲۰)

گیان چند جین اس نکتہ پر اعتراض کرتے ہیں۔

"اگر یہ افضل کی سوانح ہوتی تو اس میں ہجر کے شدائد کا بیان اس دور سے متعلق ہوتا جب تک اس نے اپنی محبوبہ کو حاصل نہ کیا تھا لیکن بکٹ کہانی کا عاشق ابتداء ہی سے شادی شدہ ہے۔" (۲۱)

مسعود صاحب نے ابتدا میں ہی واضح کر دیا ہے کہ افضل نے یہ ناٹک کھیلنے کے بعد اس واقعہ کو لکھا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے خیالات میں ہجر و وصل کی کیفیات کا اظہار ہو۔ بکٹ کہانی کی زبان کے تعلق سے طویل بحث ہے۔ بکٹ کہانی کے اشاعت کے بعد یہ بحث بھی محققین نے اٹھائی تھی کہ یہ نظم ہے یا مثنوی یا کہانی اس سلسلہ میں بھی مختلف نظریات ملتے ہیں:

جمیل جالبی لکھتے ہیں:

۱۔ بکٹ کہانی ایک مکمل نظم ہے۔ جس میں وہ تسلسل موجود ہے۔ جو طویل نظم کو اثر آفریں بنا دیتا ہے۔" (۲۲)

۲۔ قائم نے اپنے تذکرہ میں اس کو مثنوی کہا ہے۔

۳۔ میر حسن نے بارہ ماسہ عرف بکٹ کہانی کہا ہے۔

۴۔اسپرنگر نے "نظم جس کا نام بکٹ کہانی" بتایا ہے۔

۵۔تذکرہ گلزار ابراہیم میں بارہ ماسہ بیکٹھ کہانی

۶۔عبداللہ انصاری نے بکٹ کہانی

۷۔اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد کے نسخے گجراتی ٹائپ میں بارہ ماسی کا نام دیا ہے۔

۸۔گیاں چند جین مثنوی کہتے ہیں۔

مسعود حسین خاں نے اپنے تحقیقی مقدمہ میں مثنوی کا نام ہی استعمال کیا ہے لکھتے ہیں۔

"افضل کی نظم کا اصل نام بکٹ کہانی ہی ہے جو مثنوی کے انداز میں بحر ہزج مسدس میں محذوف الاخر میں لکھی گئی ہے بعض اشعار بحر ہزج مسدس مقصور والاخر میں بھی ہیں۔"(۲۳)

بارہ ماسہ شمالی ہند کی مقبول صنف تھی اس کے لیے کوئی زبان یا بولی مخصوص نہیں اس کا ارتقا سنسکرت اور اپ بھرنش کے پربند کا رویہ (طویل نظموں) سے ہوا ہے لیکن جمیل جالبی اس نظریے کی نفی کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں۔

"بارہ ماسہ خالص ہندی صنف سخن ہے۔ سنسکرت میں اس کی کوئی روایت نہیں ملتی یہ خیال کہ رت ورتن میں چار رتوں کا بیان ہوتا ہے اور بارہ ماسہ میں برہنے کا پنجابی، ہریانی، برج بھاشا اودھی اور اردو میں اس کی روایت ملتی ہے۔"(۲۴)

مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

"اس کا ارتقا سنسکرت اور اپ بھرنش کے پربند کا ریہ طویل نظموں کے رت ورتن سے ہوا ہے اس میں عام طور سے چار موسموں کا ذکر ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔رت ورتن اپنی ماہ بہ ماہ تفصیلات میں جاکر بارہ ماسہ بن جاتا ہے جس میں عام طور پر ایک فراق زدہ پتنی اپنے پتی

کی یاد میں تڑپتی ہے اور اس کے جذبات میں اتار چڑھاو خارج کے
بدلتے ہوئے موسموں کے زیر اثر پیدا ہوتا ہے اس طرح کی داخلیت
خارجیت سے ایک شاعرانہ پیرایہ، زبان میں مربوط ہوجاتی ہے۔"
(۲۵)

بارہ ماسہ کی روایت کی روشنی میں اس بات کی تحقیق ہوجاتی ہے کہ بکٹ کہانی کا افضل شروع میں ہی ہجر کے واقعات کا اظہار کر رہا ہے۔بقول گیان چند جین کے:

"بکٹ کہانی کا عاشق ابتدا ہی سے شادی شدہ ہے جو ماضی میں لپنے
شوہر کے ساتھ خوش وقتی کر چکی ہے۔ملن یا چھپے بچھڑنا پھر کٹھن ہے۔
(۲۶)

بکٹ کہانی کے آخری ایڈیشن میں اس سلسلہ میں نور الحسن نے کچھ تفصیل نہیں بتائی۔صرف تذکرہ نگاروں کے حوالے دیے ہیں۔اس ایڈیشن میں بارہ ماسہ کے چند قدیم نمونوں کا حوالہ دیا گیا ہے جس میں مسعود سلمان کی فارسی نظم بارہ ماسہ کا حوالہ بھی ملتا ہے اور مزید اس طرز کی سات نظموں کا ذکر کیا ہے جس پر اودھی یا برج بھاشا کا اثر ملتا ہے۔افضل کی بکٹ کہانی کی زبان کے بارے میں مسعود حسین خاں نے تنقیدی جائزہ لیا ہے۔بکٹ کہانی سے افضل کی ہندی اور فارسی میں مہارت کا اظہار ہوتا ہے۔

"بکٹ کہانی شمالی ہند میں اردو شاعری کا پہلا مستند نمونہ ہے جس کی
موجودگی میں تاریخ ادب اردو کا یہ مفروضہ غلط ثابت ہوجاتا ہے کہ
شمال میں اردو کی شمع شعرولی نے روشن کی تھی۔"(۲۷)

افضل کی بکٹ کہانی کو انھوں نے جدید اردو کا پہلا ادبی نقش قرار دیا ہے۔ عہد اکبری میں کھڑی بولی برج بھاشا کے اثر سے ایک نیا روپ لے چکی تھی جس کا ثبوت اس بارہ ماسہ کی زبان سے ہوتا ہے۔افضل کی زبان میں جن بولیوں کا اثر ہے

اس پر طویل بحث کی ہے اس لسانی تجزیہ کو نورالحسن ہاشمی نے بھی اعتراف کرتے ہوئے اسی طرح شامل کر لیا ہے۔

مسعود صاحب نے افضل کی زبان کو آگرہ کی بولی سے مربوط کیا ہے اس کے بارے میں وہ تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ جمنا پار کی بولیاں جس کا مرکز دہلی اور اس کے نواحی علاقے تھے ۱۳۵۰ء کے قریب جب دارالسلطنت آگرہ قرار پایا تو لسانی مرکز بھی منتقل ہوا۔ اور یہاں کی بولی میں ایک نئی لسانی تبدیلی آئی۔

افضل کی زبان کا تعلق پانی پت سے نہیں ہے بلکہ اس اردو سے ہے جو آگرہ کے بازاروں میں بولی جاتی تھی۔ افضل کی زبان کا جب ہم تجزیہ کرنے نکلتے ہیں تو پھر یہاں اس کی وطنیت کا مسئلہ درمیان میں آجاتا ہے۔ جس سے اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ اس کا وطن پانی پت تھا۔

تنویر احمد علوی نے نوائے ادب بمبئی ۱۹۶۹ء میں بکٹ کہانی کے مصنف، زبان اور وطن کے بارے میں طویل بحث کے دوران لکھا تھا کہ افضل کا وطن جھنجھانہ ہے۔ جھنجھانہ اور پانی پت کے درمیان گو کہ فاصلہ کم ہے لیکن جمنا حائل ہے جس کے وجہ سے آس پاس کے دیہاتوں کی زبان میں فرق ہے۔ اس قیاس پر بتاتے ہیں کہ:

"افضل کا وطن جھنجھانہ تھا اور سلسلہ ملازمت قیام پانی پت میں تھا۔

(۲۸) .

عبدالغفار شکیل نے اپنے طویل تحقیقی مقدمہ میں افضل کے وطن، نام، مذہب اور زبان کے بارے میں دلیلوں اور تمام شہادتوں کو شامل کیا ہے اور آخر کار وہ افضل کو نارنولی قرار دیتے ہیں۔ افضل کی زبان پر ہریانوی کا اثر نہ ہونے کی یہ تاویل پیش کرتے ہیں۔

"نارنول جو افضل کا وطن ہے۔ وہ ہریانہ کے جنوب میں ہریانہ کا

آخری شہر ہے اور راجستھانی زبان کے علاقے میں اس کی سرحد ملتی ہے۔ علاقائی سرحد پر بولیاں اپنی ہمسایہ زبان سے زیادہ قریب اور متاثر ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے افضل کی زبان پر ہریانی پن نہیں دکھائی دیتا ہے بلکہ راجستھانی اور برج کا اثر نمایاں ہے۔" (۲۹)

ڈاکٹر صاحب اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"قطع نظر اس کے کہ شاعر کسی علاقہ کا رہنے والا ہے۔ وہاں کی بولی کیا ہے وہ بلا دریغ برج بھاشا اور اس کی روایت شعر کا پابند ہو کر لکھتا تھا اس لیے افضل کے بارہ ماسہ کی زبان کا تعلق پانی پت سے نہیں بلکہ اس اردو سے ہے جو آگرہ کے بازاروں میں بولی جاتی ہے۔" (۳۰)

لسانی تجزیہ میں بکٹ کہانی کا صوتی، صرفی نحوی، جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مرتبہ نسخہ میں بکٹ کہانی کے اشعار کی تعداد ۳۲۰ ہے جس میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ گراھیم بیلی نے جو تعداد ۶۰۰ بتائی ہے اسے (Line) کہا گیا ہے جس سے مراد مصرع ہے کیوں کہ اس سے زیادہ ضخامت والا کوئی دوسرا نسخہ ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔

مسعود صاحب نے اسی نظم کو تدوین کے تمام مراحل طئے کرتے ہوئے انجام دیا ہے اس کی ترتیب میں دس نسخوں کی مدد لی گئی ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کا نسخہ نمبر ۹ مستند اور اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ نور الحسن ہاشمی اس کے مرتبین میں شامل ہیں ان کے اشتراک کی بھی ایک طویل داستاں ہے۔ گیان چند جین نے مسعود صاحب کے حوالے سے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

"دونوں حضرات کے خوشگوار اشتراک کی شان نزول خود مسعود صاحب کی زبانی معلوم ہوئی وہ لکھنو یونیورسٹی میں پروفیسر اردو کی سلیکشن کمیٹی میں بطور ماہر کے گئے تھے ہاشمی صاحب امیدوار تھے

انٹرویو کے دوران ہاشمی صاحب نے اپنا مرتبہ بکٹ کہانی کا مسودہ پیش کیا جسے انھوں نے چھ قلمی اور ایک مطبوعہ نسخے کی مدد سے ترتیب دیا تھا۔ وہ حیدر آبادی نسخے حاصل نہ کر سکے تھے۔ انٹرویو کے بعد انھوں نے مسعود صاحب کو پیش کش کی کہ دونوں مل کر بکٹ کہانی کو مرتب کر دیں۔ مسعود صاحب نے قبول کر لیا ہاشمی صاحب کا مسودہ ساتھ لے گئے۔ حیدر آباد کے چار قلمی نسخوں اور ایک مزید مطبوعہ نسخہ سات ملا کر انھوں نے موازنہ کیا اور تنقیدی متن تیار کیا۔" (۳۱)

بکٹ کہانی کا پہلا متن اور مقدمہ ڈاکٹر صاحب نے خود لکھا ہے جس کا اعتراف "ورود مسعود" میں وہ اس طرح کرتے ہیں۔

"علمی اشتراک کا دوسرا تجربہ مجھے پروفیسر نور الحسن ہاشمی کی جاب سے ہوا جنھوں نے بکٹ کہانی کے تیسرے ایڈیشن میں میرا لکھا ہوا۔ پہلے ایڈیشن کا دیباچہ حذف کر کے اپنا کام بنالیا اور جس پر اس متن کی اساس ہے سر تا سر میرا مرتب کردہ ہے ـــــــ اس کے پہلے ایڈیشن کے پیش لفظ کا ایک ایک لفظ میرا لکھا ہوا ہے۔" (۳۲)

شریک غالب کی وجہ سے انھوں نے ان کا نام اولیت کے ساتھ فراخ دلانہ طور پر دیا تھا۔

"بکٹ کہانی کی تدوین میں ـــــــ شریک غالب ہونے کے باوجود مؤلفین میں ان کا نام اول رکھا لیکن اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کراتے وقت انھوں نے میرے مقدمہ کا بیشتر حصہ اس سے خارج کر کے آخر میں صرف اپنا نام رکھا۔" (۳۳)

آخری ایڈیشن میں نور الحسن ہاشمی نے بیش تر حصہ خارج تو کیا ہے لیکن مقدمہ

کا سارا مقدمہ اور ترتیب کا سلیقہ مسعود صاحب کے پہلے مقدمہ کا نقش ثانی ہی ہے چند الفاظ کے ردو بدل سے انھوں نے اس متن کو پیش کر دیا ہے صرف مصنف کے وطن اور نام کے سلسلے میں عبدالغفار شکیل کی تازہ ترین تحقیقات کو شامل کر دیا ہے اور مقدمہ کے آخر میں اس کی تشریح کر دی ہے۔

نسخہ جات نمبر ۷، ۸، ۱۰، اور ش کی تفصیلات ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تحریر کردہ ہیں۔" (۳۴)

یہ تشریح فٹ نوٹ میں کی گئی ہے اس حوالہ سے گیان چند جین نے اشتراک کی کہانی جو مسعود صاحب کی زبانی بتائی ہے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ابتدا میں چھ نسخوں کی مدد سے نورالحسن ہاشمی نے متن تیار کیا تھا اور بعد میں ڈاکٹر صاحب نے سات نسخوں اور ایک مطبوع نسخے کی مدد سے از سر نو متن ترتیب دیا۔ اس قدر مواد کی فراہمی پر شریک کار کی حیثیت سے کام کے ساتھ ساتھ ان کا نام شامل رکھا ہے جب کہ تیسرے ایڈیشن میں نورالحسن ہاشمی نے سرورق پر تو نام رکھا ہے لیکن مقدمہ میں صرف اپنا نام رکھا ہے۔ تازہ ترین ایڈیشن ۱۹۹۱ء میں مسعود حسین خاں کے اصرار پر یوپی اردو اکادمی نے مقدمہ کے آخر میں مسعود حسین خاں کا اضافہ کر دیا ہے۔

یہاں ڈاکٹر صاحب کے تدوین متن اور اس کی اہمیت سے تعلق ہے جنھوں نے اس نظم کو اپنی تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا اور اس حقیقت کو ادبی دنیا میں روشناس کروایا جس کے بعد مختلف اہل ذوق نے اپنے زاویہ تحقیق سے اس کا تجزیہ کیا اور حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔

افضل کی بکٹ کہانی کی زبان مجموعی طور پر ایک سیال لسانی کیفیت کی غماز ہے (۳۵) جو جدید اردو سے قریب تر ہے۔ یہ تصنیف لسانی، تہذیبی اور ادبی حیثیت سے اردو ادب کی تاریخ میں ایک انتہائی اہم تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ یہ اس دور کا نمونہ ہے جب کہ دکن میں اردو زبان ایک ادبی دور میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کی

زبان میں کرشن بھگتی اور متھرا کے ہندو ماحول کا بھرپور تجزیہ ملتا ہے اس میں اس عہد کی لسانی خصوصیات کے علاوہ تہذیبی عناصر بھی ملتے ہیں۔

بکٹ کہانی میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ مختلف بولیوں کے اثرات سے ایک نئی زبان کا شیرازہ تیار ہو گیا ہے جو دکنی اردو کے معیاری ادبی روپ سے کہیں زیادہ پرکشش معلوم ہوتا ہے۔ اس مثنوی کو منظرعام پر لا کر مسعود حسین خاں نے اردو ادب کے قدیم فن پاروں میں بہت اہم اضافہ کیا ہے۔

گیان چند جین لکھتے ہیں:

"مسعود صاحب نے شمالی ہند کی اس قدیم مثنوی کو سلیقے سے مرتب کر کے بڑی خدمت کی ہے۔" (۳۶)

مثنوی کی ترتیب میں پہلے مصنف، نام، وطن کا تفصیلی جائزہ بکٹ کہانی کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں ملتا ہے۔ طویل بحث کے بعد لسانی تجزیہ کیا گیا ہے نسخوں کی کیفیت بتائی گئی ہے جس میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخے شامل ہیں۔ متن کی ترتیب کے بعد اختلاف نسخ کی تفصیل ہے۔ آخر میں فرہنگ دی گئی ہے۔ جس سے اس قدیم مثنوی کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

==========

تحقیق و تدوین متن بکٹ کہانی

۱- ورود مسعود، خدا بخش لائبریری ۱۹۷۹ء- ص ۲۰۰
۲- مرزا خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر- نذر مسعود، علی گڑھ- ص ۱۱
۳- مرزا خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر- نذر مسعود، فکر و نظر علی گڑھ- ص ۱۲۳
۴- نور الحسن ہاشمی، مسعود حسین خاں- بکٹ کہانی، چوتھا ایڈیشن- دیباچہ
۵- محمد رضا انصاری- بکٹ کہانی، اردو اکیڈیمی، دوسرا ایڈیشن- پیش لفظ ۶- مسعود حسین خاں- ورود مسعود- ص ۲۰۱
۷- نور الحسن ہاشمی، مسعود حسین خاں- بکٹ کہانی، اتر پردیش اردو اکیڈیمی- ص ۱۰
۸- پروفیسر نور الحسن ہاشمی، بکٹ کہانی، ص ۸۳
۹- عبد الغفار شکیل- نوائے ادب، اکتوبر ۱۹۶۹ء- ص ۱۱۳
۱۰- پرکاش مونس- اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر، الہ آباد ۱۹۷۸ء- ص ۱۲۴
۱۱- تنویر احمد علوی، ڈاکٹر- نوائے ادب، بمبئی اپریل ۱۹۶۹ء- ص ۱۸
۱۲- سحر الاوی، ڈاکٹر- ہماری زبان- ۲۲/ جنوری ۱۹۷۲ء- ص ۲
۱۳- مسعود حسین خاں، ڈاکٹر- بکٹ کہانی، مشمولہ قدیم اردو- ص ۳۸۲
۱۴- مسعود حسین خاں- مقدمہ، شعر و زبان- حیدر آباد- ص ۱۱۳
۱۵- عبد الغفار شکیل- لسانی اور تحقیقی مطالعہ- ص ۱۱۷
۱۶- مسعود حسین خاں- مقدمہ تاریخ زبان اردو- ص ۸۹
۱۷- مسعود حسین خاں، ڈاکٹر- بکٹ کہانی، مشمولہ قدیم اردو- ص ۲۸۲
۱۸- پرکاش مونس- اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر- ص ۳۸
۱۹- مسعود حسین خاں- مقدمہ شعر و زبان- ص ۱۱۴
۲۰- مسعود حسین خاں- بکٹ کہانی- مشمولہ قدیم اردو- ص ۳۹
۲۱- گیان چند جین- پرکھ اور پہچان- ص ۲۴۶
۲۲- جمیل جالبی، ڈاکٹر- تاریخ ادب اردو جلد اول- ص ۶۳۱
۲۳- مسعود حسین خاں بکٹ کہانی- مشمولہ قدیم اردو- ص ۳۸۶
۲۴- جمیل جالبی، ڈاکٹر- تاریخ ادب اردو جلد اول- ص ۲۲۹
۲۵- مسعود حسین خاں- بکٹ کہانی- مشمولہ قدیم اردو- ص ۳۸۷
۲۶- گیان چند جین- پرکھ اور پہچان- ص ۲۴۶
۲۷- مسعود حسین خاں- بکٹ کہانی- مشمولہ قدیم اردو- ص ۳۹۵

۲۸- تنویر احمد علوی - نوائے ادب، اکتوبر ۱۹۶۹ء - ص ۱۵
۲۹- عبدالغفار شکیل - لسانی اور تحقیقی مطالعے - ص ۱۱۸
۳۰- افضل - بکٹ کہانی - مرتبہ مسعود حسین خاں قدیم اردو - ص ۳۹۸
۳۱- گیان چند جین - پرکھ اور پہچان - ص ۲۴۴
۳۲- مسعود حسین خاں "ورود مسعود" - ص ۲۰۱
۳۳- مسعود حسین خاں "ورود مسعود" - ص ۲۱۳-۲۱۴
۳۴- نور الحسن ہاشمی، مرتب بکٹ کہانی، جدید ایڈیشن ۱۹۸۷ء - ص ۲۰۳
۳۵- مسعود حسین خاں - مقدمہ تاریخ اردو، ۱۱ ایڈیشن ص ۱۱
۳۶- گیان چند جین - پرکھ اور پہچان - ص ۲۴۶

پرت نامہ

دبستان بیجاپور کی طرح دبستان گولکنڈہ بھی علم و فن کا گہوارا رہا ہے ۔ قطب الدین فیروز بیدری جو اس دبستان کا شاعر ہے اس کا ذکر ملا وجہی اور ابن نشاطی جیسے نامور شعرا نے کیا ہے اس دبستان کے شاعروں میں فیروز بیدری کو ملا وجہی اور ابن نشاطی جیسے نامور شعرا نے اپنا استاد تسلیم کیا ہے عرصہ تک یہ شاعر گوشہ گمنامی میں پڑا رہا ۔ ڈاکٹر زور نے تذکرہ مخطوطات جلد اول ادارہ ادبیات اردو میں اس کا ذکر کرتے ہوئے فیروز کی ایک مختصر مثنوی توصیف نامہ کی نشاندہی کی ۔

ابن نشاطی اور وجہی نے اپنے کلام میں فیروز اور محمود کا ذکر جس انداز میں کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان شاعروں نے فن شعر میں اتنا کمال حاصل کر لیا تھا کہ ان کے بعد آنے والے شاعروں نے ان کی استاذی کا لوہا مانا

وجہی نے قطب مشتری میں لکھا ہے

کہ فیروز محمود اچھتے جو آج تو اس شعر کوں بھوت ہوتا رواج
کہ نادر تھے دونوں بھی اس کام میں کیا جتیں کتے بول اچھوں نام میں

ابن شاطی نے پھول بن میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے ۔

میں وہ کیا کروں فیروز استاد جو اپنی شاعری کا کچھ سری داد

ڈاکٹر زور کے بعد فیروز کو اس کے کلام کے ساتھ متعارف کرانے کا سہرا ڈاکٹر نذیر احمد کے سر ہے انہوں نے انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے میں پرت نامہ کا نسخہ تلاش کر کے انجمن کے تحقیقی رسالے اردو ادب میں مقدمہ کے ساتھ شائع کیا تھا ۔ ادارہ ادبیات اردو کا نسخہ انہیں دستیاب نہیں ہو سکا تھا ۔ لہٰذا ڈاکٹر نذیر احمد نے بلا مقابلہ صرف ایک ہی نسخہ کی روشنی میں متن کو مرتب کیا تھا جو دوسرے نسخہ کی موجودگی میں تحقیقی مقاصد کی تکمیل نہیں کر سکتا اس سلسلہ میں وہ خود اعتراف

کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"فی الحال وہ نسخے (ادارہ ادبیات اردو) میری دسترس سے باہر ہے اس لئے ذیل میں جو متن پیش کیا گیا ہے وہ بلا مقابلہ ہے لیکن حتی الامکان کوشش اس بات کی کی گئی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو لفظ درست لکھا جائے بہرحال اس متن میں بڑی خامیاں ہیں لیکن اس کے چھپنے میں فائدہ یہ ہے کہ کسی کو دوسرے نسخے سے مقابلہ کی صورت نکل آئے گی۔" (۱)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے پرت نامہ کو ۱۹۶۶ء میں دونوں نسخوں کی مدد سے ترتیب دے کر اس کے مستند اور مکمل متن کو معہ مقدمہ کے شائع کیا یہ ان کا دوسرا بڑا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"اس طرح سے پرت نامہ کی موجودہ ترتیب ڈاکٹر نذیر احمد کے اس ادھورے کام کا تکمیلیہ ہے۔" (۲)۔

بعض ایسے اشعار کا اضافہ بھی کیا ہے جو طبع ہونے کے بعد دستیاب ہوئے تھے اور جن کا اندراج محولہ بالا دونوں نسخوں میں نہیں ملتا۔ پرت نامہ میں فیروز کا نام اور وطن دونوں کی صراحت ہے لیکن اس کے زمانے کے تعین کا مسئلہ تحقیق طلب تھا کسی بھی تذکرے یا ہم عصر تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ فیروز کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد ہی وہ گولکنڈہ چلا آیا تھا ایک شعر میں اس نے اپنا نام اور تخلص کا اس طرح اظہار کیا ہے:

مجھ ناؤں ہے قطب الدین قادری تخلص سو فیروز ہے بیدری (۳)

فیروز کے نام کو نذیر احمد نے قطب الدین فیروز قادری بتایا ہے۔ (۴)

ڈاکٹر زور نے تذکرہ اردو مخطوطات میں میراں محی الدین لکھا ہے۔ (۵)

مسعود حسین خاں نے اس کا پورا نام سید محی الدین قادری بتابا ہے اور

تخلص فیروز۔ انہوں نے پرت نامہ کے مقدمہ میں داخلی شہادتوں کی روشنی میں فیروز کے خالات کو ممکنہ حد تک پردہ خفا سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ فیروز کا وطن بیدر تھا لیکن ڈاکٹر زور نے نسخہ ادارہ ادبیات اردو کی روشنی میں اسے گولکنڈہ کا متوطن بتایا ہے اس نسخہ میں آخری ابیات نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے وطن کی بابت صحیح رائے قائم نہیں ہوسکی اور اس کو دبستان گولکنڈہ کا شاعر اس لئے تصور کیا جاتا ہیکہ اس کی استاذی کا ذکر اس دبستان کے استاذ شعراء نے کیا ہے۔

ادبی اعتبار سے یہ کوئی بڑا اہم نقش نہیں جو استاذ فیروز کے شایان شان ہو لیکن قدیم متن اور ادب سے سلسلہ قائم کرنے میں اہمیت رکھتا ہے۔ لسانی نقطہ نظر سے بھی اس کی اہمیت ہے۔ مقدمہ میں مسعود حسین خاں نے دکن میں قدیم اردو کے تین ادوار کا ذکر کیا ہے اور ان ادوار کی لسانی خصوصیات و ادبی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔

قدیم اردو کا پہلا دور ۱۳۰۰ تا ۱۳۵۰ پر محیط ہے یہ وہ دور ہے جب کہ علاؤ الدین خلجی نے دکن پر اپنی مہمات شروع کیں اس کے بعد تغلق شاہی کے نتیجے میں بہمنی سلطنت کا قیام اور پھر دکن میں مراٹھی کے اثر سے خسرو کی زبان دہلوی نے نیا روپ دھار لیا۔ اور مقامی لسانی اثرات سے وہی زبان اردوئے قدیم کہلائی۔

۲۔ دوسرا دور ۱۳۵۰ء تا ۱۴۳۰ گلبرگہ سے متعلق ہے اس دور میں دکن کا پائے تخت دولت آباد سے گلبرگہ منتقل ہوتا ہے اور یہاں پر مراٹھی اور کنڑی کے باہمی اشتراک سے ہندوی زبان کا اختلاط ہوا اور نئے لسانی ماحول سے دہلوی زبان کی نشو نما ہونے لگی اس دور میں مسعود حسین خاں نے معراج العاشقین کی زبان کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے معراج العاشقین جس کے مصنف اور دور کے بارے میں کافی مباحث ہوچکے ہیں اور محققین اس کو نہ بندہ نواز کی تصنیف بتاتے ہیں اور نہ اس دور کی بلکہ یہ سید شاہ محمد حسینی بلکانوری کی تصنیف ہے یہ دور بھی بہت بعد کا ہے خواجہ بندہ

نواز کے دور کی تصنیف سمجھ کر معراج العاشقین پر جو لسانی بحث کی گئی ہے اور جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں وہ غلط ثابت ہوتے ہیں۔

۳۔ تیسرا دور ۱۴۳۰ء تا ۱۵۲۷ء پر مبنی ہے اس دور میں بہمنی پایہ تخت گلبرگہ سے بیدر منتقل ہوا اس دور میں دونوں ادبی مراکز کنٹر کے علاقے تھے لیکن ان علاقوں کی سرحدات پر مراٹھی اور کنٹری دونوں زبانیں مروج تھیں آج بھی ان دونوں یعنی مراٹھی اور کنٹری زبان کا اثر ان علاقوں پر واضح طور پر ملتا ہے۔ بیدر اس دور میں ایک لسانی مرکز بن چکا تھا۔ نظامی کی کدم راؤ پدم راؤ اس دبستان کا اولین نقش ہے۔ جس کو اردو ادب کا نقش اولین تسلیم کیا گیا ہے۔ اس میں ہندی روایت اور گجری اردو کا نمونہ ملتا ہے۔ مسعود حسین خاں نے قطب الدین فیروز بیدری کو اس تیسرے دور کا شاعر بتایا ہے۔ اس کا ہم عصر ایک اور شاعر قریشی بیدری گذار ہے جس نے بھوگ بل لکھی تھی ان دونوں کی زبان میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ قریشی کے متعلق مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

"قریشی غالباً پہلا مصنف ہے جس نے اردوئے قدیم کو اس کے مقامی نام "دکنی" سے یاد کیا ہے۔" (۶)

قدیم متون کی بازیافت سے قدیم ادب کے کڑیوں کو جوڑا جاتا ہے تو زنجیر طویل ہو جاتی ہے لیکن اس قدیم متن خاص کر دکنی زبان و ادب پر کام کرنے کے سلسلہ میں نذیر احمد نے تین دشواریوں کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ قدیم زمانے میں صوفیائے کرام نے اپنے مقصد کے تحت سادہ اور ایسی زبان کو رواج دیا جس کو عوام باآسانی سمجھ سکیں۔

پہلی دشواری تو یہ ہے کہ

" دکنی زبان کے ابتدائی نمونے موجودہ زبان سے اس حد تک متفاوت رکھتے ہیں کہ ان کا سمجھنا بہت دشوار ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

موزوں منظوم کلام طبعاً زیادہ مرغوب اور موثر ہوتا ہے۔(۷)

دوسری دشواری یہ بتائی کہ دکنی قواعد اور لغت کی محرومی کی وجہ سے اس وقت تک اس کو صحیح طور سے نہیں سمجھا جاسکا۔

بعض صوفی شعراء مصنفین کے سرسری حالات کچھ تذکروں میں مل جاتے ہیں شمالی ہند میں جو تذکرے لکھے گئے ان میں جنوبی ہند کے شعراء و مصنفین کے نام بہت کم ملتے ہیں۔جنوبی ہند کے بھی بہت سے تذکرے قدیم دکھنی اہل قلم کے تذکروں سے یکسر خالی ہیں۔اس سلسلہ میں انہوں نے مورخوں کی خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔(۸)

داخلی شہادت کی روشنی میں نذیر احمد نے صرف یہی لکھا کہ فیروز، وجہی اور ابن نشاطی سے قبل کا شاعر ہے۔

کہ فیروز آخواب میں رات کوں　　دعا دے کے چومے میرے ہات کوں (۹)

صرف ایک شہادت کے سوا فیروز کو گولکنڈہ سے وابستہ کرنے کے لئے کوئی شہادت نہیں ملتی شاعر کے بارے میں معلومات فراہم کرنے بعد مسعود صاحب نے متن کی تدوین کو دونوں نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے۔مرتب خود رقمطراز ہیں:

"انجمن اور ادارہ دونوں کے نسخوں کا مقابلہ کرنے سے فن کی ان خامیوں کا ازالہ ہو گیا اور اکثر اشکال دور ہو گئے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ایک شعر نمبر ۴۴ جو انجمن کے نسخے میں غائب تھا ادارہ کے نسخہ میں مل گیا اور اس طرح پرت نامہ کا ۱۲۱ ابیات پر مشتمل متن تیار ہو گیا۔"(۱۰)

آخر میں پھر انہوں نے صداقت کا اعتراف کیا ہے کہ:

"فیروز کی اس مثنوی کا ایک ورق علاؤالدین جنیدی صاحب (گلبرگہ) کے توسط سے انہیں حاصل ہوا جب اس کو مرتب شدہ متن سے ملا کر

دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں کل ۳۶ اشعار درج ہیں جو مرتب شدہ متن کے نمبر ۴۵ تا ۸۰ پر حاوی ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس نئے دستیاب شدہ مواد سے بھی پرت نامہ کے اس ایک گم شدہ شعر کا پتہ چل نہ سکا جس کی وجہ سے یہ مثنوی نامکمل رہ گئی۔" (۱۱)

پروفیسر سیدہ جعفر نے پہلے حوالہ کی بنیاد پر لکھا ہے کہ ۱۲۱ ابیات پر مشتمل متن تیار کیا ہے اور فیروز بیدری کے ایک شعر کا حوالہ دیا ہے۔

صد و بیست دیک جب کیا بیت میں دو حگب مدح کے ماریا سیت میں (۱۲)

اس کی ترتیب کے اتنے عرصہ بعد بھی اس پر مزید نہ کوئی مضامین شائع ہوئے اور نہ اس کی علحدہ کتابی شکل میں مثنوی شائع ہوئی۔

مسعود حسین خاں نے مقابلے اور موازنے کی مدد سے قدیم متن کی گتھیاں ایک خاص حد تک سلجھانے کی کوشش کی ہے فیروز کے حالات زندگی کو ممکنہ حد تک تلاش کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ داخلی شہادتوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ فیروز کے مرشد محمد ابرہیم مخدوم جی شیخ محمد ملتانی بیدر کے مشوہر عالم و بزرگ کے صاحبزادے تھے ان کا انتقال بیدر میں ۱۵۶۳ء میں ہوا۔ ابراہیم مخدوم جی کے والد محمد شمس الدین ملتانی بیدر کے معروف ملتانی خاندان سے تھے آپ شیخ ابراہیم ملتانی کے صاحبزادے تھے جنہیں شیخ المشائخ شیخ حسن قادری بنگالی نے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے ارشاد پر بیدر تشریف لاکر قادری سلسلہ میں بیعت کروائی تھی۔ ڈاکٹر سلیمان صدیقی مخزن الکرامات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"خود حضرت عبدالقادر جیلانیؒ آپ کے خواب میں آئے اور اپنے مسلک کی تعلیم دی محمد شمس الدین ملتانی نے وہیں ۸۶۲ھ م ۱۴۵۷ء میں آنکھ کھولی اور ۹۴۵ھ م ۱۵۲۸ء میں بمقام بیدر ہی میں آنکھیں بند کر لیں۔" (۱۳)

فاضل مضمون نگار نے شیخ ابراہیم مخدوم جی قادری کو قطب شاہ کے دور کے بزرگ بتایا ہے اور تاریخ وفات ۱۵۲۸ء بتائی ہے۔ مسعود حسین خاں نے سن وفات ۱۵۶۳ء لکھا ہے جب کہ جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو جلد اول میں پرت نامہ کا سن تصنیف ۹۷۳ھ م ۱۵۶۵ء بتایا ہے۔ مذکورہ بالا محققین نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ پرت نامہ کے وقت فیروز کے مرشد مخدوم جی بقید حیات تھے کیوں کہ اس نے اپنے اشعار میں انہیں اس طرح دعا دی ہے جس طرح ایک بقید حیات شخص کو دی جاتی ہے۔

براھم مخدوم جی جیونا ے صرف وحدت سدا پیونا (۱۴)

مسعود صاحب نے ان اشعار کا حوالہ دیا ہے۔

محی الدین تیرا تو میرا میاں تو میرے محی الدین کے درمیاں
کیا تو کہ فیروز میرا مرید بڑے بخت میرے جو تیرا مرید

ان حوالوں کی روشنی میں مسعود حسین خاں کا دیا ہوا سن وفات ۱۵۶۳ء غلط ثابت ہوتا ہے۔

پرت نامہ ایک طرف مرشد کی مدح میں لکھی ہوئی مثنوی ہے لیکن اس کے اصل ممدوح عبدالقادر جیلانی ہیں اس میں اپنے پیرو مرشد کی تعریف و توصیف بھی بیان کی ہے۔ نذیر احمد لکھتے ہیں:

"یہ ایک مختصر مثنوی ہے جس میں عبدالقادر جیلانی کی مدح عقیدت مندانہ طرز پر ملتی ہے۔ جو اس کے عنوان سے ظاہر ہے۔

"ایں پرت نامہ حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ" (۱۵)

جمیل جالبی اس کے برعکس لکھتے ہیں:

"غور سے اس مدحیہ نظم کو مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کو لکھنے کا مقصد حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح نہیں بلکہ یہ

ساری پیش بندی اپنے پیر و مرشد مخدوم جی کی مدح کے لئے تھی۔
طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ پہلے غوث اعظم کی تعریف کر کے

علی بعد بر حسن امام ولی محی الدین اور سو پیر میرا ہے (۱۶)

جو زور بیان حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کی مدح میں ہے وہ مخدوم جی کی مدح میں نہیں، مخدوم جی کی مدح ثانوی درجہ کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اس مثنوی میں شاعر ایک خواب کی کیفیت کو نظم میں پیش کرتا ہے خواب میں اس نے حضرت عبد القادر جیلانیؒ کو دیکھا اور جب بیدار ہوا تب سامنے پیر مخدوم جی تھے اس نے وہ تمام صفات جو غوث اعظم سے منسوب کئے ہیں ان کو اپنے مرشد سے منسوب کیے ہیں۔ یہ توصیف نامہ فیروز نے بیعت حاصل کرنے کے فوری بعد لکھا ہے۔ پرت نامہ میں فیروز نے جس زبان کا استعمال کیا ہے مسعود صاحب نے لسانی خصوصیات کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور اس دور کی زبان کی تشکیل اور صوتی و لسانی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

"زبان کے تشکیلی دور پر گہری نظر اور لسانی شعور نے قدیم متون کی ترتیب و تدوین میں مسعود حسین خاں کی اچھی رہبری کی ہے۔ دکنی ادب پاروں کی ایڈیٹنگ کرتے ہوئے مقدمے میں انہوں نے صوتیاتی اور لسانی پہلو کی طرف بلیغ اشارے کئے ہیں۔" (۱۷)

مقدمہ میں قریشی اور فیروز کی زبان کی مشترک خصوصیات کی وضاحت کرتے ہوئے ان افعال کی طرف اشارہ کیا ہے جو بعد میں دبستان گولکنڈہ میں مسلسل استعمال کی گئی ہیں۔ مثلاً

دسنا، رسیونا، سیلانا، اچھنا، رجانا، بیچنا وغیرہ۔ متن کی لسانی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ معیاری دکنی دبستان بیدر میں دبستان گولکنڈہ سے پہلے جنم لے چکی تھی۔

"چ" تاکیدی یا تخفیفی اور "نکو" جو مرہٹی الفاظ ہیں یہ دونوں فیروز اور قریشی

کے یہاں ملتے ہیں ۔ تقریباً (۱۴) صفحات کے مقدمہ کے بعد انہوں نے اختلاف نسخ اور فرہنگ بھی پیش کی ہے ۔ یہ مثنوی معتبر متن اور سائنٹفک اساس پر مرتب کی گئی اس میں ۱۲۰ اشعار ہیں ۔ مثنوی کی ترتیب کے بعد ایک ضمیمہ پیش کیا گیا ہے ۔ ضمیمہ میں شعر نمبر ۴۴ کے بارے میں جو نہ مل سکا اس کا افسوس ظاہر کیا ۔

ان کے اس تحقیقی کارنامے کے سلسلہ میں پروفیسر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

"قدیم دکنی متون کی تدوین کا حق ان ادیبوں کو زیادہ پہنچتا ہے جو پراکرت کے مختلف مدارج اور اس کے لسانی مزاج سے ضروری واقفیت اور علم لسانیات میں درک رکھتے ہیں اور جن میں اس کے اطلاقی پہلو کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو ۔ اس پر کم محققین پورے اترتے ہیں ۔ مسعود حسین خاں کا نام سرفہرست نظر آتا ہے ۔ وہ تدوین کے آداب سے آشنا اور اصول تحقیق کے رمز شناس ہیں ۔" (۱۸)

==========

پرت نامہ

۱۔نذیر احمد، ڈاکٹر۔اردو ادب انجمن ترقی اردو علی گڑھ، جون ۱۹۵۸ء۔ص

۲۔مسعود حسین خاں۔قدیم اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد ۱۹۶۶ء۔ص ۳۲۵

۳۔نذیر احمد، ڈاکٹر۔اردو ادب انجمن ترقی اردو علی گڑھ، جون ۱۹۵۷ء۔ص ۹۱

۴۔نذیر احمد۔اردو ادب انجمن ترقی اردو علی گڑھ، جون ۱۹۵۷ء۔ص ۸۸

۵۔محی الدین قادری زور ڈاکٹر۔تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول۔ادارہ ادبیات اردو۔ص ۱۴۸

۶۔مسعود حسین خاں۔قدیم اردو جلد اول۔عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۶۶ء۔ص ۳۴۲

۷۔نذیر احمد۔اردو ادب انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔ص ۸۹

۸۔نذیر احمد۔اردو ادب انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔ص ۸۹

۹۔نذیر احمد۔اردو ادب انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔ص ۹۰

۱۰۔مسعود حسین خاں۔پرت نامہ، قدیم اردو عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۶۶ء۔ص ۳۳۶

۱۱۔مسعود حسین خاں۔پرت نامہ، قدیم اردو عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۶۶ء۔ص ۳

۱۲۔سیدہ جعفر، پروفیسر۔مسعود حسین خاں اور دکنی متون کی ترتیب۔فکر ونظر، نذر مسعود۔ص ۲۱۴

۱۳۔ڈاکٹر سلیمان صدیقی۔سب رس، ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد ستمبر ۰۸۷۔ص ۱۴

۱۴۔جمیل جالبی، ڈاکٹر۔تاریخ ادب اردو جلد اول۔ص ۳۹۷

۱۵۔نذیر احمد۔اردو ادب علی گڑھ ۱۹۵۷ء۔ص ۹۴

۱۶۔جمیل جالبی، ڈاکٹر۔تاریخ ادب اردو۔ص ۳۹۷

۱۷۔سیدہ جعفر، پروفیسر۔نذر مسعود۔فکر ونظر، علی گڑھ۔ص ۲۱۶

۱۸۔سیدہ جعفر، پروفیسر۔نذر مسعود۔فکر ونظر، علی گڑھ۔ص ۲۱۷

ابراہیم نامہ

بہمنی سلطنت کے بجھتے چراغ کی ٹمٹماتی لو سے دکن میں پانچ سلطنتوں کے چراغ روشن ہوئے ان میں قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں نے علم و ادب کی بیش بہا خدمات کی ہیں ۔ عادل شاہی سلطنت کے چھٹے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے (۱۵۷۹۔۱۶۲۶) علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اس وقت گولکنڈہ میں محمد قلی قطب شاہ علم و ادب کی سرپرستی کر رہا تھا ۔ اور ادھر شمال میں شہنشاہ اکبر اپنی عظمت کا ایک عالم سے لوہا منوا رہا تھا ۔ محمد قلی قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ ثانی دونوں کی شخصیت میں غیر معمولی مماثلت کا احساس ہوتا ہے ۔ دونوں قادر الکلام شاعر تھے ۔ شراب و شباب اور رقص و موسیقی کے دونوں رسیا تھے دونوں بادشاہوں نے علم و ادب کی غیر معمولی سرپرستی کی محمد قلی قطب شاہ کے دربار سے وجہی وابستہ تھا تو ابراہیم عادل شاہ کا درباری شاعر عبدل دہلوی ثم بیجاپوری تھا ۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی نے علم و فن ، شعر و ادب اور موسیقی کو فروغ دیا ۔ شعراء کی سرپرستی کی اسے فن موسیقی میں مہارت تام حاصل تھی ۔ " نورس " اس کی ایک ایسی تصنیف ہے جس میں شعر و نغمہ کا بہترین امتزاج ملتا ہے اردو ادب کی تنقیدی تاریخ میں پروفیسر احتشام حسین " نورس " کے بارے میں لکھتے ہیں :

"علم موسیقی کے لحاظ سے یہ بے مثال تخلیق ہے ۔ " (۱)

" نورس " میں شاعر نے موسیقی کی اصطلاحوں راگ راگنیوں میں نئے نئے اضافے کئے ہیں ۔ اسی عالم و علم پرور بادشاہ کے دربار میں ظہوری ، ملک مقیمی ۔ آتشی ، نوری ، حیدر ، ذہنی ۔ باقر کاشی ، عبدل اور زہری نے ابراہیم عادل شاہ کی شان میں قصیدے لکھے ۔ اس عہد کا مشہور شاعر عبدل ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار سے

وابستہ تھا اس کی تخلیقی کاوش "ابراہیم نامہ" دبستان بیجاپور کا ایک ادبی اور تاریخی کارنامہ ہے۔شاعر عبدل دبستان گولکنڈہ کے درباری شاعر وجہی کا ہمعصر تھا۔

ابراہیم نامہ قطب مشتری کے دو سال بعد یعنی ۱۶۱۱ء میں تصنیف ہوا۔ مقدمہ کے آغاز میں مسعود حسین خان لکھتے ہیں کہ ابراہیم نامہ دبستان بیجاپور کا پہلا ادبی نقش ہے لیکن مقدمہ کے صفحہ (۳۶) پر ابراہیم نامہ کو قدیم اردو کی پہلی ادبی مثنوی قرار دیا ہے ان کی مراد دبستان بیجاپور سے ہے نہ کہ پورے دکنی ادب سے۔ گیان چند جین صاحب کو بھی یہ تسامح ہوا ہے اس کے بعد وہ بھی استدلال کرتے ہیں:

"اس سے قبل کی مثنویات نظامی کی کدم راؤ پدم راؤ اشرف کی نوسرہار اور برہان الدین جانم کا ارشاد نامہ اخلاقی مذہبی اور صوفیانہ موضوعات پر مشتمل ہیں نہ تو ان کے موضوعات ادبی ہیں اور نہ اسالیب۔" (۲)

ڈاکٹر صاحب کے استدلال میں نظامی کی مثنوی کو شریک نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ یہ اب ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اردو کی پہلی ادبی مثنوی ہے۔

پروفیسر گیان چند جین مسعود صاحب کے اس بیان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نظامی کی مثنوی کے حد تک یہ بیان صحیح نہیں اس کا موضوع اخلاقی مذہبی یا صوفیانہ نہیں اس میں ایک داستان نظم ہے اور یہ اردو کی پہلی ادبی مثنوی ہے۔" (۳)

یہ مثنوی اس وقت منظر عام پر نہیں آئی تھی اس لئے مسعود صاحب کو متن بارے میں صحیح اندازہ نہیں تھا۔

مسعود صاحب نے ابراہیم نامہ کے مقدمہ میں ایک جگہ قطب مشتری سے تقابل کرتے ہوئے لکھا کہ وجہی کی قطب مشتری اور عبدل کا ابراہیم نامہ دونوں ایک قسم

کے شاہنامے ہیں ساتھ میں ان کے بنیادی فرق کا بھی تجزیہ کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ابراہیم نامہ صحیح معنوں میں شاہنامہ ہے۔علی نامہ لکھتے وقت نصرتی کے پیش نظر ابراہیم نامہ کا تصور بھی رہا ہوگا۔" (۴)

قطب مشتری میں واقعات اور پلاٹ کی ترتیب اور شہری تزئین وغیرہ پر افسانوی رنگ غالب ہے جب کہ ابراہیم نامہ میں تاریخ کے اوراق بھرپور زندگی کے عکاس ہیں۔ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں اس کی علم پروری اور فیاضی کی وجہ سے بیجاپور کو خاص اہمیت حاصل ہو چکی تھی۔دور دور سے صوفیاء، علماء شاعر اور نثر نگاروں کی آمد سے یہ شہر ہمہ رنگ بن گیا تھا۔ابراہیم عادل شاہ نے اس شہر کی آرائش میں بڑی دلچسپی دکھائی تھی۔عبدل نے ابراہیم نامہ میں جگت گرو ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ ساتھ شہر کی تعریف اور محلات کی خوبصورتی کا خاکہ پیش کیا ہے۔جب کہ وجہی نے قطب مشتری میں اپنے فن شعر اور تخیل سے کام لیا ہے اور محمد قلی کو مرکزی کردار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔عبدل نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے اوصاف اخلاق اور اس کے تمام کارناموں کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔

ابراہیم نامہ میں شاعر نے ابراہیم عادل شاہ کی شخصیت کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ابراہیم عادل شاہ ثانی ۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوا۔اس وقت وہ کمسن تھا جس کی وجہ سے کامل خاں، کشور خاں، اخلاص خاں اور دلاور خاں کا تختہ مشق بنا رہا پھر اس کی چچی چاند بی بی نے سرپرستی اپنے ذمہ لی اور تعلیم و تربیت پر کڑی نگرانی رکھی۔۱۵۹۰ء میں دلاور خاں کے زوال کے بعد زمام حکومت حقیقی معنوں میں ابراہیم عادل شاہ کے ہاتھ میں آئی جس کے ساتھ چھ سال کے مختصر عرصہ میں اس نے سلطنت کو استحکام بخشا اور دارالسلطنت کا نام بدیاپور رکھا۔

سنوں اب صفت شہ رہن تخت ٹھاوں　　بدیاپور نگر ہے بھی اس کا جو ناؤں
کہ دھن اس زمیں ٹھاوں ہے بخت بھر　　بسیا سیں جس کے بدیاپور نگر

تحقیق ایک دشوار کن مرحلہ ہے جسے محقق بڑے سکون اور صبر کے ساتھ انجام دیتا ہے ترتیب متن کے سلسلہ میں محقق کو ادبی تحقیق سے کہیں زیادہ تاریخی تحقیقی نکات کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مثنوی ابراہیم نامہ کو ترتیب متن کے تمام اصولوں کے پیش نظر مرتب کیا ہے۔

ابراہیم نامہ کو سب سے پہلے بھگوت دیال ورما نے رسالہ ہندوستانی الہ آباد جنوری ۱۹۳۳ء میں متعارف کروایا تھا اپنے مضمون میں انہوں نے ایک ہی نسخہ ریاست (اودھ) مہاراشٹرا کا ذکر کیا تھا۔ لیکن اس کا دوسرا نسخہ سالار جنگ لائبریری میں بھی موجود ہے جس کا ذکر سب سے پہلے نصیر الدین ہاشمی نے اپنی فہرست میں کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اسی نسخہ کی نقل لے کر ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ کیا ہے جس کا ذکر انہوں نے تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول میں کیا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے قیام حیدرآباد کے دوران ابراہیم نامہ کو معہ مقدمہ کے مرتب کر لیا تھا جو شعبہ لسانیات مسلم یونیورسٹی پہنچنے کے بعد ۱۹۶۹ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ مسعود صاحب نے اس پر ۷۶ صفحات کا مقدمہ لکھا ہے۔

ڈاکٹر زور نے "ہوں" کی قرات "ہور" کی مناسبت سے عبدل کو دہلوی بتایا ہے۔ "زبان ہندوی مجھ سو ہور دہلوی کے" پیش نظر نذیر احمد نے بھی عبدل کو دہلوی مانا ہے۔(۵)

مسعود حسین خاں نے دونوں مخطوطوں کا بغور جائزہ لیا اور داخلی شہادت کی روشنی میں بتایا کہ لفظ "ہور" نہیں بلکہ "ہوں" ہے جس کی بابت لکھتے ہیں کہ عبدل سوائے ہندوی اور دہلوی کے کوئی اور زبان نہیں جانتا تھا۔ عبدل نے ابراہیم نامہ کا سنہ تصنیف خود پیش کیا ہے۔

بچن پھول گوندیوں، براہم نام کہا سہس پر برس بارہ تمام

ڈاکٹر صاحب سے قبل کے محققین جن میں ڈاکٹر زور، نصیر الدین ہاشمی اور نذیر احمد شامل ہیں مصرع ثانی سے ۱۰۱۲ھ تاریخ تصنیف بتائی ہے۔ سہس ہزار کی مناسبت سے ہے۔ لیکن مسعود صاحب نے خاتمہ کے عنوان کو شہادت بنا کر جو تاریخ کا تعین کیا وہ بڑی دیدہ ریزی اور کمال تحقیق سے کیا ہے۔

"در تواریخ ختم کتاب ابراہیم نامہ شہور سنہ ۱۰۱۲ھ

اس عنوان کی روشنی میں ان کا استدلال ہے کہ مشہور سنہ ہجری سال سے الگ سال ہوتا ہے۔ جو مطابق ہے ۲۵/ مئی ۱۶۱۱ء، ۲۴/ مئی ۱۶۱۲ء م ۲۱۔۱۰۲۰ھ (۶)
سنہ مشہور کے بارے میں بہت کم لوگوں کو صحیح علم ہے اس کا اعتراف خود گیان چند جین نے کیا ہے۔

"میں نے کبھی شہور کا نام نہیں سنا حبیب الرحمن صابری کی مفتاح التقویم دیکھی اس میں بھی اس کا ذکر نہیں ملا لغت میں بھی یہ معنی نہیں ملے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مسعود صاحب کی دریافت صحیح ہے۔" (۷)

عبدل کے حالات زندگی اور اس کے صحیح نام کا تعین اب تک نہیں ہو سکا تھا داخلی شواہد کی روشنی میں پروفیسر مسعود حسین خاں نے یہ مشکل حل کی۔ عبدل کے نام کے سلسلہ میں قیاس سے کام لیکر ڈاکٹر زور، عبدالغنی اور نصیر الدین ہاشمی نے فہرست مخطوطات سالار جنگ میں عبدالغنی" یا عبدالقادر لکھا ہے۔ جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو جلد اول میں سخاوت مرزا کے حوالے سے شاعر کا نام "عبدالگیتی" یعنی دنیا کا بندہ بتایا ہے لیکن لسانی اور عربی و فارسی تراکیب کی روشنی میں درست نہیں معلوم ہوتا۔ مسعود حسین خاں نے عبدل کے نام کے سلسلہ میں لسانی شہادتوں کی روشنی میں طویل بحث کی ہے۔ اس طویل بحث کا نتیجہ یہ ہے۔

اعراب اور "ت" کے دونوں لفظوں کی موجودگی میں اسے

کس طرح عبدالکینی اور پھر عبدالگنی (عبدالغنی) نہیں پڑھا جا سکتا مزید برآں اگر اس شعر کو عبدالغنی تخلص پڑھا جائے تو اس کے معنی مجہول سے ہو جاتے ہیں ۔" (۸)

انہوں نے اس سلسلہ میں بتایا ہے کہ عبداللہ نام میں اور ناموں کی طرح عبدل سے ہٹ کر نام نہیں پکارا جاتا ۔ لہذا مصنف کا نام عبداللہ ہوگا ۔ عبداللہ کا مخفف عبدل شمالی ہند کا نام ہے ۔ جو درست اور دلچسپ انکشاف ہے ۔

اس مثنوی کے پہلے محقق پروفیسر بھگوت دیال ورما نے ابراہیم نامہ کے اشعار کی تعداد ۷۱۲ بتائی ہے ۔ ڈاکٹر زور نے کل ابیات کی تعداد ۷۵۰ بتائی ہے ۔ نصیرالدین ہاشمی نے ۷۴۴ لکھی ہے ، ڈاکٹر مسعود حسین نے ابراہیم نامہ دو مخطوطات کی روشنی میں مدون کیا ہے جس میں کل ابیات کی تعداد ۷۱۳ ہے ، لیکن ادارہ ادبیات اردو میں جو مخطوطہ ہے (مرتبہ ڈاکٹر زور) میں کل ابیات کی تعدا ۰۵ ۔ صاحب نے (۷۴۴) ابیات کس طرح لکھ دیا ہے مسعو ۔ ب ن دی ہوئی تعد دہی درست معلوم ہوتی ہے ۔

ابراہیم نامہ میں حمد اور نعت کے بعد مدح یاران رسول یعنی خلفائے راشدین کی مدح کی گئی ہے ۔ اس لئے مسعود حسین خاں نے مصنف کو سنی العقیدہ بتایا ہے ۔ ادبی اور فنی نقطہ نظر سے یہ ضروری نہیں ، ادیب یا فن کار کے لئے عقیدہ یا مذہب سے کہیں زیادہ ماحول اور تخیل کی اہمیت ہوتی ہے یہ ایک ایسی مثنوی ہے جو بادشاہ کی فرمائش پر لکھی گئی ہے ۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں صرف بادشاہ کے عقیدہ کی تائید کی گئی ہے ۔

" ابراہیم عادل شاہ سنی العقیدہ تھا اس کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ اس کے چار بیٹے تھے اول درویش بادشاہ جو ملکہ جہاں کے بطن سے تھا اور شیعہ استادوں کی تربیت سے شیعہ ہو گیا تھا اس لئے بادشاہ نے اس کو اپنا ولی عہد نہیں

بنایا۔" (۹)

خلفائے راشدین کی مدح کے بعد حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تعریف ہے جن کا نام بیجاپور اور دکن کے تمام اہل فن کا مرکز عقیدت ہے۔

ابراہیم نامہ میں ممدوح ابراہیم عادل شاہ کے کردار کا مکمل نمونہ ملتا ہے اور شہر بدیاپور یا بیجاپور کا تفصیلی ذکر ملتا ہے اس سے قبل بھی ذکر کیا جاچکا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے ہاتھوں میں زمام حکومت ۱۵۹۰ء میں حقیقی معنوں میں آئی اس کے ساتھ ہی چھ سال کے مختصر سے عرصہ میں اس نے سلطنت کو استحکام بخشا۔ دارالسلطنت کا نام بیجاپور سے بدل کر بدیاپور رکھا اور شہر کی تزئین نو کا کام شروع کیا ۱۵۹۰ء تا ۱۶۰۰ء کے درمیان یہ کام شروع ہوا اس دور میں بیجاپور علم و فن کے مرکز کے ساتھ ساتھ خوبصورت شہر بھی بن چکا تھا جس کی شہادت ابراہیم نامہ میں موجود ہے۔ ۱۰۱۲ھ م ۱۶۰۳ء میں بیجاپور کا نام تبدیل ہوا۔

سنوں اب صفت شہ دھن تخت ٹھاؤں ۔۔۔ بدیاپور نگر ہے بھی اس کا جو ناؤں
کہ دھن اس زمین ٹھاؤں ہے بخت بھر ۔۔۔ بسیا سیں جس کے بدیاپور نگر (۱۰)

عبدل نے عادل شاہی عظمت کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ خود اس کے شعر سے واضح ہوتا ہے:

نہ باقی رہے کچھ تو عالم نشان ۔۔۔ اگر کچھ رہے تو بچن شعر جان (۱۱)

اس مثنوی میں شاعر نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی صورت و سیرت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ صرف تعریف یا قصیدہ کی شکل نہیں بلکہ یہ ایک تاریخی شہادت بھی ہے تاریخ کی روشنی میں بھی اس کے عدل و انصاف اور نیک سیرت ہونے کا ثبوت ملتا ہے اس مثنوی کی تصنیف کے وقت ابراہیم عادل شاہ ثانی کی عمر ۴۰ سال کے لگ بھگ تھی جس کا عکس مثنوی میں یوں ملتا ہے:

یوں شہ روپ کی سن کہانی تمام ۔۔۔ نہ رہ کر سکیا مصر یوف مدام

کہ مجھ روپ تھے ھوا دھک شہ دکھن   کلا روپ بھر کر سوچو سٹھ لکھن
کہیں لال مہندی نکھو پردھرے   دسے جیوں سو گو مید مانک جڑے

اس کی شخصیت اور صورت کا خاکہ "نورس" میں بھی جھلکتا ہے:

"ایک ہاتھ میں ساز ہے دوسرے ہاتھ میں کتاب ہے جس کو وہ دیکھتا ہے اور نورس گیت گاتا جاتا ہے اس کا لباس زعفرانی ہے دانت کالے اور ناخن پر مہندی لگی ہوتی ہے۔" (۱۲)

عبدل نے ابراہیم نامہ میں جو زبان استعمال کی ہے اس میں کئی بولیوں کی آمیزش نظر آتی ہے موسیقی کی ہندی اصطلاحات کو خاص دخل ہے ابراہیم نامہ میں جو صناعی ملتی ہے اس کا جواب قدیم اردو ادب میں اور کہیں نہیں ملتا۔ عبدل اپنے اسلوب کا خود بانی ہے۔" (۱۳)

ابراہیم نامہ میں دکنی اردو کے کلیدی صرفی اور نحوی خصوصیات مثلاً "چ" تاکیدی نکو، آکو، جاکو، نہیں ملتے لیکن قواعد کا عام کینڈا اور فرہنگ ہم عصر شعرا، وجہی، صنعتی، سے ملتا ہے۔ ہندی لغات کی بہتات ہے۔ جو دبستان بیجاپور کی خصوصیت رہی ہے جس کے متعلق مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

"سترھویں صدی کے اختتام تک بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کے قیام کے بعد اس کا ایک نیا مرکز کنڑ کے علاوہ تلگو کے علاقے میں بھی قائم ہو جاتا ہے...... ابتداء سے کیا بااعتبار صوتیات، کیا بااعتبار صرف و نحو اور کیا بااعتبار لغت و عروض اس میں عربی و فارسی کے وہ عناصر ترکیبی شامل رہے ہیں جو اردو ہندی میں ما بالامتیاز ہیں تاریخی نقطہ نظر سے بھی اس عہد کا سرمایہ ادب قدیم اردو کا پہلا نقش ہے" (۱۴)

اس کے سوا دوسرا یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ شاعر یا تو نووارد تھا یا بچپن میں

شمالی ہند سے منتقل ہو چکا تھا اور ہندی الفاظ پر عبور رکھتا تھا۔

مرتب نے اپنی تحقیق میں یہ واضح کیا ہے کہ مصنف بچپن میں والدین کے ساتھ ہجرت کر کے بیجاپور آیا یہیں اس کے والدین بیجاپور کے دبستان سے وابستہ ہو گئے اس مثنوی کی زبان سے (۱۶۱۲ء) کے دبستان بیجاپور کی ادبی فضا کا اندازہ ہوتا ہے یہی وہ زمانہ ہے جبکہ شمالی ہند کے ہندی شعراء ابراہیم عادل شاہ کی توجہ کا مرکز بنتے جا رہے تھے بادشاہ خود دکنی اردو میں بھی فکر سخن کرتا تھا اس مثنوی میں عبدل نے ابراہیم عادل شاہ کی "نورس" کے علاوہ "بدھ پرکاش کا بھی ذکر کیا ہے

کہیں مل جو قوال ڈھاری سو آئے نورس بدھ پرکاش گاویں او کھاڑے

عبدل کی زبان اور وطن کے بارے میں سب ہی محققین ادب نے ایک ہی قسم کا بیان دیا ہے۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"زبان ہندوی مجھ سوں ہوں دہلوی۔"

اس مصرع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق دہلی سے تھا ممکن ہے اس کا خاندان کسی وقت دہلی سے دکن آکر آباد ہو گیا۔ (۱۵)

گیان چند جین لکھتے ہیں:

"مسعود صاحب نے دونوں مخطوطات کو بغور دیکھ کر طئے کیا ہے کہ

یہ لفظ "ہور، نہیں "ہوں" ہے یعنی عبدل خود کو دہلوی بتاتا ہے" (۱۶)

عبدل دہلوی تھا لیکن سرزمین دکن پر بس جانے کی وجہ سے اس کی زبان پر برج بھاشا کا اثر زیادہ ملتا ہے۔ یا پھر مغربی ہندی کا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاعر خاک دہلی سے کبھی تعلق رکھتا تھا لیکن بیجاپور آیا تو یہاں کی فضا میں ایسا گھل مل گیا کہ اب بیجاپور کی لسانی خصوصیات اس کا حصہ بن گئیں۔ جمیل جالبی ابراہیم نامہ کی لسانی خصوصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ابراہیم نامہ فارسی مثنوی کی ہیئت اور فارسی بحر فعولن، فعولن، مفعول میں لکھی گئی ہے اور یہاں واضح طور پر ہندی و فارسی اسلوب و آہنگ میں کشمکش کا احساس ہوتا ہے۔" (۱۷)

اس مثنوی میں شاعر نے ایک طرف حقیقت پسندی کو ملحوظ رکھا ہے تو دوسری طرف شاعرانہ حسن کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اختلاف نسخ کم ہونے کی وجہ سے مسعود صاحب نے متن کے ساتھ ہی فٹ نوٹ دے دیے ہیں جسکی وجہ سے قاری کو متن کے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے۔

پروفیسر سیدہ جعفر نے اس مثنوی کے بارے میں لکھا ہے کہ "ابراہیم نامہ مثنوی کی ہیئت میں دراصل ایک طویل قصیدہ ہے جس کا مرکز ابراہیم عادل شاہ کی ذات گرامی ہے اور عبدل نے اس کے پایہ تخت اس کی بزم آرائی ادب پروری....... کی دل کھول کی ستائش کی ہے۔" (۱۸)

صرف تعریف بالا اگر کسی صنف میں ہو تو اسے قصیدہ نہیں کہا جاسکتا قصیدہ کے لئے اس کے مخصوص اجزائے ترکیبی کا ہونا بھی ضروری ہے مدح یا ذم مخصوص صنف کا موضوع ہے اسی لئے دیگر تمام محققین اور ڈاکٹر صاحب نے اس کو مثنوی ہی لکھا ہے۔ اس مثنوی کے کل ۴۵ عنوانات ہیں جن میں سوائے ایک کے تمام عنوانات فارسی میں ہیں مسعود صاحب نے ابراہیم نامہ کے آخری حصہ کے ۱۷ عنوانات کو ذیلی عنوانات کے تحت ترتیب دیا ہے۔ مخطوطہ سالار جنگ اور مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو کے عنوانات مطبوعہ نسخہ کے عنوانات کے ساتھ درج ہیں۔ فرق اس طرح ہے

مرتبہ ابراہیم نامہ کے عنوانات۔

۱۔ در تعریف پیشانی و ٹیکہ جرت۔ ۲۔ در تعریف ٹیکہ مشک (زعفرانی یا سیاہ ٹیکہ)۔ ۳۔ در تعریف مکر بینی (ناک کا بلاق) ۴۔ در تعریف دورہ چشم۔ ۵۔ در تعریف تان در گوش۔ ۶۔ در تعریف لب لعلی برگ۔ ۷۔ در تعریف سیاہ دندان۔ ۸ در تعریف

گلوئے تسبیح مروارید۔۹۔ در تعریف دست ولشکن ۔۱۰۔ در تعریف کمروزرکمر

عنوانات مخطوطہ ۔

۱۔ در تعریف پیشانی و ٹیکہ جرجریت ۔ ۲ ۔ در تعریف ٹیکہ مشک ۔ ۳ ۔ در تعریف مکر بینی ۔ ۴۔ در تعریف دورہ چشم ۔۵۔ در تعریف گوش ۔۶۔ در تعریف لب و تعلی برگ ۔ ۷ ۔ در تعریف سیاہ مسی دنداں ۔ ۸ ۔ در تعریف تسبیح مراورید ۔ ۹۔ در تعریف دست ولشکن ۔

مقدمہ میں مسعود حسین خاں صاحب نے اس دور کی ان تمام خوبیوں کا ذکر کیا ہے اور اس پر سیر حاصل بحث داخلی شہادتوں کی روشنی میں کی ہے جن کا تعلق فن تعمیر، ادب، زبان، سیاسی و سماجی حالات و لسانی خصوصیات سے ہے لیکن اس کا جو ایک خاص پہلو ہے اسکی طرف انہوں نے اشارہ نہیں کیا۔ صرف فرہنگ میں معنی دے دئے گئے ہیں یا فٹ نوٹ میں کچھ صراحت کر دی ہے وہ ہے اس دور کا کلچر اور زیورات ایک مخصوص عنوان میں جبکہ اس کا ذکر علحدہ سے کیا گیا ہے۔

"در تعریف کہ برائے یزدانی جمع شدہ اند پائے کویاں ہریک وضع"

اس عنوان کے تحت آنے والے ذیلی عنوانات اور اس حصہ کے ہر شعر میں اس دور کے لباس اور زیورات کا ذکر اور تہذیبی خصوصیات کا مرقع موجود ہے یہ صرف اس دور کی تہذیب ہی نہیں بلکہ آج بھی جنوبی ہند کی تہذیب کے اہم عناصر میں ان کی تشریح فٹ نوٹ میں بھی نہیں کی گئی۔

۔ کوئی گوندچوٹی لگی پیٹھ آئے، کندن کھاپ ترخیا جیو درمیاں سہائے۔

اس شعر میں انہوں نے صرف ترخیا کے معنی ٹرختا، ترختا بتائے ہیں جبکہ اس سے ظاہر ہے کہ مانگ میں کندن کی لڑی یعنی ٹیکے کی لڑی رکھی ہے۔

کہ یا کھاپ سونے چڑھایا ناگ سیاہ اچھل جائے پکڑیا سو پھن سیس (۱۹)

کھاپ چوٹی کا ایک زیور ہے جس کا ذکر فرہنگ میں نہیں ہے ۔ یہ زیور دکن

کے بعض گھرانوں میں آج بھی موجود ہے۔ یہ سونے کا جڑاؤ ۔ یا کھیوے کے کپڑے کا بنا ہوا چوٹی کا غلاف ہوتا ہے۔ اب اس کی بجائے پھول سے چوٹی سجائی جاتی ہے۔ اس حصہ میں نہ صرف ایک زیور بلکہ مانگ کے زیور سے لیکر پیر کے زیور تک کا ذکر ہے۔

کوئی زیب موتی سو مکرا ملے سونے تھال درمیاں جیوں پارا ڈھلے
کہ یا نانک دیوا ہے مکھ جوت جان جھڑے پھول مکھڑا ہو دستا عیاں

ان اشعار میں تتھ ۔ ناک کی دال سونے کی ، جڑاؤ ناک کی بالی اور دلہن کا وہ تتھ شامل ہے جو دلہن کو سہاگ کی نشانی کے طور پر تتھ میں پھول پرا کر پہنایا جاتا ہے۔ پھول جب جھڑ جاتے ہیں تو تتھ عیاں ہوتی ہے۔ ایسے ہی کان کے زیور گلے کے مختلف زیورات ، ہاتھ کے زیورات ، سمرن ، کمر کے زیورات پیر کے مختلف زیورات کا ذکر اس دور کی تہذیب معاشرت رسم و رواج کو ظاہر کرتا ہے اور جو ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔

دکنی اردو کی لسانی خصوصیات میں شمالی ہند کی بولیوں کی آمیزش بھی ہے اور کچھ نواح دہلی کے بولیوں سے مربوط ہیں۔ دکن کی اردو میں مرہٹی جو ایک ہند آریائی زبان ہے اس کے اثرات زیادہ ہیں۔ دکنی اردو میں "چ" تاکیدی اور "نکو" کا استعمال خصوصیت کا حامل ہے۔ لیکن "ابراہیم نامہ" میں دکنی اردو کے بعض کلیدی حروف مثلاً "چ" تاکیدی اور "نکو"، آکو" اور "جاکو" جیسے الفاظ مفقود ہیں۔ بعض ایسے دکنی الفاظ ہیں جو آج بھی دکنی علاقے میں بولے جاتے ہیں اور دکنی الفاظ کہلاتے ہیں وہ اس میں شامل ہیں۔ شعر نمبر ۶۴۴ ناد جیسا ، شعر ۶۲۳ دستا۔ نظر آتا ، شعر نمبر ۶۵۶ کاڑ۔ نکالنا ، وغیرہ اس طرح ابراہیم نامہ کا ایک منفرد اسلوب ملتا ہے۔

ابراہیم نامہ کی تدوین کی فنی اہمیت کو اکثر محققین نے سراہا ہے۔

پروفیسر گیان چند جو خود بڑے اچھے محقق ہیں لکھتے ہیں:

"ابراہیم نامہ ہر اعتبار سے ایک مکمل تدوین ہے مدون کے

کسی تحقیقی بیان سے اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں ۔" (۲۰)

ترتیب متن کے ساتھ فٹ نوٹ میں مخارج بھی واضح کر دیا ہے جس کی وجہ سے قاری کو متن سمجھنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے فہرست الفاظ بھی حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے ۔ پروفیسر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

"مسعود حسین خاں نے تدوین متن کے ان تمام معرکوں کو بڑے صبر و تحمل اور ادبی ذکاوت و دیدوری کے ساتھ سر کیا ہے ۔....... مرتب کے لسانیات پر عبور نے متروک الفاظ کھولنے اور ان کے ماخذوں کا [illegible] نے اور مطالب کی صحیح تشریح کرنے میں بڑی مدد دی ہے ۔ (۲۱)

ابراہیم نامہ کی اولیت کے متعلق گیان چند جین رقمطراز ہیں:

"مثنوی کدم راؤ پدم راؤ بر صغیر کی سب سے بڑی اور دنیا کی تیسری بڑی زبان کی پہلی ادبی تصنیف ہے ۔" (۲۲)

لہذا وہ کہتے ہیں کہ ابراہیم نامہ کی اشاعت تک کدم راؤ پدم راؤ شایع ہو کر سامنے نہیں آئی تھی جس کی وجہ سے مسعود صاحب کو اس کی اولیت کا علم نہیں تھا لیکن مسعود صاحب اسکی اولیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ابراہیم نامہ اردو کی پہلی ادبی مثنوی ہے اس سے قبل کی مثنویات نظامی کی کدم راؤ پدم راؤ ، اشرف کی نوسرہار اور برہان الدین جانم کا ارشاد نامہ اخلاقی مذہبی اور صوفیانہ موضوعات پر مشتمل ہیں ۔ نہ تو ان کے موضوعات ادبی ہیں اور نہ اسالیب بیان ۔ (۲۳)

دبستان بیجاپور کے اس اولین ادبی نقش کے بارے میں سیدہ جعفر نے مثنوی یوسف زلیخا میں لکھا تھا کہ عبدل کا ابراہیم نامہ

۱۰۲۰ھ م ۱۶۱۱ء ۔ ۱۰۲۱ھ م ۱۶۱۲ء بھی بیجاپوری ادب کا پہلا کامیاب نقش سمجھا جاتا ہے لیکن یہ مثنوی یوسف زلیخا کے بہت بعد لکھی گئی ۔ (۲۴)

لیکن بعد میں نذر مسعود میں لکھتی ہیں کہ:

" ابراہیم نامہ کا مقدمہ مسعود حسین خاں کی اعلی تحقیقی صلاحیتوں کا ترجمان ہے انہوں نے عبدل کو سرخیل دبستان بیجاپور اور ابراہیم نامہ کو دبستان بیجاپور کا پہلا ادبی نقش بتایا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسعود خاں نے بیجاپور کے اس اولین شعری کارنامہ کو مرتب کر کے قدیم اردو ادب کے سرمائے میں گراں بہا اضافہ کیا ہے ۔" (۲۵)

==========

ابراہم نامہ

۱- احتشام حسین - اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ترقی اردو بیورو - ص ۳۲
۲- مسعود حسین خاں - مقدمہ ابراہیم نامہ - ص ۱
۳- گیان چند جین - ڈاکٹر مسعود حسین خاں - بہ حیثیت ادبی محققین - مشمولہ نذر مسعود - ص ۱۳۲
۴- مسعود حسین خاں - مقدمہ، ابراہیم نامہ - ص ۲
۵- مسعود حسین خاں - اردو ادب، علی گڑھ ۱۹۶۹ء - ص ۹
۶- مسعود حسین خاں - ابراہیم نامہ - ص ۶۰
۷- گیان چند جین - پرکھ اور پہچان - ص ۲۵۱
۸- مسعود حسین خاں - اردو ادب علی گڑھ ۱۹۶۷ء - ص ۸
۹- محمد عبدالحی، ڈاکٹر - دربار آصف - جلد دوم - ص ۱۱۰
۱۰- مسعود حسین خاں - مقدمہ ابراہیم نامہ - ص ۳۹
۱۱- جمیل جالبی، ڈاکٹر - تاریخ ادب اردو، حصہ اول - ص ۹۱
۱۲- نذیر احمد "نورس" علی گڑھ - ص ۴۰
۱۳- مسعود حسین خاں - اردو ادب، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۷ء - ص ۷
۱۴- مسعود حسین خاں - دکنی زبان کا آغاز اور ارتقاء - ص ۷
۱۵- جمیل جالبی، ڈاکٹر - تاریخ ادب اردو، حصہ اول - ص ۲۲۱
۱۶- گیان چند جین - فکر و نظر - نذر مسعود - ص ۱۳۱
۱۷- جمیل جالبی - تاریخ ادب اردو، حصہ اول - ص ۲۱۶
۱۸- سیدہ جعفر، پروفیسر - فکر و نظر، علی گڑھ - ص ۲۱۰
۱۹- مسعود حسین خاں - ابراہیم نامہ ۱۹۶۹ء علی گڑھ - ص ۱۰۱
۲۰- گیان چند جین - پرکھ اور پہچان - ص ۲۵۲
۲۱- سیدہ جعفر، پروفیسر - فکر و نظر، مشمولہ نذر مسعود - ص ۲۱۲
۲۲- گیان چند جین - ڈاکٹر مسعود حسین خاں بحیثیت ادبی محقق، مشمولہ - فکر و نظر - نذر مسعود - ص ۱۳۲
۲۳- مسعود حسین خاں - مقدمہ ابراہیم نامہ علی گڑھ - ص ۳۶
۲۴- سیدہ جعفر، پروفیسر "یوسف زلیخا" اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش ۱۹۸۳ء - ص
۲۵- سیدہ جعفر، پروفیسر - نذر مسعود، فکر و نظر علیگڑھ ۱۹۸۹ء - ص ۲۱۰

قصہ مہر افروز و دلبر

"قصہ مہر افروز و دلبر" ایک نثری داستان ہے - نثری داستانیں قصہ کا ایک اصنافی روپ ہوتی ہیں - اردو ادب میں داستانیں عموماً عشق کی مہمات پر مشتمل ہوتی ہیں - یہ داستانیں ایک طرف تہذیب و معاشرت کا مرقع پیش کرتی ہیں تو دوسری طرف ایک غیر متحرک معاشرے کی اکتاہٹ اور یکسانیت سے فرار حاصل کرنے کا وسیلہ ہوتی ہیں داستانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے آدمی ایک ایسی دنیا میں غرق ہوجاتا ہے جہاں ہر طرف عیش و عشرت اور مسرت و شادمانی کا ماحول ہوتا ہے - ان قصوں میں تفریح طبع کے ساتھ ساتھ تخیل کے سہارے انسانی خواہشات کی تکمیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے -

قصہ مہر افروز و دلبر ایک ایسا قصہ ہے جس کا تعلق داستان نویسی کے ابتدائی دور سے ہے - مسعود حسین خان نے اس داستان کو ۱۹۶۶ء میں مرتب کرکے شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی جانب سے شائع کیا - اس قصہ کا صرف ایک نسخہ ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر تھا جو انہیں آغا حیدر حسن نے عنایت کیا تھا - آغاز حیدر حسن کو قصہ مہ افروز کا مخطوطہ گوایار کے بزرگ حضرت جی کی درگاہ کے سجادہ نشین نے ۱۹۲۹ء میں پیش کیا تھا -

قصہ کی زبان ، اسلوب اور اسکی ادبی اہمیت کے بارے میں ۳۸ صفحات پر مشتمل ایک واضح مقدمہ لکھا ہے اس قصہ کی مقبولیت اس قدر ہوئی کہ ہندی رسم الخط میں بھی یہ قصہ ۱۹۶۶ء میں شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہوا اس کا مقدمہ ہندی میں ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے متن کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا گیا ہے -

پہلا ایڈیشن ٹائپ Type میں ہے جس میں قصہ کا متن ۳۱۶ صفحات پر

مشتمل ہے اس کے بعد مشکل الفاظ کی تشریح ضمیمہ کے طور پر دی گئی ہے آخر میں صحت نامہ بھی موجود ہے اس کا دوسرا ایڈیشن انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا گیا۔ اس کا مقدمہ ۳۲ صفحات کا ہے جس میں ابتدائی چار صفحات پر ترمیم شدہ مقدمہ ہے صفحہ ۳۹ سے اصل قصہ مہر افروز شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۲۰۵ پر ختم ہوتا ہے اس میں صحت نامہ۔ یا حل طلب الفاظ کی تشریح شامل نہیں ہے

پروفیسر نثار احمد فاروقی نے اس قصہ کی اشاعت اول کے بعد فکر و نظر ۱۹۷۱ء علی گڑھ میں مصنف کے وطن اور نام کے سلسلے میں ایک تحقیقی مضمون لکھا تھا جو بعد میں انکی تصنیف "دراسات" میں شامل کیا گیا۔ قصہ مہر افروز کی تدوین کے سلسلہ میں مسعود حسین خاں کی علمی خدمات کے بارے میں نثار احمد فاروقی یوں رقمطراز ہیں:

"ڈاکٹر مسعود حسین خاں اردو کے سچے عالم اور کھرے انسان ہیں۔ گوشہ عزلت میں بیٹھ کر علمی خدمت کرنا اور نشاط مطالعہ سے سرشار رہنا ان کا شعار ہے۔ مطربی و مسخرگی ان کا پیشہ نہیں اس لئے جو کچھ لکھتے ہیں ان کے علمی ذوق اور رسم عاشقی کا آئینہ دار ہوتا ہے...... ان کی تحریریں تامل اور تفکر سے لکھی جاتی ہیں۔" (۱)

قصہ مہر افروز و دلبر کو محمد شاہ کے دور کی تصنیف سمجھا جاتا ہے اس دور میں داستان کو تقویت ملی۔ ان داستانوں کا مقصد معاشرتی اور خیالی مہمات کے ذریعہ قاری کو آسودہ کرنا اور تہذیب کے سامان فراہم کرنا تھا۔ اس دور میں داستانوں کا مقصد "سونے کے عمل کو آسان بنانا تھا۔" (۲)

طبع اول کے مقدمہ میں مسعود حسین خاں نے فرحت اللہ بیگ کے حوالہ سے اس کا مصنف عیسوی خاں بتایا تھا جو قیاسی حیثیت سے حافظ عبدالرحمن خاں احسان کے چچا ہوتے تھے۔ احسان کے والد غلام رسول خاں تھے ان کا خطاب موسی

خاں تھا ان کے بھائی عیسی خاں تھے۔ یہ دونوں بھائی محمد شاہ کے عہد میں شہرادوں اور شہرادیوں کو قرآن مجید پڑھاتے تھے اس مخطوطہ کے پہلے صفحہ پر رومن رسم الخط میں اردو کے کچھ فقرے ہیں۔

Malaqe es Qetab Qa Nayab Sahab Zo Qoi Daya Qare So zzhtta Haae

مالک اس کتاب کا نائب صاحب جو کوئی دعوی کرے سو جھوٹا ہے۔

اسی صفحہ پر قصہ کا نام اور مصنف کا نام عیسوی خاں ہے مقدمہ کے بعد مخطوطہ کے سرورق کا عکس بھی شامل ہے قصہ کے مصنف کے بارے میں نثار احمد فاروقی نے اپنے متذکرہ بالا مضمون میں تحقیق کر کے نئی معلومات فراہم کی ہیں۔

نثار احمد فاروقی نے اس کے مصنف کو عیسی خاں بتایا ہے جس کا تعلق شاہ نظام الدین سے ہے۔ فاروقی صاحب نے "مجموعہ نغز" اور مجمع الانتخاب اور دیگر داخلی شہادتوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شہرت کے والد عیسی خاں شاہ نظام الدین کے صوبہ دار تھے جو حضرت جی کے جد تھے ان کا شجرہ پیش کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں عیسی خاں نے یہ داستان لکھی تھی اور یہ مخطوطہ نسلاً بعد نسلا خانقاہ حضرت جی ہی میں رہا۔ غمگین دہلوی کے سجادہ نشین غنی محمد حضرت جی نے ۷/ مئی ۱۹۲۹ء کو اسے آغا حیدر حسن دہلوی کو نذر کر دیا تھا۔ فاروقی صاحب کے اس تحقیقی مضمون کے بعد مسعود حسین خاں نے انہیں ایک خط لکھا تھا:

"میں نے آپ کا فاضلانہ مضمون بغور پڑھا واقعی عیسیٰ خاں کے سلسلے میں آپ نے ایک نیا نکتہ پیدا کیا ہے ـــــــ ایک کا نام یحیی خاں تھا اور وہ نائب کی حیثیت سے معروف تھے میں نے تو اپنے مقدمے میں ساری راہیں کھلی رکھی ہیں ـــــــ بہر حال مصنف

کے بارے میں آپ کی یہ سعی بہت مدلل ہے اور تاریخی واقعات سے
مربوط ہے۔" (۳)

قصہ مہرافروز ودلبر کے طبع اول کے بعد اس کے مصنف کے بارے میں سب سے اہم معلومات ڈاکٹر پرکاش مونس نے اپنے تحقیقی مقالے "اردو ادب پر ہندی کا اثر ۱۹۷۸ء (الہ آباد) میں فراہم کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اہل اردو کے لئے عیسوی خاں بھلے ہی چیستانی شخصیت ہے لیکن ہندی میں وہ ایک جانے مانے ادیب ہیں اس میں ذرا شک نہیں کہ ہندی کے ادیب نواب عیسوی خاں ہی قصہ مہرا فروز ودلبر کے مصنف ہیں۔" (۴)

پرکاش مونس نے عیسوی خاں کے بارے میں مزید تحقیق کرتے ہوئے اس قصہ کی نثر کا ہندی نثر سے تقابل کیا ہے۔ ہندی کی نثری کتاب "رس چندریکا" سے تقابل کرتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ وہی عیسوی خاں ہے جو گوالیار کے قریب نرور کے راجا چھتر سنگھ کے دربار میں امیر تھے۔ اس کی مزید تصدیق ان ہی کی ایک اور ادبی کاوش "ست سئ" سے ملتی ہے جو ایک شرح ہے اس کتاب میں جس کا ایک صفحہ اردو میں اور ایک ہندی رسم الخط میں ہے۔

مسعود صاحب کو پرکاش مونس کی اس تحقیق سے اختلاف ہے۔

"عیسوی خاں کی ٹیکم گڑھ والی رس چندریکا، کی اردو شرح کو اب تک نہ ڈاکٹر پرکاش مونس نے دیکھا ہے اور نہ ان کے چھوٹے بھائی گیان چند جین نے۔" (۵)

لیکن گیان چند جین لکھتے ہیں:

"میرے بھائی ہندی کی "رس چندریکا" کو دیکھے بغیر کوئی فیصلہ کرنے کو تیار نہ تھے میں اس زمانے میں الہ آباد میں تھا انہوں نے مجھے لکھا

کہ ہندی ساہتیہ سمیلن الہ آباد میں رس چندریکا" کو دیکھ کر اس کا
اقتباس بھیج دوں میں نے مخطوطہ دیکھ کر اس کا اقتباس نیز آخر کی نظم کا
نمونہ لکھ بھیجا۔" (۶)

قصہ مہر افروز و دلبر کے بارے میں نثار احمد فاروقی اور پرکاش مونس نے کئی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ جمیل جالبی نے مصنف کے نام کے ساتھ خطابات یعنی بہادر اور نواب کا بھی اضافہ کیا ہے۔ جو ہندی مخطوطات کے تحقیقات کی روشنی میں ہے۔ اور وہ لکھتے ہیں:

"نام کے ساتھ بہادر کا لفظ کسی عام آدمی کیلئے استعمال نہیں ہوتا پھر
عیسوی خاں خود کوئی عام نہیں اس انوکھے نام کا اور شخص بھی ہو
نواب بہادر بھی اور ساتھ ساتھ مصنف بھی۔" (۷)

ان تحقیقات کی روشنی میں مصنف کا نام عیسوی خاں بتایا ہے اور یہی عیسوی خاں کو قصہ مہر افروز و دلبر کا مصنف مانا جاتا ہے جو ہندی کا بھی مصنف تھا۔

پرکاش مونس اور گیان چند جین نے ہندی رسم الخط میں عیسوی خاں کو ایسپ کھاں پڑھا ہے مسعود صاحب کہتے ہیں کہ "ایسپ" "یوسف" کی تحریف ہے نہ کہ عیسوی خاں کی جو عیسیٰ سے نسبت ظاہر کرتا ہے۔ جو کہ گیان چند جین لکھتے ہیں:

"دیوناگری خط میں عیسوی کے آخری حروف [illegible] اگر شکستہ لکھے ہوں
تو ان کی قرآت [illegible] ممکن ہے۔" (۸)

اگر یہ ایسپ کھاں، ایسپ خلں، عیسوی خاں کی بگڑی ہوئی شکل ہے یا یوسف کی تحریف عیسوی خاں ہے تو مسعود صاحب کی تحقیق ہی مستند ٹھہرتی ہے۔

مصنف کے نام کے بارے میں جس طرح اختلاف رائے ہے اس کے وطن اور زبان کے بارے میں بھی مختلف اور متفرق آراء ملتی ہیں۔ پرکاش مونس کے حوالے سے مصنف کو گوالیار کے راجہ کا متوسل بتایا گیا ہے اور ان کی ہندی

تصانیف کا بھی ذکر کیا گیا ہے ہو سکتا ہے کہ مصنف کا ہندی زبان پر عبور ہو اور وہ دربار سے متوسل رہا ہو جس سے اس کی زبان پر اور ماحول پر دیومالا کا اثر چھایا ہوا ملتا ہے لیکن پرکاش مونس نے شاہ نظام الدین حضرت جی کا جو حوالہ دیا ہے اس کو نظر انداز کر دیا ہے ۔ انہوں نے عیسوی خاں کی تحقیق پر کئی صفحات صرف کئے ہیں لیکن مصنف کے وطن اور مخطوطہ کے بارے میں معلومات نہیں پیش کیں ۔ آغا حیدر حسن کو یہ مخطوطہ کیونکر حاصل ہوا اس کے بارے میں کچھ ذکر نہیں ہے ۔ مصنف کے وطن کے بارے میں گیان چند جین لکھتے ہیں:

"مصنف دلی یا نواح کا رہنے والا تھا اور بعد میں نرور کے دربار میں چلا گیا ۔" (۹)

نثار احمد فاروقی ، مصنف قصہ مہر افروز و دلبر کے وطن کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ بیرونی تھا اور شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ:

" میرا گمان ہے کہ عیسوی خاں (یعنی عیسیٰ خاں) نے ہی داستان لکھوائی ہے ...... کتاب کی زبان تائید کر رہی ہے کہ مصنف مظفر نگر اور سہارنپور کی بولی سے خاصہ متاثر ہے کتاب پر نائب کا حوالہ ہے مخطوطہ بھی شاہ نظام الدین کے خاندان سے ملا ہے ۔ ان سب قرائن کے ہوتے ہوئے یہی سمجھنا چاہیئے کہ عیسیٰ خان نے یہ داستان قلم بند کروائی ہے ۔" (۱۰)

لیکن جمیل جالبی نے حقائق اور تاریخی شہادتوں کی روشنی میں مسعود صاحب کی تحقیق سے اتفاق کیا ہے اور عیسوی خاں کی دریافت کو پرکاش مونس کا کارنامہ قرار دیا ہے ۔

"قصہ مہر افروز و دلبر کے مصنف نواب عیسوی خاں بہادر ہیں اور یہ قصہ محمد شاہ کے دربار میں لکھا گیا ہے ۔ جیسے قصہ مہر افروز و دلبر کو دریافت کرنے کا سہرا ڈاکٹر پرکاش مونس کے سر ہے " (۱۱)

اگر پرکاش مونس کی تحقیق کو تسلیم کر لیا جاتا ہے تو یہاں اس بات کو بھی سمجھنے کا جواز پیدا ہوتا ہے کہ مصنف گوالیار کے راجہ کا متوسل تھا اس قصہ کی زبان پر کھڑی بولی اور برج بھاشا کا اثر ہے جبکہ نثار احمد فاروقی کی تحقیق کے مطابق یہ خاندان بخارا سے آکر کشمیر میں آباد ہو گیا تھا اگر اس خاندان کا تعلق بخارا ہرات سے ہے اور کشمیر میں آکر آباد ہوا ہو تو یہ بحث ہلکی پڑ جاتی ہے۔ کیونکہ یہاں کی زبان کھڑی بولی اور برج بھاشا سے مختلف ہے۔

قصہ کی داخلی شہادت اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ مصنف کی زبان پر کھڑی بولی کا اثر ہے اور وہ لال قلعہ کی بہار اور دہلی سے اچھی طرح واقف ہے۔

"عیسوی خاں کی ادبیت کے تمام تر ماخذ یا تو اس کا ذاتی مشاہدہ ہے جسے وہ دہلی کے روزمرہ میں بیان کرتا جاتا ہے۔ یا ہندی شاعری کی وہ تشبیہات تمثیلات اور تلامذے ہیں جن کے سہارے وہ فن مصوری اور عشق بازی کے مزے بیان کرتا ہے" (۱۲)

قصہ کے مصنف کی دریافت کے بعد جو مسئلہ مرتب کے سامنے آتا ہے وہ قصہ کی تاریخ تصنیف کے سلسلہ میں ہے۔ داخلی شہادتوں کی بنا پر مسعود صاحب کہتے ہیں کہ یہ قصہ ۱۷۳۱ء تا ۱۷۵۹ء کے بیچ لکھا گیا ہو گا اس کو دوسرے محقق بھی تسلیم کرتے ہیں

گیان چند جین لکھتے ہیں:

"ان کی اصابت نظر کا کمال ہے کہ انہوں نے مختلف قرائن کی بنا پر داستان کا زمانہ ۱۷۳۲ اور ۱۷۵۹ کے بیچ طے کیا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے ظاہر ہے یہ داستان ۱۷۵۰ کے لگ بھگ لکھی گئی۔" (۱۳)

پرکاش مونس لکھتے ہیں:

"زمانے کے تعین کے لئے انہوں نے داخلی شہادتوں کی بنا پر طے کیا

کہ یہ قصہ ۱۷۳۱ء تا ۱۷۵۹ء کے بیچ لکھا گیا ہو گا ڈاکٹر گیان چند جین نے بھی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے مانا ہے کہ یہ داستان اٹھارویں صدی کے وسط کی ہونی چاہیئے۔" (۱۴)

ان شہادتوں کی روشنی میں مصنف کا مسکن اور داستان کے دور کا تعین کیا گیا ہے پرکاش مونس نے بھی " رس چندریکا " کے آخر میں جو تاریخ دی ہے اس کے حوالے میں زمانہ کو تسلیم کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

" قصہ مہر افروز و دلبر کا زمانہ تصنیف بھی رس چندریکا (۱۷۵۲ء) کے قریب ہونا چاہیئے۔" (۱۵)

قصہ کی زبان کے تعلق سے مسعود صاحب لکھتے ہیں کہ اس کی عبارت کا نکھ سکھ درست نہیں کیونکہ یہ قصہ اس دور کی تصنیف ہے جب کہ اس عہد میں نہ کوئی نثر کا نمونہ موجود تھا۔ اور نہ اردو شاعری کا کوئی رچا ہوا اسلوب بن چکا تھا۔ وہ لکھتے ہیں

:

" قصہ کی زبان اکھڑی اکھڑی ہونے کے باوجود تخیل کی بے پناہ قوت رکھتی ہے جو زبان کو اسلوب کے لئے سانچوں میں ڈھلنے میں مصروف کار ہے اس میں ندرت ہے گہرائی ہے سادگی اور توانائی ہے .... عیسوی خاں کی حیثیت ایک بانی اسلوب کی ہے " (۱۶)

قصہ کی تاریخ کی دریافت ایک مشکل کام تھا اس میں فارسی اردو ہندی کا ایک بھی شعر یا دوہا درج نہیں۔ جس سے قصہ کی قدامت کا اندازہ ہو سکتا تھا لیکن مصنف نے بے شمار ہندی تشبیہات، استعارے، مترادفات وغیرہ کا استعمال کیا ہے داستان میں لال قلعے کی فضا کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اور ہندو دیومالا۔ دیو، دیویاں، مردہ جسم میں روح کو دوبارہ واپس کرنے کا خیال، شہرادے کی شادی، دیوتاؤں کا ذکر ہے تلمیحات مناظر کشی میں اور سراپا کے بیان میں بھی ہندی الفاظ کی چھاپ جگہ جگہ ملتی

ہے جس سے یہ بات مسلم ہو جاتی ہے کہ عیسوی خاں ہندی کے ادیب تھے۔

"قصہ مہر افروز و دلبر اپنے عہد کے شمالی ہند کے نثری ادب کا واحد نمونہ ہے اس میں فارسی اور ہندی دونوں کے اثرات کا امتزاج ملتا ہے اسلوب بیان میں عام ہندی کے الفاظ دل کھول کر بیان کئے گئے ہیں۔ اکثر ہندی الفاظ کو دیسی سانچے میں ڈھالنے کا رجحان ملتا ہے۔ سامیائی، سیلینائی، کوملتائی اس کی مثالیں ہیں۔ برج بھاشا کا بھی کافی اثر ہے۔" (۱۷)

دوسرے قصوں کی طرح اس میں مصنف اخلاقی درس نہیں دیتا اور نہ قصہ میں عریانیت ہے۔ یہ محمد شاہ کے دور کی تصنیف ہے۔ اس دور کی داستانوں اور خاص کر بوستان خیال میں عریانیت کا رنگ بہت گہرا ملتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس میں تبلیغ اسلام کا بھی درس نہیں یہ قصہ مغلیہ دور کی زوال آمدہ تہذیب کا مرقع ہے۔

قصہ پلاٹ اور کردار کے تال میل سے ارتقائی منازل طے کرتا جاتا ہے لیکن مصنف نے کردار کی بجائے سراپا نگاری پر زور دیا ہے جذبات نگاری پر بھی خاص توجہ کی ہے۔

"مکھ جو اس کا مانند چاند ہے سو یہ گھٹا ہے کہ اس کے آس پاس آتی ہے اور یہ ناگنی ہے کہ چاند کے امرت پیونے کو آتی ہے اور چوٹی کے گہنے جو بیچ ہیں سو بیچ نہیں ہیں بلکہ یہ ناگن ہے کہ ایڑی جو اس کی لو سے سروپ ہے نس کو دیکھ کر ادھتی ہے......... مانگ جو اس کی ہے بس مروارید لگے ہیں۔" (۱۸)

تحقیق کے علاوہ مسعود صاحب کو اردو کلاسیکی سرمائے سے گہری دلچسپی ہے لسانیات میں ان کا مطالعہ عمیق ہے ان کی تحریریں تامل اور تفکر سے لکھی جاتی ہیں۔(۱۹)

مقدمہ میں انہوں نے قصہ کی زبان کا صوتیاتی، صرفی، نحوی جائزہ لیا ہے۔ اور

اس زبان کو جدید اردو نثر کا نقطہ آغاز کہا ہے۔ لکھتے ہیں:

"مصنف اردو نثر کے بنیادی اسلوب کی داغ بیل ڈال رہا ہے جس پر بعد کو میر امن اور ان کے رفقاء نے جدید اردو نثر کی عمارت کھڑی کی ہے۔" (۲۰)

قصہ مہر افروز و دلبر عام داستانوں اور خاص کر مثنوی سحر البیان کی داستان سے بہت قریب معلوم ہوتا ہے اس کا آغاز بھی عشق آباد کے بادشاہ کے ذکر سے ہوتا ہے جو اپنی لاولدی کے سبب مایوسی کا شکار ہے بادشاہ اس افسوس میں تخت و تاج چھوڑ کر جنگل کی راہ لیتا ہے۔

رس چندریکا کا راجہ شہر عشق آباد کا لاولد حکمراں مایوسی کے عالم میں بیس ہزار رعایا کے ساتھ فقیری اختیار کر لیتا ہے۔

قصہ مہر افروز و دلبر کے بادشاہ کو بھی عام داستانوں کے قصہ کی طرح ایک فقیر کی دعا سے لڑکا پیدا ہوتا ہے جو بہت ہی خوبصورت ہے اس کا نام مہر افروز رکھا جاتا ہے وزیر کے بیٹے اندیش کے ساتھ اسکی تعلیم و تربیت ہوتی ہے ایک دن شہزادہ افروز اور اندیش پریوں کے دیس میں جاتے ہیں اور وہاں پریوں کی شہزادی پر شہزادہ فریفتہ ہوجاتا ہے اور مہم کا آغاز ہوجاتا ہے

اس دور کی عام داستانوں کی طرح اس میں بھی اور قصے نکلتے ہیں اور بے شمار مہمات طئے کرنے کے بعد شہزادہ "مہر افروز" شہزادی " دلبر" کو پالیتا ہے اس قصہ میں پرانے داستانی عناصر زیادہ ہیں۔ جن میں اکثر سنسکرت اور ہندی سے ماخوذ ہیں۔ ہندی افسانوی ادب کے ایسے مسلمہ معتقدات بھی ہیں۔ جو عربی و فارسی ادب میں نایاب ہیں۔ اس قصہ کے تانے بانے نپے ہوئے نظر آتے ہیں۔ (۲۱)

آخری مہماتی کیفیت میں پوری داستان پر دیو مالا کا اثر غالب ہوجاتا ہے فارسی داستانوں کے عناصر بھی گو اس قصہ میں ملتے ہیں لیکن شہزادہ مہر افروز اور شہزادی دلبر،

دور اندیش وزیر زادہ اور گل رخ کی واپسی پر جو فضا پائی جاتی ہے وہ ہندوستانی عقائد اور معاشرت کی ترجمان ہے ہندوستان کی اس تہذیب کی عکاسی کرتی ہے جو اس دور میں مصنف کے اطراف تھیں۔

قصہ مہرافروز و دلبر میں کھڑی بولی اور برج بھاشا کے امتزاج اور عام گفتگو کا اندازہ ملتا ہے منظر نگاری۔ جذبات نگاری، رزم و بزم کی تصویر کشی بہتر انداز میں کی گئی ہے۔

"عیسوی خاں نے اس داستاں میں اس دور کے تمام مقبول اور پسندیدہ ذہنی رویوں کو سمیٹ کر سننے والے کے لئے رنگارنگ دلچسپیوں کا سامان فراہم کیا ہے۔" (۲۲)

مجموعی طور پر قصہ مہرافروز و دلبر اردو ہندی نثر کے خوش گوار امتزاج کا اولین نمونہ تصور کیا جاتا ہے اس قصہ کے ذریعہ شمالی ہند میں اردو نثر کے نمونے، دلی کے اطراف کی بولی اور اسکی طرز معاشرت آداب گفتگو اور ماحول کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مسعود حسین خاں نے اس کو مرتب کر کے اردو کے ارتقائی منازل کو واضح کرتے ہوئے ادبی لسانی اور تاریخی واقعات کو منظر عام پر لایا ہے اس کے اعتراف میں نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر مسعود حسین خاں اس کے لئے موزوں ترین شخصیت ہیں انہوں نے متن کو بہتر انداز میں پیش کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا ہے۔" (۲۳)

قصہ مہرافروز و دلبر اپنے منفرد اسلوب اور ادبی حسن کے لحاظ سے اہم نثری تصنیف سمجھی جاتی ہے کیوں کہ یہ اس وقت کی تصنیف ہے جبکہ اردو ارتقاء کے ابتدائی منازل طے کر رہی تھی۔

گیان چند جین لکھتے ہیں:

" قدامت اور ادبی خوبیوں کے لحاظ سے عیسوی خاں کا قصہ مہرافروز و دلبر بھی ایک تاریخ ساز دریافت ہے...... اسے منظر عام پر لانے کا سہرا ڈاکٹر مسعود حسین کے سر ہے جنہوں نے اسکو بدرجہ احسن ترتیب دیا ہے۔(۲۴)

اس قصہ کی ترتیب و اشاعت سے مسعود حسین خاں نے اردو ہندی کی ادبی دنیا میں ایک گرانقدر ادبی کارنامہ کا اضافہ کیا ہے اور عیسوی خاں کی شخصیت کو پہلی دفعہ روشناس کروایا ہے:

" مسعود صاحب نے داستان کے بعض بیانات کو دیکھ کر بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مصنف دلی کے لال قلعہ کے مناظر بیان کر رہا ہے مجھے اس سے انکار نہیں ہوسکتا ہے کہ مصنف دلی یا اس کے نواح کا رہنے والا ہو اور بعد میں نرور کے دربار میں چلا گیا ہو۔ دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا وطن نرور کا علاقہ ہو اس نے دلی جاکر لال قلعہ کی بہار دیکھی ہے..... مسعود صاحب نے قصہ کے دوسرے جزو نصیحت نامے کے جو فارسی ماخذ دریافت کئے ہیں انکی جتنی داد دی جائے کم ہے۔" (۲۵)

==========

قصہ مہر افروز دلبر

۱۔ نثار احمد فاروقی۔ دراسات، ۱۹۷۱ء۔ ص ۹
۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر۔ تاریخ ادب اردو، جلد دوم، حصہ دوم۔ ص ۱۰۸۲
۳۔ نثار احمد فاروقی۔ دراسات، ۱۹۷۱ء۔ ص ۲، ۳
۴۔ پرکاش مونس۔ اردو ادب پر ہندی کا اثر، الہ آباد۔ ص ۳۳۰
۵۔ پروفیسر مسعود حسین خاں۔ قصہ مہر افروز دلبر۔ جدید ایڈیشن۔ ص ۹
۶۔ گیان چند جین۔ پرکھ اور پہچان، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس۔ ص ۲۴۸
۷۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو، جلد دوم، حصہ دوم۔ ص ۱۰۸۹
۸۔ گیان چند جین۔ پرکھ اور پہچان۔ ص ۲۴۸
۹۔ گیان چند جین۔ پرکھ اور پہچان۔ ص ۲۴۹
۱۰۔ نثار احمد فاروقی۔ دراسات، فکر و نظر علی گڑھ ۱۹۷۱ء۔ ص ۴۲
۱۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو، جلد دوم، حصہ دوم۔ ص ۱۰۰۸
۱۲۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ اسالیب نثر پر ایک نظر، ڈاکٹر ضیاء الدین۔ ص ۱۲۹
۱۳۔ گیان چند جین۔ فکر و نظر۔ علی گڑھ۔ ص ۱۲۷
۱۴۔ پرکاش مونس۔ اردو ادب پر ہندی کا اثر، الہ آباد۔ ص ۳۳۲
۱۵۔ پرکاش مونس۔ اردو ادب پر ہندی کا اثر، الہ آباد۔ ص ۳۳۳
۱۶۔ مسعود حسین خاں۔ اسالیب نثر پر ایک نظر، ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی۔ ص ۱۳۰
۱۷۔ پرکاش مونس۔ اردو ادب پر ہندی کا اثر۔ ص ۳۴۴
۱۸۔ مسعود حسین خاں۔ قصہ مہر افروز دلبر۔ ص ۳۲
۱۹۔ نثار احمد فاروقی۔ دراسات۔ ص ۹
۲۰۔ مسعود حسین خاں، ڈاکٹر۔ "قصہ مہر افرو دلبر" مشمولہ اسالیب نثر پر ایک نظر۔ ص ۱۳۱
۲۱۔ پرکاش مونس۔ اردو ادب پر ہندی کا اثر۔ ص ۳۳۵
۲۲۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو، جلد دوم۔ ص ۱۰۹۱
۲۳۔ نثار احمد فاروقی۔ دراسات۔ ص ۱۱
۲۴۔ گیان چند جین۔ ادبی اور لسانی تحقیق، عبدالستار دلوی۔ ص ۲۳۳
۲۵۔ گیان چند جین۔ پرکھ اور پہچان۔ ص ۲۴۹

عاشور نامہ

دنیائے اردو نے مسعود حسین خاں کے ادبی اور تحقیقی کارناموں کا لوہا مانا ہے انہوں نے جو تحقیق اور تدوین کے کارنامے انجام دیئے ہیں ان میں اکثر کا تعلق ایسے ادب پاروں سے ہے جن کے نسخے زیادہ نہیں ملتے بلکہ ایک یا دو ہی نسخے اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان میں سے تقریباً سبھی ایسے ہیں جن کے مصنف کے بارے میں معلومات نہیں ملتی اور نہ ہی تذکروں میں مصنف کے بارے میں ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک "عاشور نامہ" بھی ہے عاشور نامہ ۱۱۰۰ھ ۸۹-۱۶۸۸ء روشن علی کی مثنوی ہے یہ مثنوی شمالی ہند کے قدیم ترین ذخیرہ ادب میں سے ایک ہے۔ لیکن اس سے قبل ۱۰۹۹ھ کا قصہ جم جاہ ملتا ہے جس کو تفصیل کے ساتھ گیان چند جین نے ہماری زبان انجمن ترقی اردو ۱۹۸۱ء میں متعارف کروایا تھا۔(۱) اس بارے میں مسعود حسین خاں نے ابھی کوئی اظہار خیال نہیں کیا ہے۔

تحقیق مسعود صاحب کی ادبی شخصیت کا نمایاں پہلو ہے ان کے تدوین متن کے کارنامے تحقیق و تنقید کا مرقع ہوتے ہیں۔

> "گذشتہ چار دہوں میں مسعود صاحب نے جو تحقیقی و تنقیدی کام کیا ہے اس سے نہ صرف ہمارے ادب کا افق وسیع ہوا ہے بلکہ انہوں نے تدوین و تنقید کا جو بلند معیار قائم کیا ہے وہ کسی زبان کیلئے بھی سرمایہ افتخار ہو سکتا ہے۔" (۲)

عاشور نامہ کے بارے میں سب سے پہلے سید سفارش حسین نے "اردو مرثیہ ۱۹۶۵ء میں ذکر کیا تھا اور ۱۹۷۱ء میں رسالہ اردو ادب انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں ایک مختصر مضمون روشن علی کے عاشور نامہ پر پیش کیا گیا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں مسعود

صاحب نے اس کو مرتب کر کے قدیم اردو کے سلسلہ نمبر ۴ میں علی گڑھ سے شائع کروایا۔ جس کے نسخے اب کمیاب ہیں یہ مثنوی (۳۵۴۴) اشعار پر مشتمل ہے اس کے اختتام پر مصنف کی عبارت اور کاتب کا لکھا ہوا ترقیمہ ہے اسے ۱۷۳۸ سے قبل کی تصنیف مانا گیا ہے ۱۳۱ صفحات پر مشتمل مقدمے میں، مصنف، تصنیف کی شان نزول، سن تصنیف، نسخہ خطی، کا جائزہ لیتے ہوئے لسانی خصوصیات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ لسانی جائزہ کے بعد ادبی خصوصیات کے عنوان سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اردو ادب میں مثنوی کی اہمیت کا تعین مصنف کے وطن اور اس کی زبان کا محاکمہ کیا گیا ہے

عاشور نامہ کے مصنف کے بارے میں تقریباً تمام تذکرے خاموش ہیں۔ ابھی تک دستیاب شدہ کسی بھی تذکرے میں عاشور نامے کے مصنف کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملتیں۔ مسعود صاحب نے داخلی شہادتوں کی روشنی میں مصنف کے بارے میں معلومات کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کے وطن کے بارے میں مختلف نظریے ملتے ہیں۔

مسعود صاحب عاشور نامہ کے اس شعر کی روشنی میں مصنف کو سہارنپور کا باشندہ بتاتے ہیں۔

یہ کہ سیر دنیا موافق قدر سکونت کیا تھا سہار رنگ پور شہر

وہ لکھتے ہیں کہ مصنف دنیا کی سیر کے بعد سہارنپور میں مقیم ہو گیا تھا۔ مثنوی میں مصنف کے وطن کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو میں سہارنپور کو یوپی کا قصبہ نہیں بلکہ مالوے کا قصبہ سہار نگ پور بتاتے ہیں۔

" عاشور نامہ کے مرتب و مقدمہ نگار مسعود حسین خاں نے سہار نگ پور کو سہارنپور سمجھ کر یہ سوال اٹھایا کہ سہارنپور کو روشن علی سہار نگ پور کیوں لکھتا ہے اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی

حالانکہ سہارنگپور ایک اُلگ شہر کا نام ہے جس کا ذکر تاریخوں میں آتا ہے" (۳)

یہ وہ مقام ہے جہاں بابر نے پانی پت کی پہلی لڑائی (۱۵۲۶ء) کے بعد ۱۵۲۷ء میں کنواہا کے مقام پر رانا سنگرام سنگھ عرف رانا سانگا کو شکست دے کر مغلیہ سلطنت کی جڑیں مضبوط کی تھیں۔

سید قدرت نقوی نے فکر و نظر کے شمارے نذر مسعود میں عاشور نامے کے مصنف اور مقام کے بارے میں طویل بحث کی ہے۔ سارنگ پور سہارنپور سے ہٹ کر دوسرا شہر ہے جس کا تعلق کو موجودہ مدھیہ پردیش سے بتایا ہے۔

گیان چند جین نے سلیم حامد رضوی کے مقالہ اردو "ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"اب جو مطبوعہ مقالہ (بھوپال ۶۵-۱۹۶۴) نکال کر دیکھتا ہوں تو مولوی سید نور الحسن سارنگ پوری کے کتب خانے کا ذکر ہے۔ (ص ۷۸) ڈاک خانے کی پن کوڈ کی ڈائرکٹری میں اس قصبہ کا پن کوڈ نمبر ۴۶۵۶۹۷ ہے۔"

سارنگ پور یا سہانپور کی بحث کا تصفیہ کرنے کے لئے شعر کے سانچے میں دیکھنا یہ ہے کہ شعر کے وزن کے اعتبار سے درست کیا ہے۔ نیز تصنیف پر کس علاقہ کی بولی کا اور عقائد کا اثر کتنا ہے سید قدرت نقوی مثنوی کی بحر سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"اس شعر کی تقطیع کریں تو مصرع ثانی اس میں بصورت موجودہ نہیں سماتا بلکہ خارج الوزن ہو جاتا ہے مصرع ثانی میں ایک فعل زائد ہے۔" (۴)

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"جس جگہ کو جمیل جالبی سہارنگ پور بتاتے ہیں وہ دراصل سہارنگ پور ہے جو ریاست مالوہ کا ایک قدیم تاریخی شہر ہے یہ مقام اب مدھیہ پردیش میں واقع ہے اور آج بھی اپنے اس پرانے نام سارنگ پور سے معروف ہے۔" (۵)

اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ عاشور نامہ کا مصنف روشن علی جس "سہارنگ پور کا ذکر اپنی تصنیف میں کرتا ہے اور جہاں سیر دنیا کرنے کے بعد وہ سکونت پذیر ہوتا ہے وہ سارنگ پور نہیں اور مقام ہو سکتا ہے جس کی تحقیق ضروری ہے مالوے کے قریب کے سارنگ پور کو سہارنگ پور سمجھ لینا اور اسے روشن علی کی جائے قیام قرار دینا سخت غلطی ہے یہ عین ممکن ہے کہ سہارنگ پور، سہارنپور ہی ہو اور جیسا کہ پروفیسر مسعود حسین خاں نے تحریر فرمایا ہے رن، رنگ میں صوتیاتی مشابہت کی وجہ سے عوامی زبان میں سہارنپور سہارنگ پور بن گیا ہو (۶)

رن، رنگ کے صوتی مشابہت کو نذیر احمد ملک بھی اقلی جوڑ کی مثال میں پیش کرتے ہیں۔ رنک۔ رنگ، رن۔ رنگ، جگ۔ جنگ۔

عاشور نامہ کی زبان کا حوالہ دیتے ہوئے مسعود صاحب لکھتے ہیں۔

"انہوں نے سارنگ پور کی بحث کو اٹھایا ہے جس کے بارے میں کئی سال قبل جمیل جالبی صاحب اپنی تاریخ ادب اردو میں لکھ چکے ہیں دونوں اس بات کے لئے مصر ہیں کہ عاشور نامہ کی زبان بہر حال کھڑی بولی ہے اور سارنگ پور وسط ہند کا ایک قصبہ ہے۔" (۷)

پاکستان کے مشہور محقق سید قدرت نقوی نے عاشور نامہ پر ایک تنقیدی مضمون سپرد قلم کیا ہے جو نذر مختار نئی دہلی ۱۹۸۸ء اور نذر مسعود علی گڑھ میں شامل ہے۔

مصنف کے سہارنگ پور کی تفصیل کے بعد اس کے عقیدہ کے بارے میں

مصنف کے سہارنگ پور کی تفصیل کے بعد اس کے عقیدہ کے بارے میں مسعود صاحب نے اندرونی شہادتوں کا حوالہ دیا ہے۔

اس مثنوی کا آغاز حمد و نعت کے بعد خلفائے راشدین کی مدح اور اشعار میں چار خلفاء کا ذکر مصنف کے اہل سنت عقیدہ کی نشاندہی کرتا ہے۔

شعر نمبر ۴۶۔ ابابکر صدیق ہیں یار غار تصدق و وفادار دار المدار

شعر نمبر ۴۸۔ نبی کے سوم یار عثماں عیاں کیا ہے اونہو جا جمع یہ قرآں

شعر نمبر ۴۹۔ علی ؤلی شاہ دلدل سوار، کیا تھا خدایا عطا ذو الفقار

یہ وہ اشعار ہیں جو مصنف روشن علی کے سنی العقیدہ ہونے کی دلیل ہیں۔ اس کے بعد مزید ان اشعار سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ ہے شاہ دنیا و دیں کا حسین جگر مصطفی کا علی کا ہے چین
کہ خاتون جنت کا پیارا پسر سنی مسلمانوں کا ہے راہبر

مسعود حسین خاں نے ان اشعار کی روشنی میں روشن علی کے مذہبی عقیدے کے بارے میں اس حقیقت کا بھی اظہار کیا ہے کہ شہادت ناموں کے ابتدائی لکھنے والے خواہ وہ شمال کے ہوں یا جنوب کے سبھی سنی العقیدہ تھے۔

سید قدرت نقوی کو روشن علی کے سنی العقیدہ ہونے پر یقین نہیں آتا۔ اس عقیدے کی بحث میں پھر سارنگ اور سہارنگ پور کا ذکر ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سارنگ پور" وسط ہند میں واقع ہے اسی سارنگ پور میں عہد مغلیہ میں سادات بارہہ کے ایک فوجی عہدیدار بزرگ نے دکن سے لوٹتے ہوئے پڑاؤ کیا اور یہیں سکونت اختیار کر لی بعد میں بدایون کے ایک نقوی سید بزرگ یہاں آکر آباد ہو گئے ان کی بستی محلہ سید واڑہ کہلاتی ہے ان دونوں خاندانوں کے افراد اب بھی وہاں موجود ہیں اور ان کے نام جاگیریں بھی ابھی تک جاری ہیں۔ سادات شیعہ

ہیں اور عملہ فعلہ سنت والجماعت۔ عین ممکن ہے کہ روشن علی شمالی
ہند سے دکن گجرات وغیرہ ہوتا ہوا سارنگ پور آگیا اور وہاں کے سنی
حضرات نے اس سے فرمائش کی ہو۔" (۸)

فاضل مضمون نگار ایک طرف تو اعتراف کر رہے ہیں کہ عاشور نامہ کا مصنف سادات شیعہ خاندان سے ہے اور جو سادات بارہہ سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے سنی حضرات کی فرمائش پر یہ شہادت نامہ لکھا ہے۔ پھر دوسری طرف اسی مضمون میں وہ لکھتے ہیں۔

"مقدمہ میں بجا طور پر مصنف کو سنی العقیدہ اور عاشور نامہ کے مخاطبین کو اہل سنت والجماعت بتایا ہے۔ شیعوں سے اس عاشور نامہ کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ جو روایات اس میں بیان ہوئی ہیں ان میں سے چند مشترکہ روایات کو چھوڑ کر باقی سے شیعہ لاتعلق ہیں۔ انداز میں رثائیت جا کا اندازہ ہونا بھی مخاطبین کے اہل سنت والجماعت ہونے کی دلیل ہے۔" (۹)

مصنف روشن علی کے عقیدے کے بارے میں مسعود حسین خاں نے اپنے مقدمہ میں وضاحت کر دی ہے کہ روشن علی سنی العقیدہ تھا اور اس کے اطراف کا حلقہ بھی اہل سنت تھا۔

"روشن علی کے مخاطب سہارنپور کے سنی العقیدہ لوگوں کا ہجوم ہے ورنہ وہ امام حسینؓ کے بارے میں اس قسم کا دعویٰ ہرگز نہ کرتا۔" (۱۰)

اور یہ تصنیف اطرف کے لوگوں کے اصرار پر لکھی گئی جس کا داخلی شہادت میں بھی ذکر مل جاتا ہے

بعضے مرداں یوں کہا آئے کر اگر ہووے تم سے کرو یہ ذکر

که شاہزادے دیں کے نبی کے ہیں آل   اونہوں سیتی ہے دین قائم بحال
بہ غربت اونہوں کے ظلم ظالماں   کہو جنگ نامہ بہ ہندی زباں

مصنف روشن علی کے عقیدے کے بارے میں مذہبی گفتگو کے بعد سماجی پس منظر میں بھی دیکھیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ مصنف پر اس کے ماحول کا بھی اثر پڑا ہوگا۔

جمیل جالبی نے اس قصہ کو تاریخی شواہد کی روشنی میں دیکھا۔ عاشور نامہ کا تعلق اسلامی تاریخ سے مربوط ہے لیکن اس کو حقیقت کا دوسرا روپ نہیں دیا جاسکتا۔ واقعات کربلا پر مرثیہ، نوحہ، سلام، اہل سنت، ہندو اور سکھوں وغیرہ نے بھی لکھے ہیں۔ اس صنف کو یا اس واقعہ کو کسی ایک طبقہ سے محدود کر دینا عقیدہ اور ادب دونوں کے بھی مغائر ہے۔

مسعود صاحب لسانی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "روشن علی نہ تو شاعر ہے اور نہ عالم زیادہ سے زیادہ ایک حجرہ نشین ملائے مکتب معلوم ہوتا ہے۔ عاشور نامہ کی تصنیف ایک مذہبی فریضہ کے طور پر عوام کے اصرار پر کر رہا ہے اسکی علمیت اور فارسی دانی کا یہ حال ہے کہ نہ تو وہ بقول خود فارسی جنگ ناموں میں کرداروں کے نام ٹھیک سے پڑھ سکتا ہے اور نہ ان کا اندراج اپنی تصنیف میں صحیح طور پر کر سکا ایک لحاظ سے اسکی حیثیت ایک عوامی شاعر کی ہے جو فارسی کے جنگ ناموں کو بہ "زباں" منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے" (۱۱)

مندرجہ بالا بیان میں مسعود حسین خاں نے عاشور نامہ کو بین السطور جنگ نامہ قرار دیا ہے۔ صنف مرثیہ کو انیسویں صدی میں مقبولیت حاصل ہوتی ہے یہیں سے مرثیہ میں رثائیت کا عنصر شامل ہونے لگتا ہے۔ اس بیان کی روشنی میں سید

قدرت نقوی کا قول خود ان کے ہی حوالہ سے غلط ہو جاتا ہے۔

"مرثیہ یعنی واقعات کربلا کا رثائی انداز میں بیان کرنا صرف شیعوں تک محدود اور مخصوص نہیں بلکہ بقول جوش ملیح آبادی:

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ (۱۲)

قدرت نقوی نے اپنے اس طویل تحقیقی یا تنقیدی مضمون میں تحقیق برائے تحقیق، یا تنقید برائے ادب نہیں بلکہ عقیدہ برائے عقیدہ کی شکل میں پیش کیا اور بعض جگہ شدید اختلافی نکات پیدا کرتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ "شہادت نامہ" حضرات اہل سنت والجماعت نے لکھے ہیں۔ اور یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ تمام سنی حضرات واقعہ کربلا سے عقیدت نہیں رکھتے بلکہ بعض گروہ اس کے شدید مخالف ہیں۔" (۱۳)

اس جملہ میں انہوں نے حقائق کو نظر انداز کر دیا ہے عقیدت کی حد تک ان کا بیان درست ہو سکتا ہے لیکن مخالفت کی جو بات کہی ہے وہ ایک علحدہ بحث ہے واقعہ کربلا سے سب ہی عقیدت رکھتے ہیں۔ لیکن اظہار کے طریقے بدل جاتے ہیں۔ عقیدت کا اظہار بعض گروہ کرتے ہیں اور بعض نہیں بلکہ نماز روزہ اور وظائف میں مشغول رہتے ہیں۔

مرتب نے عاشور نامہ کو "بکٹ کہانی" کے بعد دوسری اہم تصنیف قرار دیا ہے ان دونوں تصنیفات کے درمیان ۷۵ سال کا وقفہ بتاتے ہیں لیکن لسانی اعتبار سے اسکو بکٹ کہانی پر افضلیت دیتے ہیں کیونکہ عاشور نامہ بکٹ کہانی کی طرح برج بھاشا اور ریختہ کے روایت شعر میں جکڑا ہوا نہیں ہے۔

عاشور نامہ کی زبان کے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

"یہ ایک ایسی تصنیف ضرور ہے جس سے شمال میں اردو زبان کے

ارتقاء کا سراغ ملتا ہے ...... اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں لفظوں کا تلفظ کیا تھا۔ روزمرہ کی کیا صورت تھی" (۱۴)

مسعود حسین خاں نے عاشور نامہ کی لسانی اور صوتی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے آٹھ خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔

۱۔ ساکن کو متحرک کر دینا۔ ۲۔ متحرک کو ساکن کر دینا۔ ۳۔ مصوتوں کو انفی کر دینا۔

۴۔ مصوتوں کو انفی کر کے انہیں قافیہ میں استعمال کرنا۔ ۵۔ انفی کو غیر انفی بنانا۔

۶۔ مشدد کی تخفیف۔ ۷۔ مشدد بنانا۔ ۸۔ درمیانی ھ، ہ کی آواز کو گرا دینا۔

ان سب کی مثالیں عاشور نامہ سے تلاش کر کے پیش کی ہیں۔ حرف کے بیان میں صیغہ جمع سے بحث کرتے وقت بتایا ہے کہ عاشور نامہ میں دکنی اردو کے برعکس عربی اور فارسی کے جمع کے صیغے ملتے ہیں۔ صرف ایک ہی ہندی لفظ کی جمع (ان) سے بنائی گئی ہے اور باقی تمام کی جمع (وں) کے اضافے سے بنائی گئی ہے۔ جیسے شہروں۔

تذکیرو تانیث کے لحاظ سے عاشور نامہ کی زبان میں تائے تانیث پر ختم ہونے والے مذکر استعمال ہوئے ہیں جیسے خلافت، مصلحت، سکونت، شہادت، ضمائر عام طور پر موجودہ اردو سے ملتے جلتے ہیں چند ایسے بھی ہیں جنہیں قدیم اردو کی باقیات بتایا گیا ہے اور لکھا گیا ہے کہ یہ ضمائر اٹھارویں صدی تک بھی بعض مصنفین کے ہاں ملتے ہیں۔

مثلاً ہمن۔ ہم۔ ہمنا۔ ہمارے۔ تمہیں۔ تم،

عاشور نامہ کی زبان کے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"عاشور نامہ کی زبان اس دور کی خالص اردو ہے۔" (۱۵)

عاشور نامہ کی زبان صاف اور رواں ہے جس میں کمزور روایت کے باوجود

عوامی لہجہ اور معنوں کی مطابقت ملتی ہے۔

مسعود صاحب نے مقدمہ میں واضح کر دیا ہے کہ یہ مثنوی ایک مایوس کن تصنیف ہے جس میں ضائع و بدایع بحور اوزان قافیہ وغیرہ کے بارے میں مصنف کی لا علمی کا اظہار ہوتا ہے۔

قدرت نقوی نے عاشور نامہ کے مرتب پر اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے عاشور نامہ کو مرتب کرتے وقت تلفظ کی نشاندھی نہیں کی اگر تدوین میں تلفظ پر توجہ کی جاتی تو عاشور نامہ کو وزن اور بحر میں پڑھا جاسکتا ہے۔اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مرزا خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں

> "عاشور نامہ کے فاضل تبصرہ نگار سید قدرت نقوی صاحب نے اپنے مضمون میں بیشتر صفحات محض اس بات پر صرف کئے ہیں کہ اس کے مرتب نے اس کے مصنف روشن علی کے تلفظ کے مطابق تدوین متن کیوں نہیں کی اس کے تلفظ کے مطابق لکھنے کے بعد ہی باوزن ہوتے ہیں۔ہمارا خیال ہے کہ اگر مرتب تدوین متن میں اس بات کا التزام رکھتا تو مرتب شدہ متن مخطوطے سے بھی زیادہ گنجلک ہو جاتا۔ اس لئے فاضل مرتب نے روشن علی کے تلفظات کے بارے میں مفصل بحث اپنے مقدمہ میں کر دی ہے۔" (۱۶)

مرتب نے متن مقدمہ میں بھی اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

> "روشن علی کی فن سے ناواقفیت کا سب سے بڑا ثبوت اس کا اوزان و قوانی کا غلط استعمال ہے۔قدیم اردو شاعری کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ شاعر الفاظ کو اپنے عہد کے تلفظ کے مطابق باندھتا ہے اس لئے اکثر اوقات شعر اس عہد کے صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے پر مطابق وزن نکلے گا۔" (۱۷)

عاشور نامہ کی زبان سترھویں صدی عیسوی کے اواخر کی زبان ہے جو اس وقت مغربی اترپردیش کے بالائی دوآبہ میں رائج تھی چونکہ مصنف کے مقام کا کوئی پتہ نہیں چلتا (سہارن پور) کی صرف داخلی شہادت کے سہارے سہارنپور (سہارنگ پور) ۔ یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ روشن علی نے عاشور نامہ بالائی دوآبہ کی قصباتی زبان میں تصنیف کیا ہے ۔ سید قدرت نقوی اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں عاشور نامہ کی زبان سہارنپور کی نہیں کیونکہ یہاں کے دیہاتوں میں اب بھی قدیم زبان مروج ہے اس سلسلے میں انہوں نے جو مثال دی ہے اس سے مسعود حسین خان کے بیان کی تصدیق ہوجاتی ہے ۔ لیکن سید قدرت نقوی لکھتے ہیں:

" وہاں اب بھی انکھیاں ، باتاں ، مدتاں ، ٹانگاں ، عورتاں ، جیباں ، پلنگاں ، کھاٹاں قسم کے الفاظ بولے جاتے ہیں ....

بعینہٖ یہی زبان آپ حیدرآباد دکن کی خواتین سے آج بھی سن سکتے ہیں محمد تغلق کے عہد میں جو زبان شمالی ہند سے دکن گئی تھی بول چال میں آج بھی وہی شمالی ہند کے دیہات میں اور دکن کے شہروں میں مروج ہے یہ دونوں جگہ زبان کا اشتراک اس بات کا بین ثبوت کہ دکن میں زبان شمالی ہند میں رہنے والے اپنے ساتھ لے گئے تھے دنی اردو کوئی الگ زبان نہیں ۔" (۱۸)

شمالی ہند میں اردو کا ارتقاء خسرو کے بعد ۱۳۲۵ء سے رک کر تین سو سال بعد پھر بکٹ کہانی سے شروع ہوتا ہے لیکن جنوب میں یہ خلاد کنی اردو سے پر ہوتی رہی ہے دکنی شمالی ہند کی بولیوں کے خمیر سے نشو ونما پاتی ہے جس پر دکن کے کثیر لسانی ماحول کا اثر پڑتا ہے تو وہ شمالی ہند کے زبان سے اپنا ایک الگ روپ دھار لیتی ہے ۔ دکنی اردو کی لسانی خصوصیات میں شمالی ہند بالخصوص نواح دہلی کی بھی کئی ایک بولیوں کا اثر ملتا ہے لیکن یہاں دکنی اردو دراوڑی خاندان کی دوسری زبانوں اور

ہند آریائی زبان مرہٹی کے اثرات سے ایک الگ زبان دکنی اردو بن جاتی ہے۔ دکنی پر جغرافیائی اثرات کا بھی بڑا اثر پڑتا ہے دکنی علاقہ میں ق اور خ کا فرق نہیں کیا جاتا اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ:

"یہ خصوصیات صرف دکن سے منسوب نہیں بلکہ شمالی ہند کی عوامی بولیوں میں بھی بعض الفاظ میں "ق" اور "خ" میں تبدیلی پائی جاتی ہے۔" (۱۹)

مسعود صاحب نے لسانی خصوصیات کے جائزہ میں تحقیقی معلومات فراہم کی ہیں ان میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو دکنی اردو کے ہیں اور وہ آج بھی دکن میں مروج ہیں۔

صوتی خصوصیات کے اعتبار سے عاشور نامہ میں جو قدیم اردو کی خصوصیات ملتی ہیں وہ دکنی اردو کا خاص عنصر ہے مثلاً درمیانی "ہ" گرا کر ہکاری آواز بھی "ھ" کی آواز کھو دیتی ہے۔

عاشور نامہ میں، توئی (تو ہی) نیں (نہیں) ہات (ہاتا)یہی خصوصیات دکنی اردو میں اب بھی مروج ہیں۔ کیَ (کہی) وئی (وہی) کچ (کچھ) آنک (آنکھ) ری (رہی) وغیرہ۔

عاشور نامہ کو سید قدرت نقوی قدیم مثنوی نوسرہار سے مشابہت قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ترتیب و تسلسل واقعات کی دونوں میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔

" محمد حنیف کی "جنگ" اور "عاشور نامہ" کی طرح نوسرہار میں بھی فرق صرف عالم و نیم ملا کے طرز بیان کا ہے۔" (۲۰)

اس مثنوی میں مصنف نے جنگ ناموں کا اور قصوں کا ذکر کیا ہے ان میں قابل ذکر محمد حنیف کا جنگ نامہ ہے ملا حسین واعظ کاشفی کی روضتہ الشہداء، وغیرہ

ہے لیکن اس میں اشرف بیابانی کے نوسرہار کا کہیں بھی اشارہ نہیں اس کے ہم عصر اسمٰعیل امروہی کے عقائد سے بہت قریب تر معلوم ہوتا ہے ۔ لسانی اور صوتی شہادتوں کی روشنی میں پھر یہ بات قابل غور ہو جاتی ہے کہ جنوبی ہند کی تصنیفات، ماحول، زبان کا اگر اتنا اثر عاشور نامہ میں ملتا ہے تو اسے دکنی تصنیف کیوں نہ کہا جائے کیونکہ اس میں دکنی سے قریبی مماثلت ہے یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مصنف کا علاقہ سہارنپور نہیں ہوسکتا یہ مالوہ کا سارنگ پور ہی ہوسکتا ہے ۔ کیونکہ مالوہ اور گجرات کی زبان میں دکنی سے قریبی مماثلت ملتی ہے اور مالوہ کا علاقہ ابتداء ہی سے مسلمان آبادی کا مرکز رہا ہے ۔ ڈاکٹر گیان چند جین کا بھی یہی خیال ہے ۔ لکھتے ہیں:

> " عاشور نامہ میں مجھے تیسری کیفیت نظر آتی ہے ۔ مجھے ڈاکٹر مسعود حسین سے عدم اتفاق کرنے کی ضرورت نہیں کہ روشن علی مغربی یوپی کا متوطن رہا ہوگا لیکن انہوں نے جو لسانی تجزیہ کیا ہے اس میں بعض خصوصیات ایسی بھی ہیں جو شمالی اردو کے مقابلے میں دکن میں زیادہ نمایاں ہیں ۔ واضح ہو کہ دکنی سے مماثل بعض خصوصیات وسط ہند اور گجرات میں مل جاتی ہیں " (۲۱)

عاشور نامہ کی تدوین ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے صرف ایک میکرو فلم سے کی ہے ۔ اس کی لسانی اہمیت کے باوجود کسی نے دوبارہ ایڈٹ کرنے یا مسعود صاحب کی دی ہوئی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش نہیں کی ہے ۔

عاشور نامہ کا صرف ایک مخطوطہ رام پور کی لائبریری میں موجود تھا مسعود صاحب نے سید سفارش حسین کے توسط سے اس کی میکرو فلم حاصل کر کے تفصیلی مقدمہ کے ساتھ پیش کیا ہے ۔

> " عاشور نامہ اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اسے طبع کرا کے اہم کام کیا ہے ۔ اردو کی ادبی دنیا

میں اس کو روشناس کرانے کا سہرا ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے سر ہے" (۲۲)

اس کی ترتیب میں مرتب نے سال بھر محنت کی جس کو سفارش حسین میکرو فلم کے باوجود سرانجام نہیں دے سکے تھے۔ مسعود حسین خاں خود لکھتے ہیں:

"قدیم متون کی ترتیب کا تسلسل غرض کہ اپنی صبح تھی اور نہ شام اسی زمانے میں شمالی ہند کے ایک قدیم متن، روشن علی سہارنپوری کے عاشور نامہ کو مرتب کیا جو ۱۶۸۸ء کی تصنیف ہے اور جس کا واحد نسخہ رضا لائبریری رامپور کا مخزونہ ہے اس کا فوٹو عکس مجھے سید سفارش حسین صاحب نے لا کر دیا تھا اور جب وہ خود اس سے عہدہ برا نہ ہوسکے تو مجھے اس کی جانب مائل کیا میں نے سال بھر کی محنت کے بعد اسکی ترتیب وتدوین متن مکمل کرلی۔ جب میں نے خواہش ظاہر کی کہ اس کے مؤلفین میں ان کا نام بھی شامل کیا جائے تو بولے "اس میں میرا کیا ہے۔ ترتیب وتدوین آپ کی، پیش لفظ آپ کا، میں نے تو صرف خدمت کی ہے۔ کتاب شائع ہوتے وقت میں نے مولفین میں ان کا نام ان کے کہنے کے باوجود شامل کیا ہے۔" (۲۳)

مسعود صاحب نے نہ صرف مولفین میں نام شامل کیا ہے بلکہ مقدمہ میں بھی "میں" نہیں بلکہ "ہم" لکھا ہے۔ مثلاً:

"ترتیب دیتے وقت ہم نے مخطوطہ کا یہ انداز جوں کا توں قائم رکھا ہے" (۲۴)

مقدمہ کے آخر میں اسطرح اعتراف کرتے ہیں۔

" عاشور نامہ کو اردو دنیا میں روشناس کرانے کا سہرا سید سفارش حسین رضوی صاحب کے سر ہے

جنہوں نے اس کا ذکر سب سے پہلے اپنی تصنیف " اردو مرثیہ " میں کیا ہے اس کے بعد اردو ادب ۱۹۷۱ء میں اس پر ایک مختصر تعارفی مضمون بھی شائع کیا۔ انہیں کی عنایت سے مجھے اس مخطوطہ کی میکرو فلم اور اسکی ایک نقل بھی حاصل ہوئی اس لئے تالیف کو اشتراک نام کے ساتھ شائع کرا رہا ہوں۔" (۲۵)

==========

عاشور نامہ

۱۔ قصہ جم جاہ ایک قدیم نظم ہے جس کا قلمی نسخہ مولوی عبدالصمد صاحب کے ذاتی کتب خانہ اردو ریسرچ سنٹر حیدرآباد میں ہے۔

۲۔ پروفیسر عبدالعظیم خاں۔ پیش لفظ مشمولہ، اردو زبان تاریخ تشکیل تقدیر۔ ص ۱

۳۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو، جلد دوم، حصہ اول۔ ص ۴۶

۴۔ سید قدرت نقوی۔ فکر و نظر۔ نذر مسعود، ص ۳۰۷

۵۔ مرزا خلیل احمد بیگ۔ اردو کی لسانی تشکیل۔ ص ۹۵

۶۔ مرزا خلیل احمد بیگ۔ اردو کی لسانی تشکیل۔ ص ۹۶

۷۔ مرزا خلیل احمد بیگ۔ مسعود حسین خاں، مراسلہ جامعہ اردو علی گڑھ اپریل ۱۹۸۸ء مشمولہ نذر مسعود

۸۔ سید قدرت نقوی۔ مضمون عاشور نامہ۔ فکر و نظر مشمولہ، نذر مسعود۔ ص ۳۰۸

۹۔ سید قدرت نقوی۔ مضمون عاشور نامہ۔ فکر و نظر مشمولہ، نذر مسعود۔ ص ۳۱۴

۱۰۔ مسعود حسین خاں۔ عاشور نامہ۔ قدیم اردو۔ ص ۹

۱۱۔ مسعود حسین خاں۔ قدیم اردو   عاشور نامہ   مقدمہ۔ ص ۱۵

۱۲۔ سید قدرت نقوی۔ نذر مسعود، فکر و نظر علی گڑھ۔ ص ۳۱۵

۱۳۔ سید قدرت نقوی۔ نذر مسعود، فکر و نظر علی گڑھ۔ ص ۳۱۵

۱۴۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو، حصہ اول۔ ص ۵۱

۱۵۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو، حصہ اول۔ ص

۱۶۔ مرزا خلیل احمد بیگ۔ نذر مسعود، فکر و نظر۔ ص ۳۱۸

۱۷۔ سید قدرت نقوی۔ "مضمون" مشمولہ۔ نذر مسعود۔ ص ۳۲۰

۱۸۔ سید قدرت نقوی۔ فکر و نظر۔ نذر مسعود۔ ص ۳۱۳

۱۹۔ سید قدرت نقوی۔۔ نذر مسعود، ص ۳۲۷

۲۰۔ سید قدرت نقوی۔ فکر و نظر۔ نذر مسعود۔ ص ۳۲۸

۲۱۔ گیان چند جین۔ نذر مسعود، فکر و نظر۔ علی گڑھ۔ ص ۱۳۱

۲۲۔ سید قدرت نقوی۔ فکر و نظر۔ ص ۳۲۹

۲۳۔ مسعود حسین خاں۔ ورود مسعود، خود نوشت خدا بخش اورینٹل لائبریری۔ ص ۲۱۳

۲۴۔ مسعود حسین خاں۔ عاشور نامہ۔ قدیم اردو، جلد چہارم۔ ص ۱۲

۲۵۔ مسعود حسین خاں۔ عاشور نامہ۔ قدیم اردو۔ ص ۳۲

انتخاب کلام غالب

مسعود صاحب کی نظریہ انتخاب کلام غالب، شعرمیں تخلیق شعر سماجی زندگی کی گردشوں میں ہوتی ہے۔شاعری کا ایک سرا نظرمیں اور دوسرا اعمال حیات سے متعلق ہے۔انھوں نے شعر کو جدید ہئیتی کسوٹی پر پرکھا ہے اور صوتیاتی نقطۂ نظر سے اقبال و غالب کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے۔اقبال اور غالب ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ غالب کے صوتیاتی آہنگ و غالب کے نثر کی لسانی اہمیت اور اس کا اسلوب غالب میں ردیف و قوافی کی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔غالب سے ان کی ذہنی تشنگی نے مسعود صاحب سے غالب کے "مجموعہ کلام" کا انتخاب مرتب کروایا ہے۔مجموعۂ انتخاب کلام غالب سرسید بک ڈپو علی گڑھ سے ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ ۲۲۴ صفحات پر مشتمل معلومات کی روشنی میں انتخاب کو پیش کیا ہے۔

اس مجموعہ کو مسعود صاحب نے اپنے چچا ڈاکٹر یوسف حسین خاں سے انتساب کیا ہے۔یہ کتاب غالبیات میں ایک اضافہ ہے۔اس میں مسعود صاحب نے غالب کے منتخبہ کلام کو تاریخ وار مرتب کیا ہے جسکے لئے انھوں نے مختلف دواوین اور نسخہ کلام کا جائزہ لیا ہے۔

اس انتخاب کے بارے میں مسعود صاحب نے لکھا ہے:

> "غالب کے مکمل مجموعہ کلام کی تدوین کا کام تو امتیاز علی عرشی مرحوم اور کالیداس گپتا رضا اپنے اپنے انداز میں انجام دے چکے ہیں۔تاریخ اور مکمل انتخاب کا بیڑا راقم السطور نے اٹھایا ہے۔" (۱)

غالب کا کلام ہر ذوق کی تکمیل کے ساتھ ہر زمانے میں تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔

غالب کی شاعری میں جدید ذہن اور پر کشش انداز ملتا ہے۔وہ لہجہ سوچنے پر اکساتا ہے سوال کرنے کیطرف مائل کرتا ہے ۔ اردو شاعری کی تسکیک اور استفہامیہ ذہن غالب کی دین ہے۔اسے اپنے تخیل کی پرکاریوں سے اردو شاعری کو نیا مزاج دیا ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پاپا یا

اس انتخاب میں دیوان غالب ۱۸۱۶ء (بخط غالب) تا جدید نسخہ رام پور ۱۸۵۵ء کے نسخہ جات سے ردیف اور تاریخی ترتیب کلام کو مرتب کیا ہے۔

ہماری زبان میں تبصرہ نگار نے اس انتخاب کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہوے کہ:۔

تدوین و تشریح سب کے لئے محنت و کاوش کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ذوق وشعور کی ضرورت ہے۔اس معاملے میں تحقیقی معلومات کے ساتھ تنقیدی بصیرت بھی درکار ہے ۔ ماہرین غالب نے بالعموم ان دونوں صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔چناچہ کلام غالب کے متعدد معتبر مجموعہ شایع ہوچکے ہیں ۔ان ہی میں ایک اضافہ مشہور ماہر لسانیات اور عالم ادب ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا مرتب کیا ہوا تازہ ترین مجموعہ انتخاب کلام غالب ہے۔" (۲)

انتخاب کلام

۱۔ مسعود حسین خاں ۔انتخاب کلام غالب ۔ سرسید بکڈپو علیگڑھ ۔ص

۲۔ڈاکٹرعبدالمغنی ۔ہماری زبان ۔ ۲۲/ فروری ۱۹۹۲ء۔ ص ٦

دکنی اردو لغت

اردو میں لغت نویسی کی تاریخ کم و بیش (۴) سو سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ مسعود حسین خاں نے گریرسن کے حوالے سے پہلے لغت کی نشاندہی ۱۶۳۰ء میں کی ہے اس لغت کی تاریخ

"مسٹر کورچ Quaritich کے مرتب کردہ کیٹلاگ ۱۸۸۷ء سے ملتی ہے جس میں ۱۶۳۰ء میں مرتب شدہ ایک فارسی ہندوستانی انگریزی، پرتگالی چہار لسانی فرہنگ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔"(۱)

اٹھارویں صدی میں لغات کے مولف اہل یورپ تھے۔ اس کے بعد لغت نویسی کا کام منظم طریقہ پر انجام پانے لگا۔ ہندوستانی عالموں میں اردو لغت نویس کی حیثیت سے عبدالواسع ہانسوی کا نام سرفہرست آتا ہے۔ جنہوں نے اورنگ زیب کے عہد میں ایک مختصر سا لغت لکھا تھا۔ اسکے بعد خانِ آرزو نے ۱۷۵۱ء میں اسی لغت کی تصحیح کر کے نوادر الالفاظ کے نام سے مرتب کیا تھا۔

سید احمد دہلوی نے ۱۸۶۸ء میں اردو لغت نویسی کی داغ بیل ڈالی۔ لغت نویسی کا تجربہ انھیں مشہور لغت نویس فیلن کی تربیت میں حاصل ہوا تھا۔ اسطرح ۱۸۶۸ء سے باضابطہ لغت نویسی کا آغاز ہوتا ہے۔ اسکے بعد ۱۸۹۱ء میں امیرمینائی کا امیر اللغات، ۱۹۴۵ء میں مولوی نورالحسن کی نوراللغات قابل ذکر ہے۔ ۱۹۳۵ء میں خواجہ عبدالمجید کی جامع اللغات اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ جامع اللغات انسائیکلو پڈیا کے اصولوں کی روشنی میں مرتب کیا گیا۔ آخر میں مہذب لکھنوی کا مہذب اللغات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا جو ایک انفرادی کوشش ہے۔

بیسویں صدی عیسوی سے دکن میں دکنی تحقیق کا آغاز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور،

شمس اللہ قادری ، نصیر الدین ہاشمی کے تذکروں اور تاریخ کی وجہ سے دکنی ادب کے پوشیدہ خزانوں کا سراغ ملنے لگا۔ ادارہ ادبیات اردو ، جامعہ عثمانیہ اور سلسلۂ یوسفیہ کی اشاعت کے تحت قدیم فن پاروں کی تلاش و تحقیق اور تدوین کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ دکنی لغت کی ضرورت بھی شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ تلاش و تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں یعنی ۱۷۹۵ء کے قریب کثیر الفوائد کا علم ہوتا ہے۔ یہ لغت فارسی اور دکنی اردو میں ہے جس کو شاہ محی الدین نے مرتب کیا تھا کثیر الفوائد میں تقریباً ۲۵۰۰ فارسی الفاظ کے دکنی میں معنی دیے گئے ہیں۔ دکنی معنوں پر اعراب بھی لگائے گئے ہیں جس سے دکنی الفاظ آسانی سے پڑھے جاسکتے ہیں۔ خوان لغما (۲) ۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۷ھ کے درمیان کی تصنیف ہے۔ یہ منظوم فارسی کی دکنی لغت ہے۔ اسکے علاوہ رزاق باری مطبوعہ ۱۲۹۰ھ مطبوعہ کتب خانہ آصفیہ (۳۴۱۲ جدید)۔ اور قادرِ باری ۱۲۱۰ھ (مخطوطہ آصفیہ نمبر ۳۹۹۴ جدید) مصنفہ فیاض عسکری اور غرائب الہدیٰ کا بھی پتا چلتا ہے

۱۹۲۵ء کے بعد دکنی کتابوں کی ترتیب کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی ۱۹۵۰ء میں سید شعار احمد شعار کی دکنی اردو لغت ہے جو ۵" x ۴ " سائز کی ہے اس مختصر لغت میں (۹۳۰) الفاظ دیئے گئے ہیں جسکی خوبی یہ ہے کہ دکنی بول چال کے الفاظ اس میں زیادہ ہیں اور ادبی الفاظ کم ہیں۔ یہ ابتدائی کاوش تھی جس میں لغت نویسی کو کچھ اور وسعت دی گئی۔

۱۹۶۲ء میں مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی مقرر ہوے اس سے قبل اردو حلقہ میں مسعود صاحب ایک ناقد اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ یہاں انھوں نے دکنی ادب کے کام میں ایک نئی جوت جگائی اور دکنی ادب کے مرتبین کی دشواریوں کو سمجھا۔ چنانچہ دکنی لغت کی تیاری کے منصوبے بنائے جانے لگے۔ بالآخر ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے دکنی اردو کا پراجکٹ منظور ہوا۔

مسعود حسین خاں نے اپنے رفیق کار ڈاکٹر غلام عمر خاں اور شاگرد بدیع حسینی کے اشتراک سے اس لغت کو مکمل کیا۔ دکنی اردو لغت بڑی محنت اور تحقیق سے مرتب کی گئی ہے یہ اپنی نوعیت کی پہلی لغت ہے۔ ۲۶۷ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نثری اور شعری تصانیف کی سندوں سے اس لغت کو مرتب کیا گیا۔ ۳۸۱ صفحات پر مشتمل دکنی اردو لغت میں حضرت خواجہ بندہ نواز سے ولی ویلوری تک کے تصانیف سے حوالے دیئے گئے ہیں۔

یہ لغت چھ ہزار سے زیادہ الفاظ پر مشتمل ہے اگر چہ کہ اس سے کئی زیادہ الفاظ مختلف تضانیف سے جمع کئے گئے تھے۔

لغت نویسی ایسا فن ہے جسکے لئے لغت نگار کو دشوار کن اور صبر آزما حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں مسعود صاحب نے لغت نویسی کے مسائل پر مسبوط مقالہ بھی قلم بند کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں فن لغت نویسی پر اچھا عبور ہے۔ لیکن یہ لغت ایک کلاسیکی زبان سے متعلق ہے اور اس زبان میں لسانی، ادبی، تہذیبی اور علاقائی خصوصیات بھی شامل ہیں۔ ایسی لغت کیلئے ضروری ہے کہ لغت نگار اس زبان پر بھی عبور رکھے۔

وارث سرہندی لکھتے ہیں:

"عام علاقائی الفاظ کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے اور شاید ناممکن۔ کیونکہ کوئی بھی لغت نگار ہر علاقہ کی زبان کا ایسا ماہر اور عالم نہیں ہوسکتا کہ ہر علاقہ کا ہر لفظ اسکے ذہن میں ہو۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ زبان بنیادی طور پر بولنے سے تعلق رکھتی ہے۔ تحریر سے اس کا تعلق ثانوی درجے کا ہے۔" (۳)

مسعود صاحب ایک ماہر لسانیات اور صوتیات ہیں انہیں دکنی اردو اور شمالی ہند کی ابتدائی کڑیوں کا اور اس زبان پر بیرونی اور علاقائی زبانوں کے اثرات کا

بخوبی علم ہے ۔ جس کا جائزہ انھوں نے اپنے " مقدمہ تاریخ زبان اردو " میں تفصیل سے لیا ہے اردو زبان کے آغاز کے بارے میں نواح دہلی کو پراشش بولیوں کا جو نظریہ دیا ہے وہ مستند ہو چکا ہے ۔ انھوں نے اس مقدمہ میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ خلجی اور تغلق افواج جب جنوبی ہند کا رخ کرتی ہیں تو وہ اپنے ساتھ ایک سیال بولی لاتی ہیں ۔ اس سیال بولی کے ساتھ ان کے تہذیبی، تاریخی، مذہبی اور معاشرتی روایات بھی منتقل ہوتی ہیں یہاں دکن میں نیا لسانی روپ ہند آریائی مرہٹی زبان کا ہے جسکے ساتھ، دراوڑی خاندان کی تلنگی اور کنڑی زبانوں کی آمیزش سے ایک نئی زبان بنتی ہے ۔ یہی زبان دکنی کہلائی ۔ دکن میں پہلے بہمنی سلطنت کے حکمرانوں نے بعد میں اس کی خود مختار ریاستوں کے حکمرانوں نے اس زبان کی سرپرستی کی اور اسکو درباری زبان کی حیثیت سے فروغ دے کر نکھارا ۔ جس سے کئی ایک تخلیقات منظر عام پر آئیں شمالی ہند سے جنوب کا مسلسل تاریخی ارتباط اور توسیع پسندی نظریات کے پیش نظر مسعود صاحب نے اس زبان کو " قدیم اردو " کا نام دیا ہے ۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں یہ " قدیم اردو " ہندی سرمایہ میں منتقل نہ ہو جائے ۔

۱۹۶۴ء میں شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے ایک تحقیقی رسالہ جاری کیا تو اس کا نام بھی انہوں نے " قدیم اردو " ہی رکھا جو قدیم ادب کے مرتبہ متون پر مشتمل تھا ۔

قدیم اردو کہنے سے دکنی کی تخصیصی وضاحت نہیں ہو تھی سکتی ۔ لہذا مسعود صاحب نے اس تخصیص کی برقراری کے لئے اس لغت کا نام " دکنی اردو لغت " رکھا ۔

لغت کے اس عنوان سے متعلق دیوی سنگھ چوہان لکھتے ہیں ۔

> " گردپوش پر کتاب کا نام " دکنی اردو کی لغت " دیا گیا ہے اور اندر ٹائٹل کے صفحے پر دکھنی اردو کی لغت " چھپا ہے ۔ ایک علمی کتاب کے نام میں یہ دورنگی اچھی نہیں معلوم ہوتی ۔ " (۴)

اس لغت کی تیاری کے لئے منقولہ الفاظ سے کہیں زیادہ الفاظ جمع کئے گئے تھے لیکن ان میں سے کچھ اردو سے مماثلت اور کچھ مشتبہ ہونے کی وجہ سے شامل نہیں کئے گئے۔

لغت کی ترتیب کے لئے ضروری ہے کہ اس زبان کی اہم ترین خصوصیات اور الفاظ کی صحیح صورت حال معلوم ہو۔ لیکن دکنی اردو میں ہند آریائی اور دراوڑی خاندان کی زبانوں کا اثر زیادہ ملتا ہے۔ جس سے کئی ایک دخیل الفاظ دکنی میں ملتے ہیں۔ اس لغت میں مشترکہ دخیل الفاظ کی نشاندہی پروفیسر اشرف رفیع نے اس طرح کی ہے۔

عربی	بجد	باصرار	(۷۰)
فارسی	دریغاں	افسوس	(۱۹۵)
تلنگی	پنڈو	پھل	(۱۱۹)
تلنگی	درا	صاحب،	مالک (۱۹۴)
کنڑی	سترائیگی	صفائی	(۲۲۲)
کنڑی	بومڑی	واویلا۔ چیخ وپکار	(۸۸)

حرف ندا برائے تانیث

مرہٹی	بھنڈوارا	پریشانی	گڑبڑ (۹۷)
	منگٹ	کلائی۔ پہنچہ	(۳۳۹)

اسی لغت میں معنوں کی وسعت نہیں ملتی۔ لغت کا دائرہ وسیع ہوتا ہے جس میں معنوں کی گہرائی اور گیرائی ہوتی ہے۔ اور حدود کا تعین بھی کیا جاتا ہے۔ علمی اور ادبی لغات میں اصطلاحی تعریفات، مرادی معنی، نثری یا شعری حوالوں کے ساتھ درج ہوتے ہیں۔ کسی بھی لغت میں اسطرح کی تفصیل نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں پروفیسر اشرف رفیع لکھتی ہیں:

"دکنی اردو کی لغت ایک قدیم زبان کی لغت ہونے کے اعتبار سے ڈکشنری سے زیادہ فرہنگ سے مشابہ ہے۔" (۵)

حروف تہجی کی ترتیب میں املا اور اعراب میں اور بعض مقامات پر ترتیب میں بھی فرق ملتا ہے۔قدیم خاص کر دکنی تلفظ کی ادائیگی کے لئے اعراب ہونا ضروری ہے۔ اشرف رفیع لکھتی ہیں:

"اعراب لگانے سے صحیح اور مستند تلفظ ادا نہیں ہوسکتا اعراب کے ساتھ ساتھ تحریری تلفظ کا طریقہ اور اسکی علامات کا لغت میں استعمال ضروری ہے تاکہ قدیم زبان سے ناواقف لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔اردو کی تمام لغات میں اسی کمی کا احساس ہوتا ہے" (۶)

دیوی سنگھ نے بھی الفاظ کی درست قراءت اور اصل معنی کی ضرورت کی طرف اشارہ کیا ہے۔مولوی عبدالحق نے قدم متون کی ترتیب میں جن الفاظ کے معنی دیئے ہیں وہ درست ہیں۔اس سلسلے میں دیوی سنگھ لکھتے ہیں:

"انھوں نے الفاظ کے معانی کو صحیح طور پر سمجھا ہے۔اسکی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ برسوں تک اورنگ آباد میں رہے اور اسی شہر سے ان کا دکھنی کا کام شروع ہوا۔انھوں نے مراٹھی زبان کے تدبھو الفاظ کو جو دکنی میں مستعمل ہیں سمجھنے کی کافی کوشش کی ہے۔انھوں نے گلشن عشق میں سنترنا، بسیاؤان، کھان، کھنورا (گھنورا) وغیرہ جیسے الفاظ کے معنی دئے ہیں اور وہ درست بھی ہیں۔" (۷)

مسعود حسین خاں نے بھی اپنی لغت میں سند کی روشنی میں اکثر صحیح حوالے دیے ہیں لیکن بعض جگہ معنی بدل بھی جاتے ہیں جبکہ سند سے الگ معنی نکلتے ہیں

بیاہ بدنا۔ بیاہ کرنا (۴۴)

بیاہ بدیوں تجھ میرا حال ہے

بیاہ بدنا۔ نکاح ٹوٹنا

لغت میں ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک لفظ کے ایک سے زیادہ معنی بھی دیئے گئے ہیں اور ساتھ ہی سندیں بھی دی گئی ہیں۔

چند ایک مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ جیسے

پوچ وچار۔ وھاں بھلہ ہو برے کا پوچ وچار ہووے گا (سب رس)

پوچ وچار۔ پوچھنا۔ وچارنا۔ (۸)

ٹھوک پیٹ۔ ٹھوکنا پیٹنا۔ لگادے ٹھوک پٹیاں وئیں ہوئی دوڑ (پھول بن)

دکنی اردو لغت میں الفاظ کی صراحت اور قواعد کی ترکیب نہیں دی گئی ہے۔ تذکیر و تانیث کی بھی صراحت نہیں ہے۔ عام طور پر دکنی میں یہ نہیں لکھا گیا کہ لفظ اصلاً مونث ہے یا مذکر۔

لاحقہ لگا کر یا تغیر حرف کے ذریعے ہیئتی تبدیلی کی جاتی ہے۔

اس سلسلے میں سری رام شرما نے "دکنی زبان کے آغاز و ارتقا" میں طویل بحث کی ہے دکنی زبان جمع کے صیغے کے لحاظ سے بہت وسیع ہے۔ اسم کے علاوہ صفات اور افعال کی بھی جمع بنائی جاتی ہے۔

سانپاں (اسم)۔ بچھواں (اسم)۔ ستاریاں (فعل)۔ جاتیاں (فعل) بھونیا (صفت)۔ ڈونگیاں (صفت)

لغت میں وہ الفاظ جو جمع کے صیغے میں آئے ہیں، ان میں واحد کی صراحت بھی ہونی چاہیئے لیکن لغت میں اس طرح کی صراحت نہیں ملتی۔ البتہ بعض الفاظ کے کئی ایک مترادفات دیے گئے ہیں مثلاً

چھند۔ چال۔ مکر و فریب۔ ترکیب۔ نفاست، حسن و خوبی۔ ناز و انداز۔ ص (۱۷۹) اور سند کے طور پر اشعار بھی دیئے گئے ہیں جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایک

لفظ کو مختلف شاعروں اور مصنفوں نے کس طرح استعمال کیا ہے۔

سنپڑنا۔ پہونچنا۔ مشتعل ہونا۔ گرفتار ہونا۔ پھنسنا۔ ملنا۔ ص (۲۴۴)

افعال کے لحاظ سے دکنی کے روپ، اردو سے مختلف ہیں۔ زیادہ تر مادہ پر "وں لگاکر فعل حال بنایا جاتا ہے۔ ادبی، دکھنی اور عام بول چال کی دکھنی کے کلمۂ فعل میں مادوں کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ مادوں کے استعمال کے لحاظ سے دکھنی ثبوی وسیع زبان ہے۔ اس میں زیادہ تر سنسکرت مادے ملتے ہیں جو وسطی ہند آریائی اور ابتدائی جدید ہند آریائی زبانوں کے تغیرات کو قبول کرتے ہوئے دکنی میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ دکنی میں بعض مادے دوسری زبانوں سے بھی آئے ہیں۔ مرکب اور مجرد مادے، کھڑی بولی کی طرح جدید ہند آریائی سے دکنی میں داخل ہوے ہیں۔

گھٹ۔ سنسکرت گھٹ

پھٹ۔ سنکرت سپھٹ

منسلک۔ سرک سراکرت ص (۲۴۱)

اردو میں سنسکرت ہندی اور فارسی کے اسمایا صفات کے ساتھ فعل سادہ کے استعمال سے افعال اور مصادر بنائے جاتے ہیں۔ دکنی اردو لغت میں بھی ایسے افعال اور مصادر بے شمار ملتے ہیں۔

رضالینا۔ صبر جانا۔ روشن کرنا۔ پیدا ہونا۔

دکنی اردو لغت میں مصدر اس طرح ملتے ہیں

سنگار۔ سنگارنا۔ سنگاری۔ ص (۲۴۵)

دکنی میں لاحقہ سے قبل مصدر میں الف کی بجائے "ے" (یائے مجہول) کے اضافے سے فاعل بنایا جاتا ہے۔ مثلاً

جاریاں، دیکھیاں، باریاں وغیرہ اس قسم کی مثالیں لغت میں بھی ہیں۔

سویاں ۔ سوئیان ۔ ص (۲۵۲)

بعض اوقات ہندی فارسی یا عربی اسم کے آگے ونت یا ونتا کے لاحقہ سے اسم فاعل بنایا جاتا ہے ۔ جیسے

مہرونت ۔ محبت رکھنے والا یا محبت کرنے والا ۔ ص (۳۴۴)

پچھانت ونتا ۔ پہچاننے والا ۔ مردم شناس ۔ ص (۱۱۲)

دکھنی عہد میں ابھی زبان کی قواعد بندی نہیں ہوئی تھی، کسی بھی زبان کے ارتقائی مدارج میں جبکہ زبان اپنی سیال حالت میں ہو زبان کی گرامر مرتب کرنا مشکل ہوتا ہے ۔ اس کا استعمال شعراء اور مصنفین اپنی اپنی سہولت کے لحاظ سے کرتے ہیں ۔

دکنی میں املا، تلفظ، تذکیر و تانیث، جمع اور واحد، افعال اور حروف کے استعمال میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ۔ لسانی اعتبار سے بھی دکنی کا مطالعہ دلچسپ ہوگا ۔

لغتوں کی ترتیب میں مذکورہ بالا تبدیلیوں کی بھی نشاندہی ضرور ہونی چاہئے ۔

حروف کو ساقط کرنے یا تخفیف یا اضافہ کرنے کا رجحان دکنی شعرا اور مصنفین میں زیادہ تھا ۔ دکنی ادب کے فن پاروں میں علماء، اکابرین، مذہبی رہنماؤں کے اسمائے گرامی میں بھی غلط املا ملتا ہے ۔ جیسے جیسے علمی ترقی ہوتی گئی نئے افکارات و نظریات تاریخ کی روشنی میں منظر عام پر آتے گئے ویسے ویسے صوتیات، اور معنیات پر توجہ ہوتی گئی ۔ ان تبدیلیوں کو لغت ہی میں تلاش کیا جاسکتا ہے ۔ لغات میں ذخیرہ الفاظ، تاریخ و تہذیب اور افکار کے ریکارڈ کی حیثیت میں محفوظ رہتا ہے ۔ اس لغت میں مسعود حسین خاں نے اپنی لسانی مہارت اور تفکر کو بروئے کار لاکر املا بھی صحیح کیا ہے ۔ مثلاً

محی دیں توں ۔ دیں تجھ تھے صبا۔

پیربین ۔(پروین) ۔ماہر ص (۱۱۳)

جم ۔(یم) ۔موت کا دیو تا ص (۱۵۳)

جمات ۔(جماعت) ۔گروہ ص (۱۵۳)

حرہم ۔(ہضم) ۔انجذاب ص (۱۸۳)

محی الدینیاں ۔(محی الدین) محی الدین کے پیرو ص (۲۳۰)

مہراج ۔مہاراج ۔مالک ص (۳۴۴)

اس لغت میں مسعود صاحب نے صحیح املا بھی دیا ہے اور جہاں حرف گرائے گئے ہیں یا ان میں اضافہ یا تقلب ہوا ہے تو وہاں صحیح لفظ بھی درج کیا ہے ۔جیسے

صبا (صبح) ۔منج (منجہ) مجھ وغیرہ

لیکن بعض جگہ قرأت اور الفاظ کی صحیح نشاندہی میں فرق بھی آتا ہے ۔مثلاً

تحقیقی آئی ۔تحقیق آئی

تحقیقی آئی کہ کوئی کندہ آہے ص (۱۳۳)

تحقیقی نہیں حقیقی ہو سکتا ہے ۔اور اس مصرع میں تمام مرہٹی الفاظ ہیں ۔

حقیقی ماں کے خاندان کا کوئی ہے

آئی ۔ماں کوئی ۔کوئی،کندہ ۔خاندان، اہے ۔ہے مرہٹی

دکھنی میں کچھ مادے خاص طور پر استعمال ہوتے ہیں

سپڑ سپڑانا

پلانا پکارنا

قدیم عربی اور سنسکرت کے لغات مادوں کے لحاظ سے مرتب ہوتے ہیں جن سے تحقیقی اور علمی کاموں میں مدد ملتی ہے ۔لیکن دکنی اردو لغت میں قواعدی صراحت نہیں دی گئی ہے ۔جہاں جہاں اسماء جمع ہیں وہاں واحد کی صراحت کر دی گئی ہے ۔

عربی میں تذکیر و تانیث کا قاعدہ کچھ تبدیل ہوجاتا ہے۔ عربی میں "ت" تانیث پڑھی جاتی ہے جب کہ دکنی میں ت کے اسما کو مذکر بولا اور پڑھا جاتا ہے۔

دکن میں عربی، فارسی، اور سنسکرت کے الفاظ کو جسطرح پڑھا جاتا تھا یا بولا جاتا تھا، املا بھی اسی طرح لکھا جاتا تھا۔ لیکن معیاری دکنی میں اسکا املا الگ ہو گیا ہے۔ مثلاً

چھیل ۔ چھپیڑا ۔ چھیل چھبیلا ۔ شوخ ۔ مرہٹی

دواوَم ۔ دارم ۔ انار تلنگی

سبد ۔ شبد ۔ لفظ سنسکرت

سنتاپ ۔ ستاپ ۔ شدید گرمی سنسکرت

افتارنا ۔ افطارنا ۔ افطار کرانا عربی

اگت ۔ اگتیہ ۔ سواگت مرہٹی

عام طور سے لغت میں ایک مستند لفظ کو معیاری حیثیت دے کر اسکے تمام اختلافات املا اور تلفظ کو واضح کیا جاتا ہے۔ اگر لفظ اور املا میں اختلاف ہو تو ہم معنی الفاظ سے تشریح کی جاتی ہے۔ دکنی اردو لغت میں ایسے الفاظ جو ہم معنی ہیں ان کے املا اور صوتی تغیرات کو علحدہ علحدہ درج کیا گیا ہے۔

لغت کی ترتیب کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یعنی زیر کو زبر اور پیش پر تقدم ہونا چاہیئے۔ اسکے سوا حرف کی ترتیب میں ان مندرجہ بالا اعراب اور یائے معروف اور یائے مجہول کا بھی خاص خیال رکھنا چاہیئے

مِلک ۔ مَلک ۔ مُلک

ان الفاظ میں حروف اول کے تلفظ بالکل الگ ہیں۔ زیر زبر اور پیش کی ترتیب میں بھی فرق ہے۔ مثلاً

سباس ۔ سبجو ۔ سبد ۔ سبز

یائے معروف (ی) کو یائے مجہول (ے) سے پہلے ترتیب دینا چاہئے۔ لیکن ترتیب میں صحیح درجہ بندی نہیں ہے۔ مثلاً

کسے، کسی سے پہلے آیا ہے۔

زبان کسی قوم، تہذیب، معاشرت اور تاریخ کی عکاس ہوتی ہے۔ کسی زبان کے مطالعہ سے اس قوم کی تہذیبی نشو و نما اور تاریخ و تمدن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ تہذیب و تمدن میں روز مرہ کے الفاظ اور محاورے کا بڑا اثر رہتا ہے۔ ضرب الامثال اور محاورے تہذیب و تمدن کی تبدیلی کے ساتھ بدل جاتے ہیں یا متروک ہو جاتے ہیں لیکن ان کے مطالعہ سے قدیم تاریخی تہذیبی پس منظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ تاریخ تہذیب کی تجربہ گاہ ہے۔ (History is the laboratory of civics)۔ دکنی اردو لغت میں بہت سے محاورے اور ضرب الامثال شامل ہیں۔ لیکن ان کی صراحت کی گئی ہے اور نہ مطلب واضح کیا گیا ہے۔ محاور کے معنی، محاورے میں دیئے گئے ہیں۔ تشریح نہیں ہے۔ ایک اچھی لغت میں محاورے اور ضرب الامثال شامل رہتے ہیں لیکن اسکی تشریح مختلف زاویوں سے کی جاتی ہے یہاں اس قسم کی تشریح نہیں ہے۔ مثلاً

آیاں بایاں کرنا۔ آئیں بائیں شائیں کرنا ص (۵۸)

دکھ اڑا دینا۔ دکھ بھول جانا ص (۱۹۷)

کلا کھا جانا۔ گلا بازی کرنا ص (۲۸۳)

بعض محاورے اور ضرب الامثال ایسے دیے گئے ہیں جن کے معنی بالکل مختلف ہیں، جبکہ ان میں بہت سے آج بھی دکن کے دیہی علاقوں میں اور بول چال کے ماحول میں مستعمل ہیں۔

ہات رکھنا۔ ہاتھ روکنا ص (۳۶۸) کے معنی میں دیا ہے جبکہ ضرب المثل وسیع المعنی ہے۔

ہاتھ رکھ کر بات کرنا (احتیاط)   ۔اسکو ہاتھ تو رکھدو

شفقت کا ہاتھ رکھنا   سرپرستی کرنا کرنا وغیرہ

حرکت دینا۔ پریشان کرنا۔ نقصان پہنچانا۔ تکلیف دیناص (۸۳)

حرکت دینا آگاہ کرنے کے محاورے میں استعمال ہوتا ہے۔ کسی کو عمل کی طرف راغب کرنا بعض جگہ دو محاوروں کو یا ضرب المثل کو ایک جگہ کر دیا۔ مثلاً

دریں تیرا آنکھ میں کنکرا۔ یہ ضرب المثل ہے جو دو محاوروں سے بنی ہے۔

دریں تیرا ایک آنکھ میں کنکرادو

کئی ایک مرکب الفاظ بھی اس لغت میں شامل ہیں۔ دکنی اردو لغت کے بعد میسور میں سید ابو تراب خطائی نے مارچ ۱۹۷۰ء میں ایک دکنی اردو لغت تیار کیا تھا۔ اس لغت میں ذخیرہ الفاظ دکنی اردو لغت سے کم ہے۔ تلفظ صحیح لکھا گیا ہے اور تمام الفاظ پر اعراب لگائے گئے ہیں۔ حرف تہجی کی ترتیب میں ذ اور ظ کے الفاظ نہیں ملتے۔ دکنی میں ذ، ز، ض کی تخصیص نہیں ملتی۔ اس لغت کے آخر میں ضرب الامثال اور ایسے محاروں کی علاحدہ فہرست ہے جو عورتوں کے مروجہ محاروں پر مشتمل ہے اس لغت میں اسناد نہیں ملتے۔ لیکن لغت کی ترتیب میں احتیاط برتی گئی ہے مثلاً قواعد کی توضیحات ضرب الامثال کی ترتیب خواتین کے محاورے، تلفظ کی تشریح وغیرہ لغت نویسی دستوار رکن عمل ہے اس کے لیے مرتب کو کئی ایک تجربات سے گزرنا پڑتا ہے انگریزی لغات کی ترتیب بہتر اور جامع ہوتی ہے جسکا ایک خاص سبب یہ ہے کہ مخصوص پراجکٹ اور بے دریغ رقم کی فراہمی سے لغات کا کام جامع انداز میں انجام پاسکتا ہے۔ اردو لغات کیلئے محدود سرمایہ اور بے ضابطہ تقسیم کار کی وجہہ سے لغت میں خامیاں رہ جاتی ہیں۔ اس تعلق سے مسعود صاحب لکھتے ہیں

"لغت نویسی ایک تاب شکن فن ہے اور ایک مرتبہ اس میں داخل ہوجانے کے بعد انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ اس کا مولف شیر کے منھ

میں اپنا ہاتھ دیتا ہے۔ تحسین سے کم اور تعریف سے زیادہ سابقہ پڑتا ہے۔........... لغت کی تالیف کے لئے طویل مدت اور کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کام عجلت میں نہیں کیا جاسکتا۔" (۹)

مسعود صاحب نے ممکنہ حد تک اس لغت میں دکنی اردو کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصنیفات سے الفاظ کو ترتیب دیا ہے۔ یہ اس موضوع پر ایک ابتدائی لغت ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسعود صاحب نے اس کی ترتب کا کام اس وقت کیم تھا جبکہ اس کا کوئی واضح نمونہ ان کے سامنے نہ تھا۔ پھر بھی یہ لغت طائر پیش رس ہے جو آنے والے زمانے میں لغت نویسوں کو سمت و راہ دکھلائے گی۔

دکنی اردو لغت کی ترتیب کے سلسلے میں ضروری ہے کہ لغت فرہنگ کے فرق کو بھی واضح کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں راقم نے چند خاص ادبی شخصیتوں سے استفسار کیا۔ ابتدا اس کی مسعود صاحب ہی سے کی گئی۔ ان کا جواب یہ تھا۔

"لغت اور فرہنگ میں طول اور اختصار کی کوئی تخصیص نہیں۔ مثلاً فرہنگ آصفیہ (مختصر نہیں) اسطرح بہت سی جیبی لغات ہیں اسلئے فرہنگ آصفیہ بھی صحیح ہے اور فرہنگ انیس بھی۔" (۱۰)

اس جواب کی روشنی میں جب اشرف رفیع صاحبہ سے تشریح کی درخواست کی تو انھوں نے واضح کیا کہ فرہنگ اور لغات دو علحدہ چیزیں ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

"لغت (Dictionery) ایک خاص موضوع ہے جسکا دائرہ وسیع ہے۔ لغت میں الفاظ کے معنی مترادفات تفصیل سے دیے جاتے ہیں اور ان لغتوں کو قواعد کی روشنی میں واضح کرتے ہوے لفظ کی تشریح کی جاتی ہے۔ فرہنگ کا دائرہ محدود ہوتا ہے وہ یا تو کسی خاص موضوع سے متعلق ہوتی ہے یا کسی مخصوص کتاب کے مشکل الفاظ پر مبنی ہوتی ہے۔ چنانچہ کتابوں کے آخر میں جن مشکل الفاظ کے معنی

دئے جاتے ہیں اس کا نام "فرہنگ" ہوتا ہے لغت میں فرہنگ آصفیہ کا جہاں تک سوال ہے مرتب نے آصفی دور میں انکساری اور آداب شاہی کی خاطر بجائے لغت کے فرہنگ نام دیا ہے۔" (۱۱)

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کا بھی یہی استدلال ہے:

"لغت ایک وسیع موضوع ہے جسمیں بول چال کے الفاظ اور زبان کے تمام الفاظ کو شامل کیاجاتا ہے جبکہ فرہنگ میں صرف موضوع کے اعتبار سے معنی دیے جاتے ہیں۔" (۱۲)

ان تشریحات کو مسعود صاحب کے سامنے رکھنے کے باوجود وہ یہی کہتے ہیں کہ لغت اور فرہنگ مترادفات ہیں۔ مولوی عبدالحق نے مغربی لغت نویسی کے اصولوں کی تشریح کرتے ہوئے واضح کیاتھا:۔

"ڈکشنری الفاظ کی تشریح ہوتی ہے۔انسائیکلوپیڈیا میں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ اشیا کس زبان سے لئے گئے ہیں۔ڈکشنری میں الفاظ کی اصل اور اسکے مفہوم مختلف استعمالات اور اس کے تمام اجزا سے بحث ہوتی ہے۔" (۱۳)

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں اور چند لغات کے پیش نظر اب بھی یہ مسئلہ واضح نہیں ہوسکا۔ لغات نویسوں کی مستند رائے کی ضرورت ہے کیونکہ فرہنگ آصفیہ فرہنگ نہیں لغت ہے اور جمیل جالبی کی "قدیم اردو لغت" لغت نہیں کہلاسکتی ماہرین لسانیات کے لئے یہ ایک تحقیق طلب سوال ہے۔"

==== ○ ○ ○ ====

لغت نگاری

۱۔ مسعود حسین خاں۔ اردو لغت نویسی کے مسائل (مشمولہ مقالات مسعود)۔ ص ۱۸۳
۲۔ خوان یغما کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں ہے۔
۳۔ وارث سرہندی۔ کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ پاکستان۔ ص ۴۰
۴۔ دیوی سنگھ چوہان۔ نوائے ادب۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء۔ ص ۷۵
۵۔ پروفیسر اشرف رفیع۔ نذر مسعود۔ ص ۳۷۴
۶۔ پروفیسر اشرف رفیع۔ نذر مسعود۔ ص ۳۸۱
۷۔ دیوی سنگھ چوہان۔ نوائے ادب۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء۔ ص ۷۳
۸۔ سری رام شرما۔ دکنی زبان کا آغاز و ارتقا۔ ص ۳۰۲
۹۔ مسعود حسین خاں۔ ورود مسعود۔ ص ۳۸۳
۱۰۔ مسعود حسین خاں۔ مراسلہ۔ مورخہ ۲۵/ ستمبر ۱۹۹۱ء
۱۱۔ انٹرویو۔ پروفیسر اشرف رفیع صاحبہ۔ ۴/ اکتوبر ۱۹۹۱ء
۱۲۔ انٹرویو۔ مرزا خلیل احمد بیگ۔ مورخہ ۱۹/ دسمبر ۱۹۹۱ء۔ بمقام علی گڑھ
۱۳۔ عبدالحق، مولوی "لغت کبیر"۔ مقدمہ ص ۵۲

دو نیم

مسعود حسین خاں ادیب، نقاد، محقق، ماہر لسانیات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ اچھا ادیب شاعر بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی شعر کہے ہیں۔ شاعری ان کے لئے "ذریعہ نجات رہی۔" شعر اس وقت ہی پھوٹتا ہے جبکہ جذبات و احساسات امنڈ آتے ہیں۔

"شاعرانہ شخصیت اپنے معاشرتی ماحول میں بے ہمہ اور باہمہ ہو کر اسی طرح مگن رہتی ہے جیسے ہمارا معاشرتی دائرہ کائنات کے طبعی ماحول میں............ شعری عمل اس وقت تک پرکار نہیں بنتا جب تک کہ اس میں کشاکش انفرادیت کا پرتو نہ ہو۔" (۱)

مسعود صاحب اچھے ناقد ہیں انھوں نے اپنے مجموعہ کلام "دو نیم" میں تمہید شعر کے عنوان سے شاعری اور شاعر کی خصوصیات پر تنقیدی مقدمہ لکھا ہے۔ اور ان کی شاعری انھیں حدود کے ارد گرد گھومتی ہے۔ "دو نیم" ان کا تخلیقی کارنامہ ہے۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۶ء میں عمل میں لایا گیا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۶ء میں طبع ثانی کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا گیا۔ یہ شعری مجموعہ (۲۰۸) صفحات پر مشتمل ہے اسکی طباعت ایم۔ اے پرنٹرس دہلی کی جانب سے عمل میں آئی۔ اس میں (۱۹) نظمیں (۴۵) غزلیں اور (۲۲) گیت شامل ہیں۔

شاعری مسعود صاحب کی نظر میں راہ نجات ہے لکھتے ہیں:

"میں نے شاعری کو راہ نجات کے علاوہ ہمیشہ ایک لسانیاتی عمل سمجھا شاعر کی پیغمبری کا میں قائل نہیں۔ شعر اگر ابہام ہے تو کل زبان ایک معجزہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زبان کا تحقیقی اور جذباتی

استعمال ذہن انسانی کی فتوحات میں سے ہے۔" (۲)

مسعود صاحب نے پہلا شعر ۱۹۳۲ء میں کشمیر میں قیام کے دوران کہا تھا وہ یہ ہے:

نہیں نہیں جاتے تم اس طرف کو مگر
قدم قدم پہ یہ لرزہ قدم کا کیسا ہے

پہلی نظم ، ماہ تمام ہے یہ نظم ۱۹۴۵ء میں اسوقت لکھی گئی جبکہ مسعود صاحب نے میدان عشق میں پہلی ٹھوکر کھائی تھی اس وقت وہ علی گڑھ میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کر رہے تھے اس نظم کا آخری شعر یہ ہے۔

کر دے یہ عیش بھی تو مجھ پہ حرام
نور کی ایک کرن ماہ تمام

مسعود صاحب کی شعر گوئی کی طرف زیادہ توجہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے ملتی ہے۔ اس دور میں انھوں نے نظمیں بھی لکھیں اور گیت بھی۔ ان کی شاعری میں گہرائی اور وسعت نظر پیدا ہونے لگی تھی۔ اپنے تجربات کو اور اپنی زندگی کی کیفیات کو شاعری کے قالب میں ڈھالنے لگے تھے۔ چنانچہ مختلف النوع نظموں میں انہوں نے فکر و خیال کے پیکر تراشے ہیں۔ ان کی شاعری میں سماجی و سیاسی عناصر بھی ملتے ہیں۔ انھوں نے اسی مکتب میں شاعری کی ہے جس سے وہ گزر رہے ہیں، یا تخیل اور ذہن کا سفر اس راہ سے ہوا ہو۔ خیالی وسوسوں کو شعر کا روپ نہیں دیا۔ جن حالات سے متاثر ہوئے اسکی عکاسی اشعار میں کی ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات مختلف ہیں۔ شخصی واقعات۔ بیٹے کی پیدائش۔ حب الوطنیت، شخصی مرثیے اور مناظر قدرت وغیرہ۔

نظم "جمال" بقول مسعود حسین خاں، ان کی بیگم نجمہ کی خدمت میں خراج محبت کا پہلا نذرانہ ہے۔ یہ نظم علیگڑھ میگزین ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کو خود نوشت "ورود مسعود" میں مکمل شائع کیا گیا ہے۔ ابتدائی نظم میں ایک شعر نہیں

ہے ۔جبکہ " دو نیم " کے دوسرے ایڈیشن میں اور ورود مسعود میں ایک شعر اضافہ کیا گیا ہے۔

وہ نرم نیپے سے کندن بدن کی رنگ ترنگ
بنی ہوئی سی وہ کرنیں لباس زیبا میں

علی گڑھ میگزین میں اسی نظم کا ایک شعر یوں ہے۔

بتا میں تجھ سے کہوں کیا بجز وہ شوق کی بات
کہ ڈال رکھا ہے جس کو جوار معنی میں

لیکن دو نیم کے دوسرے ایڈیشن میں ایک لفظ کی تبدیلی یوں کردی گئی ہے

بتا میں تجھ سے کہوں کیا مگر وہ شوق کی بات
کہ ڈال رکھا ہے جس کو جوار معنی میں

اس شعر میں بجز کے بجائے " مگر " کا استعمال شعر میں ایک تیکھا پن پیدا کر دیتا ہے " بجز " وہ کیفیت پیدا نہ کرے جو کیفیت " مگر " نے پیدا کر دی ۔آزادی کے بعد کا جو ماحول تھا اس کا اظہار مسعود صاحب نے اسطرح کیا ہے:

کوئی بھی رونق محفل کو دیکھ سکتا ہے
تمھیں بتاؤ جب آنکھوں میں اس قدر تم ہو
دیار ہند سے جاتے ہوئے بتان فرنگ
وہ داغ دے گئے جس کا نہ کوئی مرہم ہو

بقول شاعر کے عملی سیاست سے دور ایک حساس دل انسان اپنے طور پر کوائف وطن کو اس طرح محسوس کر رہا تھا۔

آزادی آئی مگر خون میں نہائی ہوئی (۳)

نظم " اشعر " پروفیسر عمر الدین صاحب اور نجیب اشرف ندوی صاحب کی وفات پر بطور خراج عقیدت جو نظمیں لکھی ہیں وہ پوشیدہ جذبات کی عکاسی کرتی ہیں ۔ مسعود صاحب

نے اپنے غم کا اظہار آنسوؤں سے نہیں بلکہ اشعار کی شکل میں کیا ہے۔

اشعر ملیح آبادی، مسعود صاحب کے عزیز شاگرد اور دوست تھے۔ ان کی موت پر یوں اظہار غم کیا ہے

اشعر کی موت ایک گلِ تر کی موت ہے
چشم صدف میں یا کسی گوہر کی موت ہے

بزرگ دوست پروفیسر عمر الدین مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں صدر شعبۂ فلسفہ تھے ان سے مسعود صاحب کے گہرے روابط تھے اکثر ان کے مکان پر پنچایتی (۴) کھانے کی محفلیں سجا کرتی تھیں۔ اس مخلص دوست کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

اندھیری رات میں یوں گل ہوا چراغ دوست
حیات اب نہ کبھی پائے گی سراغِ دوست

سید نجیب اشرف ندوی صاحب کی وفات پر جو نظم لکھی ہے وہ ایک مرثیہ ہے۔

حریمِ اردوے بیکس کا پاسباں نہ رہا
ہزار حیف کہ اک پیر نوجواں نہ رہا

زباں روتی ہے، الفاظ سر پٹکتے ہیں
فغاں کہ حرف و معانی کا وہ جہاں نہ رہا

مسعود صاحب کی زندگی کے ہر سفر میں شعر کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ محبت، غم، خوشی مایوسی، سیاسی تبدیلی، قومی مسائل۔ ہر موقع پر اپنے ذہن کی اور احساسات کی ترجمانی شاعری کے ذریعہ کی ہے۔ جذبات اور احساسات کا جو طوفان دل میں اٹھتا ہے شعر اس کے لئے "ذریعہ نجات" بنا رہا۔

۲/ جنوری ۱۹۵۰ء کو ان کے گھر سب سے پہلی اولاد جاوید حسین خاں کا جنم ہوا اس موقع پر نظم "ننھا شاہکار" کہی تھی۔

میرا ننھا سا شاہکار ہے تو
ماں کی آنکھوں میں نو بہار ہے تو

مسعود صاحب حسن پرست واقع ہوے ہیں لیکن نفس زلیخائی سے بہت دور رہے ۔اس کا اظہار شاعری میں ذہنی تصورات کے سہارے کرتے ہیں

کیا بتائیں نگہہ شوق نے کیا پایا ہے
ہم نے لندن میں نگاہوں کو خدا پایا ہے
لب نازک پہ جدھر دیکھیے ہے خونِ گلاب
ناخنِ پا میں چھپا رنگِ حنا پایا ہے (۵)

نظموں کے موضوعات میں تنوع کا سبب یہ ہے کہ مسعود صاحب نے شعر گوئی کے سلسلے میں کبھی کوئی فکری نظام متعین نہیں کیا۔خارجی محرکات سے قطع نظر داخلی محرکات نے ان سے شعر کہلوائے ۔اکثر ٹہلتے اور گنگناتے میں شعر کہے ہیں ۔رات کو سوتے وقت جب شعر کا نزول ہوتا ہے تو وہ کاغذ پر لکھ لیا کرتے ہیں ۔ان خیالات کا اظہار انھوں نے اپنے مضمون "میرا شعری تجربہ" میں کیا ہے ۔لکھتے ہیں:

"میرے پاس فکر کوئی منظم نظام نہیں ۔مار کسی فکر کا شعر متحمل نہیں ہوسکتا ۔زیادہ سے زیادہ پروپگنڈے کی شاعری کیجا سکتی ہے جو ترقی پسندوں نے جی بھر کے کی ہے ۔میں اس قسم کی شاعری سے گریز کرتا ہوں حالانکہ خواب سنگ، وادی رنگ ،ہندی کی یہ شب مہتاب "، "مدینۂ آدم" دیپے جلاؤ ساتھیو" اور "قصیدہ جدید" کے عنوانات ہی سے ظاہر ہے کہ ان کے موضوع خارجی اور سیاسی ہیں ۔" (۶)

مسعود حسین خاں کی شعری کاوشوں میں ان کے گیتوں کا بھی ایک مقام ہے جو دو نیم کے صفحات پر بھرے پڑے ہیں ۔اردو کے بہت کم شاعر اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے ہیں ۔

"گیت اردو شاعری کی ایک ایسی صنف ہیں جن میں داخلیت، موسقیت، عروضی قیود سے آزادی زبان کی سادگی طرز ادا اور موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے جو اردو شاعری کی کسی صنف میں نہیں ملتا......... گیت عوامی شاعری ہے۔ان کی تخلیق، ان کا ارتقاء ان کی آراستگی و پیراستگی عوام کے ہاتھ ہوئی اور ان کی ٹیکنک بھی عوامی ہے۔ اسکا ارتقاء بھی عوام کا رہین منت ہے۔ لہذا گیتوں کی اگر کوئی منطقی تعریف ہو سکتی ہے تو یہ کہ گیت عوامی شاعری ہیں۔ (۷)

اردو گیت عام طور پر رومانی ہوا کرتے ہیں۔شاعروں نے ولولہ خیز جذبات کو گیت میں جگہہ دی ہے۔ گیت میں شاعر سماجی پابندی و قیود سے آزاد رہ کر ایک مثالی دنیا بناتا ہے۔ گیت کار اپنے حرکات و سکنات، اپنی رفتار و گفتار میں مطلق العنانی کی حد تک آزاد رہنا چاہتا ہے۔

"گیتوں کی ہیئت، زبان، مضامین اور لب و لہجہ کا جو تشخص ہمارے ذہنوں میں ہے وہ غزل کے لوازمات اور اس سے وابستہ دوسری چیزوں سے مناسبت نہیں رکھتا۔غزل کے اشعار ردیف و قافیہ کے پابند ہیں لیکن گیت کار ان کی پابندی ضروری نہیں سمجھتا۔اگر کہیں ایسی پابندیاں مل جائیں تو اسے اتفاق سمجھئے۔" (۸)

گیت کے خدوخال کے متعلق قیصر جہاں کا خیال ہے کہ گیت شخصی جذبات اور کیفیات کا مرقع ہوتے ہیں۔وہ گیت کو اردو کی قدیم روایتوں میں سے ایک روایت بتلاتی ہیں۔ لکھتی ہیں:

"گیت شاعری کی اولین صنف ہے۔یہ قدیم دور کے انسان کے بے اختیار اور شدید جذبات کا نمائی اظہار ہے۔ یہ جذبے کی

زبان ہے۔"(۹)

قیصر جہاں نے اردو میں گیت کی روایت کو امیر خسرو کے دور میں تلاش کیا ہے۔گیت کے فروغ میں قومیت کے رومانی تصور اور مغربی شعرا کے تراجم کو خاص دخل ہے۔ترقی پسند تحریک قومیت اور حریت، سطحی جذبات، فطرت سے لگاؤ، اور وابستگی کا رحجان گیت کاروں میں ملتا ہے۔جنھوں نے ان عناصر کو گیت کی شکل میں باندھا۔

دور جدید میں عظمت اللہ خاں نے ہندی چھندوں کو اردو شاعری کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی مگر ناقدین ان بحروں اور اوزان کو بھی عربی عروض کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔بقول مسعود حسین خاں کے عظمت اللہ خاں نے اردو شاعری کے نہ صرف نوک پلک درست کئے بلکہ ہندی پنگل (عروض) سے واقفیت کو انھوں نے اردو شاعری میں سمویا اور نئے عروض کی آزادی کا سنگ بنیاد رکھا۔جدید اردو شاعری میں ہندی چھندوں کا اوزاں اور آہنگ کا استعمال میر، سودا، اور انشا نے بھی کیا تھا۔ان شعرا نے چند خوش آہنگ چھندوں کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا تھا۔

ڈاکٹر سمیع اللہ عظمت اللہ خاں نے ہندی چھندوں کے عروض کے متعلق لکھتے ہیں:

"دراصل عظمت اللہ خاں نے ہندی چھندوں کے اوزان و آہنگ کو تین طرح استعمال کیا ہے۔"(۱۰)

اس بحث سے قطع نظر گیت کی بنیادی خصوصیت عورت کی طرف سے محبت کا والہانہ اظہار ہے اور یہ صفت عورت کے جذبہ آزادی کو فروغ دیتی ہے۔اس میں بالعموم فراق اور ہجر کی تڑپ کو پیش کیا جاتا ہے۔اردو گیت میں اس خصوصیت سے انحراف بھی ملتا ہے۔عظیم الحق لکھتے ہیں:

"گیت اگرچہ بنیادی طور پر عورت کے دل کی پکار ہے لیکن کبھی کبھی اس نے مرد کی طرف سے اظہار محبت کی شکل بھی اختیار کی ہے

مرد کی طرف سے کہے ہوئے گیتوں میں بھی نسوانیت کا لہجہ اور سراپا نگاری ملتی ہے۔" (۱۱)

چنانچہ مسعود صاحب کے گیتوں میں بھی ہمیں دونوں رخ ملتے ہیں۔ لیکن عورت کی طرف سے اظہار محبت کو انھوں نے چند ہی گیتوں تک محدود رکھا ہے۔ زیادہ تر اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ ان گیتوں میں باطنی جذبات کی نغماتی اور رقص کرتی ہوئی تصویریں ملتی ہیں۔

"یہ جذبہ محبوب کے لمس سے پیدا ہوتا ہے اور درد و کسک فراق سے پیدا ہوتی ہے۔" (۱۲)

یہی کیفیت مسعود صاحب کے اس دور کے گیتوں میں سموئے ہوئے ملتی ہیں۔

یاد کی لہروں پر تم آؤ
سوچ میں آنکھ ہے آنکھ میں ہے من
من کی سوچ بنے جب الجھن
اس دم ان آنکھوں میں چھپ کر
تم آنسو بن کر شرماؤ
یاد کی لہروں پر تم آؤ

دل کسی چیز کا متلاشی ضرور تھا۔ بے نام کی ہی جستجو تھی اسے۔ جب اظہار کا حسین موقع مل سکا تو پرواز تخیل کے ذریعہ شعر کی دنیا میں وہ غرق ہو گیا۔ (۱۳)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"شاعری کی دیوی نے گدگدانا شروع کر دیا تھا......... اچانک معلوم ہوا سینے میں دل گداختہ پیدا ہو چکا ہے۔ محبت اور پریم ایک لامحدود عمل کا تسلسل معلوم ہونے لگا۔" (۱۴)

چنانچہ اپریل ۱۹۴۲ء میں انھوں نے پہلا گیت لکھا۔

یہ کیا کہتے ہو تم پریتم

ختم ہوئی وہ بات

پھول کے کان میں جو بھونرے نے

گن گن کر کے گائی

منھ سے کہہ نہ سکی جو تم سے

آنکھوں نے بتلائی

ابتدائی گیتوں میں:۔

(۱)۔میں کیسے آنکھ اٹھاؤں (۲)۔موج کا گیت (۳)۔آج تو شاید وہ آجائے

(۴) آج سہی انکار (۵)۔غلاموں کا ناچ۔ہیں

ان کے بعد کے گیت ۴۴۔۱۹۴۵ء کی یادگار ہیں جن میں

(۱)۔پریم کے ہاتھوں میں بک جاؤں (۲)۔بھاگ گئیں جو میری خوشیاں (۳) کیوں سج دھج کر آؤں۔

(۴)۔رنگ دونا، جیون کے کچھ پل (۵)۔آج دوپہر (۶)۔مورکھ اس کو کیسے پائے

(۷)۔جیون پتھ پر (۸)۔اب ہوجائے سویرا (۹)۔کئے تھے بند تم نے بھی دوار

(۱۰)۔جاؤ ستارو جاؤ (۱۱)۔یاد کی لہروں پر تم آؤ (۱۲)۔اس بھیڑ میں کیسے درشن ہو؟

(۱۳)۔باپو (۱۴)۔سندرتا کے ساگر سے بھر لائے بس کی گاگر

ان گیتوں میں عشق کی محرومیوں کی داستان۔محبوبہ کی انکار کے بول۔ایک لڑکی کے آگے محبوب کی بے اعتنائی کا رونا۔ان سب کو ظاہر کیا گیا ہے اور ایک گیت قومیت کی عکاسی کرتا ہے۔

"آج سہی انکار" گیت میں شاعر اپنے محبوب سے انکار سننے کے لئے بھی بے چین نظر آتا ہے

راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں:

"آج سہی انکار" میں شاعر انکار کیلئے ہی سہی اپنی محبوبہ کے بول سننا چاہتا ہے بند لبوں کے لال دوار کو کھلوانا چاہتا ہے ۔ مکھ کی بس جھنکار سے اپنی ناآسودہ کانوں کی آسودگی چاہتا ہے ۔" (۱۵)

اگست ۱۹۴۲ء کی ہندوستان "چھوڑدو تحریک" کا اثر مسعود صاحب پر بہت گہرا ہوا ۔یہی تاثرات انھوں نے اپنے ایک گیت "غلاموں کا ناچ" میں پیش کیا ہے جس میں ادبی، شعری، اور فنی گہرائیاں ملتی ہیں ۔یہ گیت ٹھیٹھ کھڑی زبان میں ملتے ہیں ۔ اس گیت کے ہر بند میں جذبات اور ولولے کا احساس ہوتا ہے

کھی کھی کھی

میرے اندر

آج ہنسی پھر ماتا کالی

سات پیاسیں جاگ اٹھی ہیں

....

روک سکیں گی یہ زنجیریں

یہ تو دیں گی تالی

ناچو ناچو ساتوں ناچو ۔

....

اک چکریں

اس میدا سے

ہندوستا سے

بچ کے نا جاتے کوئی

کھی کھی کھی کھی کھی ۔(۱۶)

اس کے بعد سے ۴۴ء تا ۴۷ء کے درمیان (۱۷) گیت ملتے ہیں جن میں جمالیاتی

احساس ، لسانیاتی شعور، مغربی ہندی بولیوں اور تہذیب کا عکس، لطیف جذبات...

سب ہی کچھ ملتا۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ان گیتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

" اپنے وقت کے گیت نگاروں میں مسعود صاحب کو خاصی مرتبت حاصل رہی ہے۔ پریم کی ریت ان کے گیتوں میں جادواں اور پیہم رواں دواں ملتی ہے۔ وہ تمام تر باریکیوں، لطیف جذبات، اور کومل احساسات کو ان گیتوں میں غیر معمولی نزاکت خوبی، خوش آہنگی کے ساتھ سمو دیتے ہیں۔" (۱۷)

۱۹۴۷ء کے سیاسی انتشار کے عالم میں جبکہ ہندوستان میں ہر شے " دو نیم " تھی تقسیم ہند ایک جغرافیائی تقسیم نہیں تھی بلکہ ایک تہذیب اور تاریخ کے دو ٹکڑے ہو رہے تھے۔ سیاست دو حصوں میں اپنا اثر دکھا رہی تھی ایسے میں مسعود صاحب نے ٹیگور اور اقبال کے فلسفہ کی بنیاد پر ایک خوبصورت گیت " روپ بنگال " لکھا۔ اس روپک کے متعلق " دو نیم " کے دوسرے ایڈیشن میں مسعود صاحب لکھتے ہیں:

" ایک تو ٹیگور کی بیخودی کا ویدانتی تصور اور دوسرا اقبال کا اثبات ذات کا فلسفہ خودی اس روپک میں افعانی جو حیات و حرکت کا پیکر ہے اقبال کی فکر کا ترجمان ہے، بنگالی لڑکی، منجل ٹیگور کی ویدانتی فکر کی نمائندہ ہے۔ بنگال کے مختلف مناظر میں یہ ساتھ ساتھ گھومتے ہیں اور مصروف گفتگو نظر آتے ہیں۔" (۱۸)

پریم کی لہری، کرم کی بیری
جیسے ایک بھرن ساون کی
منجل ہنس کر یوں بولی
میرے گیانی کوہستانی

دیکھو شام کا لٹتا سہاگ!

تم کہتے ہو گے نہ اٹھے گا اسکی چتا سے ایک بھی راگ

آہ سنو جیون کا سنگیت ہے جلنا۔" (۱۹)

اسکے ساتھ بنگال کے مختلف مناظر شاعر کی منظر نگاری اور بلند تخیل کی نمائندگی کرتے ہیں۔

افغانی۔ندیا!

بہنا دھیرے دھیرے

منجل جائے گی پار

ایک کنول کے پھول سی کشتی

کتنی تیز ہے دھارا

لیکن میں ہوں ناؤ کا مانجھی

میرا اشارہ رکے گا دھارا

ایں! منجل تم روتی کیوں ہو

میں ہوں تمھارے ساتھ

کوہستانی پتلا عمل کا

منجل، چھوڑو میرا ہاتھ

تم روکو گے اس دھارے کو، کیا بات!

پریم سے ڈوب رہا ہے یہ من

لادو مجھ کو بھنور کے کنگن

بات کی تہہ تک تم پہنچو گے

ڈھونڈھتے ہو ہر بات میں تھاوہ (۲۰)

[۱۵] صفحات کے اس روپک میں مسعود صاحب نے پریم کی ریت کو بڑے

لطیف جذبات و احساسات کے ساتھ غیر معمولی جدت سے پیش کیا ہے۔ کئی لحاظ سے یہ روپک اردو میں ایک منفرد تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے اور ناقدین کی توجہ کا طالب ہے۔ بقول راج بہادر گوڑ کے:

"یہاں ہجر و وصال کے فاصلے ختم ہو جاتے ہیں۔ لذت وصل اور غم ہجر کی سرحدیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ جس منزل پر پہنچ کر بقول فراق گورکھپوری عشق شعور تحت الشعور اور لاشعور کے درمیان ربط بن جاتا ہے۔" (۲۱)

ماحصل یہ ہے کہ مسعود حسین خاں نے عظمت اللہ خاں کے نظریہ ہندی عروض کو اپنے گیت کا مرکز بنایا ہے کیونکہ مسعود صاحب کا کہنا ہے کہ گیت کی بڑی پہچان اسکی زبان ہوتی ہے جس میں گلی کوچہ کا روز مرہ ہو۔ سرسید احمد خاں نے جو ٹھیٹھ اردو کا ڈول ڈالا تھا عظمت اللہ خاں کے گیتوں میں بھی وہی رنگ غالب ہے۔ مسعود صاحب کے گیتوں میں ہندی چھندوں اور آہنگ کے استعمال نے درد و کسک کی بھینی سی لہر دوڑائی ہے۔

مسعود صاحب کے انھیں گیتوں کے تعلق سے اردو گیت پر تحقیق کرنے والی ڈاکٹر قیصر جہاں اپنی کتاب میں یوں تبصرہ کرتی ہیں:

"ہندی کے مشہور گیت کار جے شنکر پرشاد اور مہادیوی ورما سے متاثر ہونے کی وجہ سے مسعود حسین خاں کے گیتوں کا لہجہ رہسیہ وادی اور چھایا وادی ہے۔" (۲۲)

اردو اصناف میں کھڑی بولی کے علاوہ دوسرے لہجاتی اور تحتانوی زبانوں کی نشاندہی نہیں ملتی لیکن گیت میں ان بولیوں کے اسماء، صفات، ضمائر اور افعال کی مروجہ صورتوں سے صرف کھڑی بولی کے اسماء صفات، ضمائر اور افعال ملتے ہیں۔ مسعود صاحب اپنے وقت کے گیت کاروں میں خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے

لسانیاتی شعور کے ساتھ ہندی کھڑی بولی اور مغربی ہندی کے دیگر بولیوں اور گیت کی تہذیب سے آگاہی کو اپنے گیت میں شامل کر کے ان گیتوں کے رنگ کو نکھارا ہے۔

لیکن پروفیسر ڈاکٹر بیگم بسم اللہ اردو میں لکھے جانے والے گیتوں سے مطمئن نہیں۔ان کے نظریات کا حوالہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔ لکھتی ہیں:

"یہ بات تسلیم کر لینی چاہئے کہ گذشتہ چالیس پینتالیس سال کے عرصہ میں اردو کے نوجواں شاعروں نے گیت تصنیف کرنے شروع کئے ہیں۔خواہ مروجہ اردو شاعری سے بغاوت کی وجہ سے ایسا کیا ہو یا اسکی فرسودگی اور پامالی سے اکتا جانے کی وجہ سے اور خواہ محض ایک نئے تجربے کی خاطر۔...... ان نوجواں شاعروں کی ان نئی تصنیفوں نے یہ بات ضرور واضح کر دی ہے کہ ان کے گیت حقیقی گیت کہلانے کے مستحق نہیں کیونکہ وہ خواص کے گیت ہیں۔عوام کے گیت اور ہوتے ہیں۔" (۲۳)

اس زمرہ میں مسعود حسین خاں کے گیت بھی آتے ہیں تاہم اتنی بات تو ڈاکٹر بیگم بسم اللہ بھی تسلیم کرتی ہیں کہ ایسے گیت جنھیں وہ حقیقی گیت تسلیم نہیں کرتیں انھیں "خواص کے گیت" کا عنوان دیتی ہیں۔چلئے یوں ہی سہی۔پھر بھی یہ ضروری ہے نہیں کہ بیگم بسم اللہ کے نظریہ سے مکمل اتفاق کیا جائے

گیت اور نظم کے ساتھ مسعود صاحب نے غزل کو بھی اپنا موضوع سخن بنایا ہے ان کی غزلوں کی تعداد نظموں سے زیادہ ہی ہے غزل کے متعلق لکھتے ہیں:

کہ جس سے ہلکا ہو جی ایک غزل ہی کہہ لائیں

ان کی غزلوں میں کچھ کھو دینے کا احساس، عشق کا اضطراب، افسردگی، نشاط و غم سب کچھ ہے۔غزل کے اشعار میں انھوں نے صاف ستھرے اور شستہ خیالات کو سمویا ہے۔مسعود صاحب غزل کے متعلق سے لکھتے ہیں:

"دراصل غزل بنیادی طور پر ایک ہئیت شعری کا نام ہے۔ہئیت کے اعتبار سے اس کا سانچہ متعین ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے یہ حسن و عشق کی قید و بند کو بہت پیچھے چھوڑ چکی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔غزل ایک پیمانہ ہے جس میں جس طرح کی کشید دل چاہئے بھر دیجئے۔ اقبال نے منتخب غزلیں لکھی ہیں جس کے پس منظر میں ایک فلسفہ خودی کی، بعد الطبیات" (۲۴)

مسعود صاحب کی غزلوں میں غم عشق بھی ہے غم دوراں بھی ہے۔رنگ تغزل بھی ہے۔ان کے شعری جذبات میں بھی بدلتے دور کا آہنگ ملتا ہے۔ عشق مجازی، عشق حقیقی میں معدوم ہوجاتا ہے۔

کبھی یہ غم ہے کہ ملنا تیرا قیامت ہے
کبھی یہ فکر کہ مل کر وبال کیا ہوگا

ترے خیال میں دل آج سوگوار سا ہے
مجھے گمان ہے اسکو کچھ انتظار سا ہے

جہاں بھی دیکھا وہیں پایا تجکو جان وصال
تیری نگاہ کا پرتو کہاں کہاں نہ ملا

غم دوراں اور تغزل کے بعد مسعود صاحب کے یہاں غم جاناں کا جو تصور ہے وہ بھی اچھوتا ہے

خدا کرے کہ ترا غم دراز ہوجائے
غم حیات سے کیوں ساز باز ہوجائے

اس نظریہ کے متعلق ڈاکٹر راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں

"ڈاکٹر صاحب تو غم جاناں کو دراز کرنے کیلئے غم حیات سے ساز باز کرنا چاہتے ہیں۔یہ بدلے ہوئے دور کے بدلے ہوئے تیور

ہیں۔" (۲۵)

مسعود صاحب کی شاعری کرہ ارض پر بسنے والے انسانوں کے احساسات و جذبات کا مرکز ہے۔ جس میں اس دور کی دوئی یا دو نیم کیفیات کا اظہار کرتی ہے جس کا پرتو ہر ہندوستانی پر تھا۔

سلیمان اطہر جاوید نے مسعود صاحب کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوے اسطرح اظہار خیال کیا ہے۔

> "ان کی شاعری کے بارے مں یہی کہا جاسکتا ہے کہ فن پر ان کو بے اندازہ عبور ہے زبان کی نوک پلک سنوارنے کا ہنر وہ جانتے ہیں۔ اسلوب پر قابو ہے۔ اردو شعر و ادب کی روایت اور اقدار سے ان کو حسی آگہی حاصل ہے جو اس دور کے بہت کم اصحاب کو حاصل ہو گی۔ نیز انکا شعری ذوق مہذب اور سجا سجایا ہے۔ (۲۶)

مسعود صاحب نے اپنی نثر نگاری کے مقابل میں اپنی شاعری کو زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ چنانچہ ایک عرصہ تک شعر کہنے کے بعد مسعود صاحب کی شاعری میں وقفہ آتا ہے۔ اس کا سبب انھوں نے لسانی تحقیق کو بتایا ہے کیونکہ یہ موضوع جذبہ، تخیل کی دنیا سے پرے عقل و استدلال اور منطقی فکر پر مبنی ہوتا ہے۔ لہذا وہ بھی خواب و خیال کی دنیا سے دور رہنے لگے۔ "دو نیم" کے پہلے مجموعہ کی اشاعت ۱۹۵۶ء میں ہوئی۔ اس کے بعد سے ان کا سرمایہ، شعر و شاعری بہت ہی مختصر یعنی برائے نام ہے جس میں پانچ غزلیں اور چار مختصر نظمیں شامل ہیں۔ یہ اضافہ دوسرے ایڈیشن میں کیا گیا ہے۔ ایک نظم جس کو انھوں نے قیام امریکہ کے دوران معین احسن جذبی کی نظم "وبائے تحقیق" کے جواب میں اسی بحر اور قافیہ میں لکھی تھی وہ اس ایڈیشن میں شامل نہ ہو سکی۔ اب مسعود حسین خاں کی زیادہ تر توجہ سخنوری کے بجائے سخن فہمی پر ہے۔ "انتخاب کلام غالب" اس کا ثبوت ہے جو حال میں مرتب کیا گیا ہے۔

دو نیم

۱۔ مسعود حسین خاں۔ دو نیم۔ ص ۱
۲۔ مسعود حسین خاں۔ دو نیم۔ ص ۹
۳۔ مسعود حسین خاں۔ ورود مسعود۔ ص ۱۲۴
۴۔ باٹ نک
۵۔ مسعود حسین خاں۔ دو نیم۔ ص ۱۱۸
۶۔ مسعود حسین خاں۔ مقالات مسعود۔ ص ۱۷۶
۷۔ بیگم بسم اللہ نیاز احمد۔ اردو گیت۔ ص ۴۷
۸۔ اظہر علی فاروقی۔ اردو گیت مشمولہ نگار۔ اصناف سخن نمبر پاکستان ۷۰ ۹۔ ص ۲۹۵
۹۔ قیصر جہان۔ اردو کے منتخب گیت۔ ص ۹
۱۰۔ سمیع اللہ اشرفی ڈاکٹر۔ اردو اور ہندی کے جدید مشترک اوزان۔ ص ۳۲
۱۱۔ عظیم الحق جنیدی۔ اردو ادب کی تاریخ۔ ص ۱۷
۱۲۔ عظیم الحق جنیدی۔ اردو ادب کی تاریخ۔ ص ۱۷
۱۳۔ مسعود حسین خاں۔ ورود مسعود۔ ص ۱۲۱
۱۴۔ مسعود حسین خاں۔ ورود مسعود۔ ص ۹۸
۱۵۔ راج بہادر گوڑ۔ "دو نیم ایک تنقیدی مطالعہ" نذر مسعود نذر مسعود۔ ص ۳۶۵
۱۶۔ مسعود حسین خاں۔ دو نیم۔ ص ۱۴۱
۱۷۔ سلیمان اطہر جاوید۔ "مسعود حسین خاں بحیثیت شاعر"۔ مشمولہ نذر مسعود۔ ص ۲۰۱
۱۸۔ مسعود حسین خاں۔ دو نیم۔ جدید ایڈیشن۔ ص ۱۸۲
۱۹۔ مسعود حسین خاں۔ دو نیم۔ ص ۱۹۶
۲۰۔ مسعود حسین خاں ڈاکٹر۔ دو نیم۔ ص ۱۹۸۔۱۹۹
۲۱۔ راج بہادر گوڑ۔ نذر مسعود۔ ص ۳۶۹
۲۲۔ قیصر جہان۔ اردو کے منتخب گیت۔ ص ۱۳
۲۳۔ بیگم بسم اللہ نیاز، ڈاکٹر۔ اردو گیت۔ کراچی۔ ص ۹۰
۲۴۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ مقالات مسعود۔ ص ۱۹۱، ۱۹۳
۲۵۔ راج بہادر گوڑ۔ "دو نیم ایک تنقیدی مطالعہ" مشمولہ نذر مسعود۔ ص ۳۶۳
۲۶۔ سلیمان اطہر جاوید۔ "مسعود صاحب بحیثیت شاعر" مشمولہ نذر مسعود۔ ص ۲۰۰

خود نوشت

خود نوشت نثری ادب کی ایک صنف ہے جسے آپ بیتی بھی کہا جاتا ہے اس میں مصنف اپنے حالات خود قلم بند کرتا ہے۔ خود نوشت کسی شخص کی حسین یادوں اور پرانی وارداتوں کا خوبصورت سنگم ہوتی ہے۔ خود نوشت میں خود شناسی، خود آگاہی اور پختہ ذہن کی یاد داشتوں کا سمندر ہوتا ہے خود نوشت میں مصنف قاری کو اپنی زندگی کے نہاں خانوں سے روشناس کرواتا ہے

Cassells Encyclopadia of literature

میں خود نوشت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے

" Audiography is the narration of man's life by himself it should contain a greater guarantees of truth than any other form of biography since the central figure of the book appearance also a witness of the event which he record. "

" خود نوشت کسی انسان کی زندگی کی وہ روداد ہے جس میں وہ خوبیاں بیان کرے اس میں سوانح حیات کی کسی بھی دوسری شکل سے زیادہ صداقت کی ضمانت ہونی چاہیئے۔ کیونکہ کتاب کی مرکزی شخصیت ایسے گواہ کے طور پر بھی پیش ہوتی ہے جنہیں وہ قلم بند کرتی ہے "(۱)

خود نوشت سوانح کا آغاز اٹھارویں صدی سے ہوتا ہے ابتدائی دور میں فلسفیوں، مورخوں اور شاعروں نے اس فن کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ انگریزی

میں خود نوشت کے ابتدائی نمونے گبن۔Gibban ، گوئٹے۔Goethe اور ہرڈر۔Hurder کے یہاں ملتے ہیں۔

ایڈورڈ گبن کی تصنیف "Memories of his life and writing" کو اس صنف کا پہلا نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ابتداء میں یہ صنف انگریزی ادب میں فروغ پاتی رہی۔انیسویں صدی عیسوی میں جدید سائینسی علوم کا ارتقا ہوا اور انگریزی ادب ساری دنیا پر اور خاص کر یورپ، ایشیا اور افریقہ پر شہنشاہیت کے زور سے آگے بڑھنے لگا اس دور میں خود نوشت کے طرز تحریر میں سائنسی انداز میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں لیکن اس صنف کا دائرہ محدود ہی رہا۔صبیحہ انور لکھتی ہیں۔

"انیسویں صدی میں مطالعات انسانی کی تجدید سے آپ بیتی میں سائنٹیفک انداز کی دلچسپی نے خصوصی حیثیت اختیار کرلی پھر اس نے نفسیات اور تاریخ کے ماخذ کے طور پر ایک متعین مقام حاصل کرلیا۔روسو Rousseau کے اعترافات کو بھی خود نوشت سوانح حیات فن میں ایک اہم مقام حاصل ہوا۔روسو خود نوشت سوانح حیات کی صنف میں جمہوری رجحان کا علمبردار ہے"(۲)

انیسویں صدی میں Issae Williams نے ۱۸۵۱ء میں خود نوشت لکھی جو ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی اس صدی میں ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا انگریزی تعلیم کے زیر اثر ہمارے ملک میں جہاں کئی ایک علوم کو ترقی ملی وہیں آپ بیتی کے فن کے لئے بھی حالات سازگار ہونے لگے

انیسویں صدی میں ہندوستان میں جو آپ بیتیوں کے نمونے ملتے ہیں ان میں لطف اللہ کی خود نوشت ۱۸۵۴ء میں شائع ہوئی۔

"انگریزی زبان میں کسی ہندوستانی کی پہلی آپ بیتی لطف اللہ نے ۱۸۵۴ء میں لکھی ۱۸۵۷ء میں اس کی اشاعت کے فوراً بعد انگریزی

پڑھنے والے اسکی طرف متوجہ ہوئے۔" (۳)

لطف اللہ ایسٹ انڈیا East India co. میں ملازم تھے وہ انگریزوں کو عربی اور فارسی پڑھاتے تھے۔ ۱۸۴۴ء میں انہوں نے انگلستان کا سفر کیا ان کی زندگی مہمات سے بھری تھی انہوں نے اپنی زندگی کے مختلف حالات کا دلچسپ اور سادہ انگریزی میں اظہار کیا ہے یہی ان کی خود نوشت کہلائی۔

۱۸۷۳ء میں ہندی میں خود نوشت سوانح ایک ریٹائرڈ فوجی سیتارام نے لکھی اس کے بعد سے خود نوشت کا سلسلہ چل پڑا۔

بیسویں صدی میں خود نوشت کا رواج عام ہوا۔ ۱۹۰۸ء میں لالہ لاجپت رائے نے اپنی سیاسی سرگرمیوں اور اپنی جلاوطنی کی کیفیات اور اس دور کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف تحریروں کے ذریعہ خود نوشت کا ایک غیر مربوط خاکہ تیار کیا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں "اپنی زندگی کی کہانی" اردو میں لکھی۔اس کے بعد مولانا محمد علی جوہر ۱۹۲۲ء میں "My Life A Fragment" کے عنوان سے مذہبی قسم کی خود نوشت لکھی اردو میں خود نوشت آج تک بھی بہت کم لکھی گئی ہیں۔

> " عبدالغفور نساخ کی " سوانح عمری " کو چھوڑ کر دیگر خود نوشتیں بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں تحریر کی گئی ہیں جن کا سلسلہ ۱۹۶۴ء سے شروع ہوتا ہے" (۴)

وحاج الدین علوی لکھتے ہیں کہ مواد کے لحاظ سے اردو کی ابتدائی خود نوشتوں میں نساخ کی خود نوشت ممتاز مقام رکھتی ہے۔

خود نوشت سوانح ایک ایسا فن ہے جو زندگی کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ایک ادبی کارنامہ ہے اپنی خودی کے اظہار کیلئے اپنے قلم سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں ہوتا۔

اس میں مصنف آپ اپنا ہیرو ہوتا ہے (۵) اس حوالے کی روشنی میں ڈاکٹر صبیحہ انور نے خود نوشت سوانح نگار کو ایک ہیرو کا درجہ دیا ہے۔

خود نوشت سوانح نگار جب واقعات لکھنا شروع کرتا ہے تو اسے اپنے بیتے ہوئے لمحات کو ایک ایک کر کے یاد کرنا پڑتا ہے یہ وہ واقعات ہوتے ہیں جن پر زمانے کی گرد چھائی رہتی ہے ایسے میں واقعات کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے مصنف کو اپنی یادداشت اور تخیل کو بروئے کار لانا پڑتا ہے بعض وقت واقعات جوں کے توں یاد نہیں رہتے سوانح نگار کو واقعات تخلیق کرنے پڑتے ہیں ۔ لہذا خود نوشت ایک تخلیقی فن بن جاتا ہے اور یہ تخلیقی ادب کا ایک جز بن جاتے ہیں ۔

ڈاکٹر سید عبداللہ خود نوشت سوانح نگار کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

"انسان اپنے عیوب کو چھپاتا ہے اور اسے اپنے اعزاء اور احباب کا تذکرہ کرتے ہوئے خوف دامن گیر ہوتا ہے اس طرح یا تو سب کچھ چھپاتا ہے یا بہت بننے کی کوشش کرتا ہے اور مبالغہ سے کام لیتا ہے ۔" (۶)

مصنف اپنے اظہار کے لئے جذبات و احساسات اور مشاہدات کا اظہار ہی نہیں کرتا بلکہ انہیں لوگوں تک بے باک پہونچاتا ہے ۔ خود نوشت میں کچھ یادیں، خاص واقعات، پیدائش کا حال، جوانی کے کچھ قصے . کچھ نوک جھونک، آسودگی، واردات عشق ان سب کا حال بیان کرتا ہے ۔ خود نوشت سوانح نگار گذرے ہوئے حالات کو اسیر کرتا ہے ۔ " داستان خود و بقلم خود کے مصداق میں "

"خود نوشت سوانح نگاری کا مفہوم کسی شخص کی زندگی کا اس کے قلم کے ذریعہ نقشہ کھینچا جاتا ہے" (۷)

مصنف ان خیالات کو مرکوز کرتا ہے جو شعور سے لاشعور کی جانب جا چکے ہوتے ہیں اس طرح پھر یہ لاشعور کے دفینہ کو کھود کر شعور کی رو کی شکل میں قلمبند کرتا ہے ۔ عموماً خود نوشت کا مصنف اسی وقت اپنے قلم کو جنبش دیتا ہے جبکہ وہ زندگی کے سارے نشیب و فراز دیکھ چکا ہوتا ہے زندگی کے نشاط و غم کا لطف اٹھا چکا

ہو اور آئندہ اس کے آگے کوئی حسرت نہ ہو ایسی صورت میں خود نوشت زندگی کے تمام حالات کا نچوڑ ہوتی ہے جس میں گہرائی، پختہ ذہنیت اور سنجیدگی ہوتی ہے۔ خود نوشت میں انسان از سر نو اپنی زندگی کے اوراق آہستہ آہستہ الٹتا جاتا ہے۔

"آپ بیتی انسان کی زندگی کے تجربات مشاہدات محسوسات و نظریات کی مربوط داستان ہوتی ہے جو اس نے سچائی کے ساتھ بے کم وکاست قلم بند کر دی ہے" (۸)

خود نوشت میں مصنف اپنی ذات کو محور بنا کر اطراف میں احباب اور دوسرے اشخاص کا ذکر ضمنی کرتا چلا جاتا ہے اس میں سچائی کا عنصر ہوتا ہے اس تصنیف میں فرد واحد کے تمام تجربات جذبات و احساسات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے زندگی کے عریض و بسیط تجربات و واقعات کو تخلیقی مرقع کی شکل میں سجایا جاتا ہے۔

اردو ادب میں ادبی خود نوشتوں کا خزانہ محدود ہے ادبی خود نوشت اردو ادب کا ایسا سرمایہ ہے جس سے اردو ادب کو اس کے معماروں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے یہ صنف محدود ہے لیکن موجودہ سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی کے دور میں ادب بھی برق رفتاری کے ساتھ ترقی پارہا ہے۔ بیسویں صدی کے موجودہ دہے میں اچھی اور معیاری خود نوشتیں لکھی گئیں ہیں۔

اردو میں خود نوشت کا فن بیسویں صدی کے نصف صدی گذرنے کے بعد سے ملتا ہے۔ موضوع و مواد کے لحاظ سے اردو میں تین قسم کی خود نوشتوں کے نمونے ملتے ہیں (۱) مذہبی خود نوشت (۲) سیاسی اور سماجی خود نوشت (۳) ادبی خود نوشت۔ ادبی خود نوشت فن کار کا تخلیقی کارنامہ ہوتی ہے جس کا خالق شاعر ادیب یا مورخ ہوتا ہے۔

"ادبی خود نوشت میں "ادبی انداز، ادبی مسائل افکار اور اشخاص کے اثرات غالب رہتے ہیں۔" (۹)

اردو میں جو موجود خود نوشتیں لکھی گئی ہیں ان میں قابل ذکر یہ ہیں۔

۱۔سوانح عمری، عبدالغفور نساح ۲۔میری دنیا، ڈاکٹر سید اعجاز حسین ۳یادوں کی دنیا، ڈاکٹر یوسف حسین ۴۔آشفتہ بیانی میری، رشید احمد صدیقی ۵۔یادوں کی برات، جوش ملیح آبادی ۶۔مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں، خواجہ غلام السدین ۷۔جہان دانش، احسان دانش ۸۔اپنی تلاش میں، کلیم الدین احمد ۹۔زر گذشت، مشتاق احمد یوسفی ۱۰ آپ بیتی، عبدالماجد دریابادی ۱۱۔مٹی کا دیا، مرزا ادیب ۱۲۔ورود مسعود، ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۔اس کے بعد ابھی آئی ہوئی خود نوشت ہے ۔خواب باقی ہیں، پروفیسر ال احمد سرور۔

خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ نے موجودہ صدی کے اردو فارسی کے اہم محققین، ادبا شعراء اور ناقدین کی خود نوشت سوانح عمریاں شائع کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے ۔ورود مسعود، اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے ۱۹۸۸ء میں خدا بخش اورینٹل لائبریری سے شائع ہوئی جو ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔اسکی اشاعت کے بعد چند ناگزیر مسائل پیدا ہوگئے اور اس پر بین لگایا گیا ۔دوبارہ خدا بخش لائبریری جنرل ۴۸ میں اعتراض شدہ متن اور ناموں کو حذف کر کے یہ شائع کی گئی ۔

اس کے بارے میں ادارہ خود لکھتا ہے ۔

" یہ مصنف کے اپنے تجزیے اور تجربے ہیں ایسے مواد سے جو صریحاً کسی کو ناگوار ہو نام حذف کر دیا گیا ہے ۔" (۱۰)

ورود مسعود، پروفیسر مسعود حسین خاں کی ایک ایسی تخلیقی تصنیف ہے، جس کی آمد سے سارے اردو حلقہ میں ایک تہلکہ مچ گیا ۔مسعود حسین خاں ایک ماہر لسانیات، محقق، اور ناقد کی حیثیت سے خاص مقام رکھتے ہیں ۔ تحقیق اور ادب کا باریک بینی سے مشاہدہ ان کی تنقید کا خاص عنصر ہے " ورود مسعود " ایک ایسی خود نوشت ہے، جو ادب، تاریخ، تہذیب، قصباتی زندگی، پٹھانی تہذیب و معاشرت، علی گڑھ و جامعہ ملیہ کی علمی سرگرمیوں اور مختلف حالات کا کھلا آئینہ ہے ۔

"ورود مسعود" سترہ ابواب پر مشتمل ہے ہر باب کو ایک عنوان دیا ہے جس سے اس باب کے مواد اور متن کے بارے میں اشارتاً اندازہ ہو جاتا ہے۔

پہلا باب = آبائی وطن، پیدائش، خاندان، بچپن، قائم گنج کے سماجی و معاشرتی حالات اور وہاں کی لسانی بولیوں پر مشتمل ہے۔

دوسرا باب = جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ہے۔جامعہ ملیہ مسعود صاحب کی مادر ملمیہ بھی ہے اور اسی جامعہ میں اعلیٰ عہدہ پر فائز بھی رہے۔اسی جامعہ کے ثانوی درجہ تک تعلیم پائے ہوئے ہونہار سپوت اپنی زندگی کے نصف صدی گذرنے کے بعد اسی جامعہ کے باوقار عہدے پر وائس چانسلر کی حیثیت سے فائز ہوئے ہیں۔اس طرح دو ابواب جامعہ ملیہ سے متعلق ہیں۔پہلا باب آزادی سے قبل جبکہ ہندوستان سیاسی شورشوں کا شکار تھا۔پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد دنیا پر دوسری جنگ عظیم کے بادل منڈلا رہے تھے اس وقت سے متعلق ہے۔اس جامعہ میں مسعود صاحب وسطانوی تعلیم ختم ہونے کے بعد ثانوی تعلیم کا ایک درجہ مکمل کرتے ہیں یعنی آٹھویں درجہ کے بعد سے ان کا سلسلہ تعلیم بنگال ڈھاکہ سے متعلق ہے۔ابتدائی تعلیم اساتذہ کی خوبیاں، جامعہ کی حالت، ساتھ میں ان شخصیتوں کا ذکر جو دوران تعلیم اساتذہ یا ساتھی تھے اور جب یہ وائس چانسلر بن کر آئے تب ان کی کیسے ملاقات رہی اس کا ذکر بھی جامعہ کے پہلے باب میں ہی ملتا ہے۔

تیسرا باب = بنگہ دیش اک رنگ بھون۔کے عنوان سے ہے۔اس باب میں ثانوی تعلیم۔میٹرک کے بعد انٹر میڈیٹ تک کی تعلیم کا ذکر ہے۔ڈھاکہ کی خوبصورت سرزمین۔ٹیگور اور نذرل کے وطن کی پر کشش کیفیات کا ذکر ہے جس سے ڈاکٹر صاحب متاثر رہے ہیں۔یہ باب اساتذہ کی خوبیاں، بنگال کا ماحول، آزادی سے قبل تقسیم ہند کی تاریخ اور عظیم ہندوستان کے خاکے کو پیش کرتا ہے۔

چوتھا باب = مرحوم دہلی کالج سے متعلق ہے جہاں سے انھوں نے بی اے کیا۔اس

کالج کے ناموں کی تبدیلی، دہلی کے پر آشوب دور کی کہانی، مختلف اساتذہ کی خوبیاں، ان کے مرقع قروالباغ کا خاکہ ۔اس دور میں ذاکر صاحب کے گھر کی حالت پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔اس باب میں مختلف ادبی سیاسی شخصیتوں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

پانچواں باب = علی گڑھ متعلق ہے۔ورود مسعود میں علی گڑھ سے متعلق چھ ابواب ہیں ۔اگر ان ساروں کو ایک جا کر دیں تو علی گڑھ کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی ماحول کی ایک مختصر سرگذشت یا تاریخ بن سکتی ہے۔پہلے باب میں (علی گڑھ سے متعلق) ایم اے کی تعلیم، خاص اساتذہ کرام، پروفیسر آل احمد سرور، رشید احمد صدیقی اِن دونوں کا تقابلی جائزہ اور حالات پر بہت کچھ معلومات ملتی ہیں۔

چھٹا باب = ایم اے کے بعد، "کچھ غم جاناں، کچھ غم دوراں،" عنوان سے تفصیلات ہیں ۔اس باب میں دوبارہ قائم گنج کا ماحول، خاندان کے حالات، ریڈیو کی ملازمت، اس دوران مختصر سے عرصہ میں مخصوص شخصیتوں سے تعارف، اس بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔

ساتواں باب = علی گڑھ سے متعلق ہے۔اس دور میں دوبارہ علی گڑھ میں آمد بحیثیت اسکالر وہاں کی مصروفیات، بحیثیت جونیر لکچرر عارضی تقرر کے علاوہ نجی زندگی کے مختلف واقعات کا پردہ فاش کیا ہے۔شادی سے متعلق تمام تفصیلات اس باب میں ملتی ہیں ۔اس زمانے میں مسعود صاحب نے تحقیق کا کام کیا اور مقدمہ تاریخ زبان اردو کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔

آٹھواں باب = دیار فرنگ ۔۵۰ تا ۵۳ء کا ہی ہے۔لیکن وہ باب ہے جس میں سفر نامہ سرگذشت، یورپی تہذیب، ادبی سرگرمیوں، ان سب کے بارے میں تصویر کشی ملتی ہے ۔اس دوران پہلے لڑکے کی ولادت کی بھی تفصیل ہے۔"یادوں کی دنیا" میں یورپی ماحول کا جو نقش پروفیسر یوسف حسین خاں نے کھینچا بالکل اسی طرح کی تصویر

ڈاکٹر صاحب نے بھی کھینچی ہے۔

نواں باب = پھر علی گڑھ کا ہے ۵۳ تا ۵۹ء۔ یہ باب تو عنوان کے لحاظ سے سات سال پر محیط ہے۔ لیکن مسعود صاحب نے ۶۰ تا ۸۵ء کے حالات کا جائزہ بھی لیا ہے جو ایک طرح سے غیر مربوط معلوم ہوتا ہے۔ اس باب میں ۷۰ء کے واقعات۔ ۸۳ء کے الیکشن کا حال۔ ۶۴ء میں لسانیات کے ورکشاپ کا بیان۔ مکان کی تعمیر کا واقعہ۔ علی گڑھ میں ملازمت کا حال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا علمی و ادبی ماحول ذاکر حسین خاں کے دور وائس چانسلری وغیرہ کی تفصیلات ملتی ہیں۔

دسواں باب = ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں کہ عنوان سے امریکہ کے سفر کے بارے میں ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہارورڈ میں لسانیات کے پروفیسر کی حیثیت سے مامور رہے۔ اس دوران امریکہ کا ہوائی سفر پہلی بار کیا۔ یہاں سے تنقیدی پہلو شروع ہوتا ہے۔ لسانیات، صوتیات، اور تخلیق شعر جیسے عنوانات پر مختلف مباحثوں اور مضامین کا اشارہ ملتا ہے۔ اس باب میں برکلے کے ماحول، معاشی حالات، وہاں کی یونیورسٹیوں کا حال، اور عوام کا طور طریق ان سب کے بارے میں دلچسپ معلومات ہیں۔ ادبی تنقید یہیں سے بڑھنے لگی۔

گیارھواں باب = "دکن ملک بھونچ خاصا آہے" ۔ کا ہے یہ باب ۶۲ تا ۶۸ء چھ سال کو محیط ہے۔ یہ دور علمی تحقیقی اعتبار سے مسعود صاحب کیلئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں بحیثیت صدر شعبہ اردو کے تقرر، اس کے بعد حیدرآباد میں قیام کا تفصیلی جائزہ ہے۔ حیدرآباد سے ڈاکٹر صاحب کے اسلاف کی وابستگی رہی ہے۔ مسعود صاحب کی وابستگی بھی بچپن میں اور ملازمت کے دوران رہی۔ اس باب میں پروفیسر کے عہدہ پر تقرر سے لیکر ان تمام مسائل کو واضح کیا ہے جو شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی سے متعلق ہیں۔ اپنے رفیق کار اساتذہ۔ طلباء، خاص ریسرچ کے طلباء رفیق شعبہ افراد کے بارے میں سرسری معلومات دلچسپی سے خالی

نہیں ہیں۔

اس باب کے آخر میں رشید احمد صدیقی صاحب کا وہ خط ہے جس میں علی گڑھ میں دوبارہ ملازمت کی اطلاع دی گئی۔

بارھواں باب = علی گڑھ سے متعلق ہے۔جو ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۳ء پر مشتمل ہے۔ حیدرآباد کو مسعود صاحب مستقل اپنا مسکن بنانا چاہتے تھے نہیں معلوم ارادہ کیوں بدل گیا۔انہوں نے کچھ سامان بیچا اور باقی سامان کے ساتھ علی گڑھ کے لئے روانہ ہوئے۔اس وقت علی گڑھ یونیورسٹی میں لسانیات کا شعبہ کھل چکا تھا۔اس باب میں شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علمی سرگرمیوں کے علاوہ تنقیدی مضامین اور اردو کے مسائل کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

تیرھواں باب = جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وائس چانسلری کے دور سے متعلق ہے۔ یہ باب ۷۳ تا ۷۸ء پر محیط ہے۔ایک طرف سیاسی حالات جو جامعہ سے متعلق تھیں، دوسری طرف علمی خدمات جس میں بہت کچھ تبدیلی کی ضرورت تھی۔ان دونوں کو مسعود صاحب نے بڑی مصلحت سے سرانجام دیا۔یہی وہ باب ہے جس میں بہت سے متنازعہ واقعات کو حذف کر کے خدابخش جنرل میں درود مسعود کی تلخیص کے طور پر شائع کی گئی ہے اس باب میں جامعہ اردو علی گڑھ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے انتخاب اور پھر جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر کے عہدے پر تقرر اور عہدے کی مدت کے ختم تک یعنی چھ سال تک کے حالات کا تفصیلی جائزہ ہے۔

چودھواں باب = ۱۹۷۸ تا ۱۹۸۱ء سے متعلق ہے۔یہ دور پھر علی گڑھ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔اگست ۷۸ء میں پھر مسعود صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ملازمت پر آگئے تھے اس باب میں علی گڑھ یونیورسٹی کے فیکلٹی آف آرٹس کے حالات اور سیاست کا جائزہ ہے۔جس میں پروفیسر عظیم، عبدالغفار شکیل کے تعلقات اور ملازمتوں کے بارے میں تفصیلات بڑی صاف گوئی سے پیش کی گئی ہیں۔پروفیسر

عظیم جو اس وقت پرو وائس چانسلر تھے مسعود صاحب کے شاگرد اور رفیق کار تھے لیکن بعد میں حالات کچھ کشیدہ ہو گئے جس کا ذکر "ورود مسعود" کے اس باب میں اور اس کے بعد والے باب میں بھی ملتا ہے۔

پندرھواں باب = ۱۹۸۱ تا ۱۹۸۲ء کا ہے جبکہ مسعود صاحب کا کشمیر یونیورسٹی کے اقبال نسٹی ٹیوٹ میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تقرر کیا گیا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے اسکالروں کی رہبری کے ساتھ مسعود صاحب نے اقبال کے فن پر لسانیات اور صوتی آہنگ کے لحاظ سے بحث کی اور اقبال کی نظری و عملی شعریات پر ایک تنقیدی مقالہ لکھا جو کتابی شکل میں اقبال انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوا۔ پھر آمد شعر ہوئی "وادی گل" نظم ستمبر ۸۱ء میں اور ایک غزل جس کا مطلع تھا ؎

تیرے خیال سے رقص دوراں ہے میری غزل
تیری نگاہ سے اب تک جواں ہے میری غزل

اکتوبر ۸۱ء میں تخلیق پائیں۔ کشمیر کے ماحول، وہاں کے پر کیف وادیوں کا موسم، مختلف غذاؤں اور خشک و تر میووں کا ذکر دلچسپی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اسی باب میں "طالعہ مخدوم" (۱۱) ایک ریسرچ اسکالر جو اقبال کے تصورات اور جمالیات پر کام کر رہی تھیں، اس کی "عوضی محبت" کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے عقائد کا ہلکا نقش۔ اپنے بیٹے سے جذباتی لگاؤ اور آس و ناامیدی ان سب کا سرسری خاکہ ملتا ہے۔ اقبال کے نظریہ شعر وغیرہ کے بارے میں تفصیلات ہیں۔

سولھواں باب = علی گڑھ ہی سے متعلق ہے اس طرح علی گڑھ کے بارے میں یہ چھ باب ہوتے ہیں۔ اس باب میں اردو لغت کے بارے میں تفصیلات، کچھ جامعہ اردو کے مسائل، اور اسکی توسیع کے سلسلہ میں مسعود صاحب کی کاوشوں کا ذکر، مسعود صاحب کی کتابوں کے دوبارہ ایڈیشن کا ذکر زیر طبع ادبی کارناموں کا ذکر، اپنے بچوں کے بارے میں مختصر تفصیلات، کراچی کے سفر کے بارے میں معلومات، بیرون

ہند اردن کا سفر بھی کیا ہے ۔اس دوران مقامات مقدسہ کا ذکر، اردن کے سماجی حالات کا نظری خاکہ یہ سب شامل ہیں ایسا لگتا ہے اس باب میں دریا کو کوزے میں سمادیا ہے ۔

ستھرواں باب = مختصر سا، اپنی نجی زندگی کی خوشحالی کا اعتراف ہے اور اپنی بیگم کی خدمت میں ہدیہ تشکر کی شکل میں ہے ۔اس باب میں "نجمہ" سے رفاقت اپنی بچیوں کی خوشی، لڑکے کے بارے میں فکر، اور اپنی نجی زندگی کی رنگین وارداتوں کے اشعار، مصرعہ یا حسرت کی غزل کی شکل میں اظہار خیال کیا ہے ۔ان سترہ ابواب میں ۷۰ سالہ زندگی کا تاریخی، تہذیبی، سماجی، علمی، انتظامی، نجی، عملی، سفری، اعزازی صورتوں میں جائزہ لیا ہے ۔جس میں لطف بھی ہے، بے باکی بھی ہے، آسودگی بھی ہے، رنگینی بھی ہے ۔طنز بھی ہے، اعتراف بھی ہے، ناراضگی بھی ہے اور پوشیدہ خودستائی و خود نمائی بھی ہے ۔" میری پیری میں ہے مانند سحر رنگِ شباب"

آخر میں پھر دو جملوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیگم اور شاعری کو بہت عزیز رکھتے ہیں ۔

" اگر مجھے زندگی دوبارہ عطاء ہو تو نجمہ کے ساتھ شعر کی دیوی کا پھر خواہشمند رہونگا" (۱۲)

آخری صفحہ پر دونوں کی تصویر سے اس خودنوشت کا اختتام ہوتا ہے ۔

مسعود حسین خاں کے تحقیقی، تنقیدی، ادبی لسانی کارناموں کے ساتھ ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو ہے وہ ہے تخلیقی ۔انہوں نے تخلیق ادب کی حیثیت سے دو اہم کارناموں کو انجام دیا ہے ۔ایک ہے "دو نیم" جو ان کی نظموں، گیتوں، غزلوں، اور قطعات کا مجموعہ ہے ۔جس میں مسعود صاحب کی نجی زندگی کا عکس ملتا ہے ۔

دوسرا تخلیقی کارنامہ "ورود مسعود" ہے جس میں ان کے معاصرین کی، اہل خاندان کی مختلف مشاہیر کی زندگیوں کے اہم گوشے اور خاکے ملتے ہیں ۔یہ خودنوشت

ایک ایسی آپ بیتی ثابت ہوئی جس کے منظر عام پر آنے کے بعد ادبی دنیا میں قلمی مذاکروں اور بحثوں کالامتناہی سلسلہ چل پڑا۔ یہ ایک کھلی کتاب ہے۔ جس میں سچائی حقیقت اور صاف گوئی ہر موڑ پر ملتی ہے۔

مشفق خواجہ ورود مسعود پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اب اردو میں ایک ایسی آپ بیتی بھی شائع ہو گئی ہے جسے بلاشبہ اردو کی چند بہترین آپ بیتیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے...... بعض لوگ اسے نا مسعود قرار دیں گے کیونکہ اس میں ان کا ذکر اچھے لفظوں میں نہیں آیا" (۱۳)

یہ آپ بیتی مسعود حسین خاں صاحب کی ۶۹ سالہ زندگی کی یادداشتوں پر مبنی ہے۔ اس میں کہیں بھی سچائی اور بے باکی سے گریز نہیں کیا گیا۔ نہ ہی اپنے نجی حالات میں، اور نہ ہی دوسروں کے واقعات لکھتے وقت۔ بقول مصنف کے

"میں نے اپنے اعمال نامہ میں دوسروں کے اعمال کا بھی بے باکی سے جائزہ لیا ہے معلوم نہیں کن کن ماتھوں پر شکنیں پڑیں گی بہر حال اس سلسلہ میں میں نے شکسپیر کے اس مشہور قول کا سہارا لیا ہے۔

...... to thine ownself betrue, And it "
west follow, as the night the day, thou
Can,st not then be flase to any "
man. (۱۴)

خدا بخش لائبریری کے جنرل ۴۸ میں اسکی تلخیص شائع کی گئ ھے۔ صرف چند نام یا خاص متنازعہ واقعات کو حذف کر دیا ھے۔ یہ اعتراضات تیرھویں باب سے شروع ہوتے ہیں۔

صفحہ نمبر ۲۲۹ پر تین جگہ مصطفیٰ علی صاحب کا نام حذف کر دیا گیا ہے۔

صفحہ نمبر ۲۳۰ ۔ ایک جملہ " ان کا تبادلہ سوشیل ورک سے مرکزی دفتر کے اکاؤنٹس آفس میں کر دیا گیا" اس صفحہ پر نارنگ صاحب کے تعلق سے ایک ترکیب " جاہ طلب" استعمال کی گئی۔

صفحہ نمبر ۲۳۱ پر یہ عبارت ۔

" وہ اپنے حدف پر نظر رکھتے ہیں ۔ تیر کیسا ہے اور کہاں سے چلتا ہے اس سے انہیں غرض نہیں ہوتی وہ اپنے مقصد کے لئے ہر قسم کے ذریعہ کو استعمال کر سکتے ہیں حتیٰ کہ طلباء تک کو "

جامعہ ملیہ میں مسعود صاحب جب وائس چانسلر تھے انہیں دو بار سعودی عرب کے سفر کا موقع ملا ۔ پہلے سفر کے واقعہ میں بھی کچھ جملے حدف کر دئے گئے ہیں ۔ صفحہ نمبر ۲۳۷ ۔

باقی ممبران پارلیمنٹ تھے جو جج ڈیلیگیشن کے پیشہ ور رکن معلوم ہوتے تھے اس لئے کہ اس سے قبل بھی وہ اس حیثیت سے آچکے تھے ان کے پیش نظر صرف کمانے کا مشغلہ رہتا ثواب نہ سہی عذاب سہی ،

اور بھی کئی جملے اور الفاظ ہیں ۔ طوالت کی خاطر صرف چند کا حوالہ دیا گیا۔

اس آپ بیتی کی ابتداء مسعود صاحب کی پیدائش اور خاندانی حالات سے ہوتی ہے ۔ قائم گنج کی وجہ تسمیہ ، وہاں کے جغرافیائی حالات ، قصباتی رنگ ، پٹھانوں کا ماحول خصوصیات اور ان کی بولی کو دلچسپ پیرائے میں پیش کیا ہے ۔ علمی ، ادبی ، فضاء اس کی سیاسی اہمیت اور اپنے خاندان کا تفصیلی خاکہ پیش کیا ہے اس خاندان کے کئی افراد نے ملک کی سیاسی علمی ادبی اور تہذیبی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں اہم رول ادا کیا ہے ۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ، محمود حسین خاں ۔ یوسف حسین خاں ، خورشید عالم خاں ، غلام ربانی تاباںؔ ، وغیرہ اہم شخصیتیں ہیں ، ان اہم شخصیتوں نے کسی سفارش

یا سیاسی چھاپ سے اپنا مقام نہیں بنایا بلکہ اپنی ذاتی محنتوں اور علمی، ادبی کاوشوں سے دنیائے ادب و سیاست میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

اپنی پیدائش کے واقعہ کو بھی مسعود صاحب نے راست ہی قلمبند کیا ہے جبکہ اس کو بالواسطہ لکھنا چاہئے تھا۔ گھر اور خاندان کے بارے میں کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رکھی۔ ہر راز بر سر عام ہے جسکی بہت سی مثالیں شخصیت کے باب میں پیش کی جا چکی ہیں۔

مثال کے طور پر چند واقعات ملاحظہ ہوں

" میری والدہ کے پاس کافی دودھ نہ ہونے کی وجہ سے مجھے گھر کی دھوبن پنچا کی جروا (جورو) کا دودھ پینا پڑا......... میرے منجھلے ماموں (۱۵) کو تو گدھیا (گدھی) کا دودھ پینا پڑا۔" (۱۶)

والد صاحب کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ان میں تحفظ زن کا افغانی جذبہ شدت سے موجود تھا اور انکی ممانعت تھی کہ والدہ کسی قسم کا باریک کپڑا جس سے بدن جھلکے نہ پہنیں بلکہ اس بات پر ایک بار انہیں مارا بھی تھا" (۱۷)

۱۹۳۹ء میں اینگلو عربک کالج دہلی سے جواب ذاکر حسین کالج دہلی یونیورسٹی سے موسوم ہے مسعود صاحب نے بی اے کیا۔ اس دوران حبیب اللہ صاحب ان کے خاص ساتھی تھے۔ ان کے ساتھ مسعود صاحب کبھی کبھی سینما دیکھا کرتے تھے۔ جس کا ذکر یوں کیا ہے۔

" حبیب اللہ کی متاہلانہ زندگی کی آسودگی سے متاثر تھا اور زندگی کے کسی ہم سفر اور ساتھی کی تلاش کی خواہش دل میں بیدار ہونے لگی تھی۔ ہم دونوں کبھی کبھی سینما بھی جاتے تھے ان دنوں دیویکا رانی

اور نسیم پردہ سیمیں کی رانیاں تھیں ۔ حبیب اللہ سے میں اکثر مشورہ کرتا کہ میں کس جیسی کا انتخاب کروں............ بالاخر نسیم جیسی کا انتخاب کیا۔" (۱۸)

خورشید عالم چھوٹے ماموں جو بعد کو ذاکر حسین خاں کے داماد بنے اور اب گورنر کرناٹک ہیں ۔ مسعود صاحب کے ہم عمر ہیں اور ان کے ساتھ کھیلا کرتے تھے ۔

"ہمارا محبوب مشغلہ تعمیر تھا یعنی اینٹوں یا مٹی سے گھروندے بنانا یہ کام اکثر گرمیوں کی طویل دوپہروں میں ہوتا جب گھر کے سارے بڑے سوجاتے .... ہم دبے پاؤں باہر نکل جاتے ۔ گھروندے سازی کے اس کھیل میں خورشید سے ہمیشہ شکایت رہی کہ وہ خود راج کا رول ادا کرنے لگتے اور مجھے مزدور کا کام کرنے کے لئے کہتے ۔ اینٹیں لاؤ گارا بناؤ چھت کے لئے پٹاؤ تیار کرو میری انا کو اس سے ٹھیس لگتی میں بغاوت کر بیٹھتا" (۱۹)

یہ عجیب اتفاق ہے کہ بچپن کا کھیل کسی حد تک حقیقت بن گیا ۔ خورشید تو آج بھی راج کے رول میں ہی کبھی نہ کسی طرح ملک کے گھروندے کی تعمیر کروارہے ہیں اور ڈاکٹر صاحب اپنی قلمی جہتوں سے ادب کی ایک ایک اینٹ کو جماتے ہیں اور عمارت کھڑی کرتے ہیں ۔

شاعر وادیب کی انا اس کی پہچان بتاتی ہے مسعود صاحب کی انا ابتداء سے ان کی شخصیت کا اہم عنصر بنی رہی اسی انانیت کے سبب مسعود صاحب نے کبھی اپنی خاندانی شہرت یا ترقی کا سہارا نہیں لیا ۔

درود مسعود میں صاف گوئی کا نمونہ ہر موڑ پر ملتا ہے وہ کردار نگاری کے جوہر سے اچھی طرح واقف ہیں ۔ لہذا انہوں نے فرقہ یا قوم کی بنیاد پر نہیں شخصیت کا اندازہ قابلیت اور کردار پر کیا ہے جس کے سلسلہ میں صرف مثبت پہلو ہی نہیں بلکہ منفی پہلو

بھی مد نظر رکھتے ہیں ۔جس پر اعتراض بھی کیا گیا۔ مشفق خواجہ لکھتے ہیں ۔

"اس کتاب کا سب سے سنسنی خیز حصہ وہ ہے جس میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی ایک غلطی کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں .... ہمارے خیال میں مسعود صاحب نے ڈاکٹر نارنگ کے ساتھ انصاف نہیں کیا وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ جامعہ ملیہ میں جو لوگ ڈاکٹر نارنگ کی مخالفت کر رہے تھے وہ نا اہلوں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے ایسے لوگوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہدف پر نظر رکھنا کافی ہے یہ دیکھنا ضروری نہیں کہ تیر کیسا ہے اور کہاں سے چلتا ہے" (۲۰)

اس خود نوشت میں مرحومین ہی نہیں بلکہ زندہ حضرات کے بارے میں بھی حق گوئی اور بے باکی کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔سلمان اطہر جاوید لکھتے ہیں ۔

"اس خود نوشت سوانح کی اہم ترین خصوصیت یہی ہے کہ مرحومین کے باب ہی میں نہیں ۔زندہ حضرات اور اپنے موجودہ رفقا کے ضمن میں بھی انہوں نے آئین جواں مردی حق گوئی و بے باکی کو ملحوظ رکھا ہے" (۲۱)

درود مسعود میں مسعود حسین خاں کی شخصیت کے کئی روپ ظاہر ہوتے ہیں ایک مورخ جس طرح واقعات کو تسلسل کے ساتھ سادہ انداز میں بیان کرتا جاتا ہے بالکل وہی انداز انہوں نے بھی اس خود نوشت میں اپنایا ہے ۔

"تاریخ کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ واضح طور پر بیان کئے ہوئے واقعات کی ایک مسلسل رو ہو" (۲۲)

"مورخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ جو واقعہ بھی بیان کر رہا ہو اس کے اچھے اور برے پہلو دونوں قاری کے سامنے رکھ دے .... تاریخ کا اہم ترین تقاضا غیر جانبداری ہے ایک

جانبدار شخص کی لکھی ہوئی تاریخ کو تاریخ کہنا ہی بجائے خود تاریخ ساتھ زیادتی ہے"(۳)

اس طرح مسعود صاحب نے بھی غیر جانبداری سے حقائق کو کبھی کبھی اپنے جانبدارانہ رویہ کی نظر سے دیکھا ہے۔

خاکہ نگاری مرقع نگاری

اردو کے اصناف میں خاکہ نگاری ہیئت اور تکنک کے لحاظ سے ایک ہی مختصر سی تحریر ہوتی ہے اس میں کسی شخص ، یا نامور شخصیت کا یا فرد واحد کا غیر رسمی تعارف کرواتے ہوئے اس کے منفرد پہلوؤں کو ابھارا جاتا ہے۔خاکہ مرقع کی شکل میں پیش ہوتا ہے۔

مرقع نگاری چند دوسری اصناف کی طرح انگریزی ادب کی مرہون منت ہے۔ اردو ادب میں اسکی جھلک ملتی ہے۔جیسے محمد حسین آزاد نے ذوق کے متعلق مرقع سا نمونہ پیش کیا ہے۔مولوی عبدالحق ، فرحت اللہ بیگ ، شوکت تھانوی ، اور رشید احمد صدیقی مرقع نگاری میں خاص شہرت رکھتے تھے۔

ادبی اور سنجیدہ مرقعوں کا نمونہ جسمیں مولوی عبدالحق کا "چند ہم عصر" رشید احمد صدیقی کا "گنج ہائے گراں مایہ"، ہم نفسان رفتہ اور فرحت اللہ بیگ نے بھی ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی "کچھ انکی اور کچھ میری زبانی"، بہترین مرقع نگاری کا نمونہ پیش کیا ہے

آپ بیتیوں میں بھی مرقع نگاری ملتی ہے۔آشفتہ بیانی میری (رشید احمد صدیقی)۔یادوں کی بارات، (جوش ملیح آبادی)۔یادوں کی دنیا، (یوسف حسین خاں میں مرقع نگاری کے کئی نمونے ملتے ہیں۔رشید احمد صدیقی نے بہت سے مقامات پر مرقع نگاری کی ہے۔

مسعود صاحب نے بھی ورود مسعود میں کئی جگہ مرقع نگاری اور خاکہ نگاری

سے کام لیا ہے۔ اس کے چند نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ مسعود صاحب اپنی نانی (بی) کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"میری ابتدائی زندگی پر ان کا (بی) کا گہرا اثر رہا ہے وہ ایک عجیب و غریب شخصیت کی مالک تھیں۔ ولایتی رنگ روپ، گوری چٹی، کرنجی آنکھیں، گراں ڈیل، جس محفل میں بیٹھتیں چھا جاتیں حقے اور پان کی شوقین، آخر عمر میں منہ پوپلا ہو گیا تھا تو پن کٹی ساتھ چلتی۔ حقے کا ہر وقت تازہ رہنا ضروری تھا" (۲۳)

ڈاکٹر ظفر الحسن کے بارے میں اس طرح مرقع نگاری کرتے ہیں:

"ڈاکٹر ظفر الحسن استاذ ہی نہیں طالب علموں کے لئے پیر و مرشد بھی تھے آخری عمر میں لہراتی داڑھی کے ساتھ چوغے میں ملبوس رہتے تھے طالب علم ان کی علمیت سے مرعوب اور شخصیت سے خائف رہتے تھے۔" (۲۴)

"جامعہ ملیہ کا ماحول پروفیسر مجیب کے لئے کئی لحاظ سے اجنبی تھا ایک تو ان کے ذہن کی جواہر لال نہرو کے ذہن کی طرح لامذہبیت میں پرورش ہوئی تھی جبکہ جامعہ ملیہ پر مولانا محمد علی کی اسلامیت کا ٹھپہ لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اور عابد صاحب اس اعتبار سے محمد علی نہیں تھے لیکن دونوں آزاد خیال ہوتے ہوئے اسلامیت کی چلمن کے پس پشت رہتے تھے۔" (۲۵)

چند نمونوں کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسعود صاحب بھی اپنے استاد و رفیق رشید احمد صدیقی کی طرح اعلیٰ درجہ کے مرقع نگار ہیں۔ حلیہ نگاری میں ایک دلچسپ نکتہ پیدا کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر امیر و حکیم ؒ کی خاکہ نگاری میں سیرت اور واقعہ نگاری کا عنصر غالب ہے۔ منظر کشی یوں کرتے ہیں کہ قاری اپنے آپ کو اسی ماحول میں دیکھنے لگتا ہے اس خود نوشت کے سایہ میں کئی چہروں کی داستانیں چھپی

ہوئی ہیں ۔چند ایسے کرداروں کا تذکرہ بھی ہے جس سے قصباتی زندگی کا عکس ۔ سماج کے مقفی رجحانات ، اقتصادی حالات اور اس کے پس پردہ پلنے والے جرائم کا اظہار ہوتا ہے ۔

نور خاں کا واقعہ کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ دو مختلف کردار سامنے آجاتے ہیں ۔ ایک نے بیوی کو جوے میں حاصل کیا ۔ اور دوسرے نے پٹھانی آن و زبان کا لحاظ رکھ کر اپنی بیٹی کو رخصت کیا ۔

" مسعود صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر کردار کو اس کے مرقع میں صحیح تناظر میں پیش کیا ہے ۔" (۲۶)

جامعہ سے مسعود صاحب کا تعلق دو طرح کا ہے ایک یہ کہ انکی مادر علمیہ ہے طالب علمی کے بعد میں اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہوئے جامعہ ملیہ میں چھ سالہ دور کا انہوں نے اس طرح ذکر کیا ہے جس سے جامعہ کی حالت ، وہاں کی سیاسی تحریکیں ، اساتذہ کا ماحول ، سب سامنے آجاتا ہے اس دور کی تاریخ معلوم ہوتی ہے اس مادر علمیہ کے آغوش میں مسعود صاحب جذبہ قومیت سے روشناس ہوتے ہیں جس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ۔

" میں قائم گنج سے ایک کندہ ناتراش آیا تھا جس میں انا کی صفت کے علاوہ اور خصوصیت نہیں تھی جامعہ ملیہ کے ماحول میں مجھے قومی احساسات اور تصورات کا پہلی بار علم ہوا ۔ ساری فضا قومیت اور ایثار سے سرشار تھی " (۲۷)

ورود مسعود کے اس حصے سے جامعہ کے اساتذہ میں قربانی ، حب الوطنی کے جذبہ کا اظہار ہوتا ہے جو اس وقت وہاں کے اساتذہ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ۔ ان ہی کی کاوشوں سے قوم و ملک کے انمول رتن پیدا ہوئے ۔ ان ہی اساتذہ نے اچھے ہندوستانی سچے مسلمان بننے کا جذبہ طالب علموں میں پیدا کروایا تھا ۔ سیاسی لباس ،

چرخہ کاتنا، آزادی کی تحریکات، گاندھی جی کے نظریات کی ہم خیالی، جس سے طلبا نے سیکھی اور ساتھ ہی ساتھ سیاسی تحریک سے طلبا کی وابستگی اور تعلیم و درسگاہوں کی زبوں حالی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

بقول مشفق خواجہ کے:

"ورود مسعود، پرانی تہذیبوں کی مرقع نگاری ہے تعلیمی اداروں کی زبوں حالی کی داستاں ہے۔" (۲۸)

یہ جملہ جامعہ ملیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی کے متنازعہ واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سرگزشت اور سوانح نگاری میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ خود نوشت نگار عرصہ حیات میں شامل دیگر اشخاص اور معالات کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کرتا جاتا ہے اس بیان میں داخلیت کم اور خارجیت پر زور دیا جاتا ہے۔ مسعود صاحب نے جہاں دیگر شخصیتوں کے چہروں سے نقاب اٹھائے ہیں وہیں اپنی کمزوریوں اور خامیوں کی بھی پردہ پوشی نہیں کی۔

جامعہ ملیہ، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی اور جامعہ عثمانیہ کے انتظامی، تعلیمی، تدریسی اور اخلاقی ماحول کی بھی خوب عکاسی کی ہے۔

غرض "ورود مسعود" اپنے عہد کی سیاسی، تہذیبی، سماجی، تعلیمی، علمی و ادبی ٹوٹتی پھوٹتی بنتی سنورتی انداز کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ زبان کا تیکھا کھرا اور سجیلا پن اس خود نوشت کا ایک اہم وصف ہے۔

==== ○ ○ ○ ====

خود نوشت۔ ورود مسعود۔

۱۔ صبحیہ انور "اردو میں خود نوشت سوانح حیات"۔ ص ۲۰
۲۔ صبحیہ انور "اردو میں خود نوشت سوانح حیات"۔ ص ۷۰
۳۔ صبحیہ انور "اردو میں خود نوشت"۔ ص ۴۷
۴۔ سید وہاج الدین علوی۔ "اردو میں خود نوشت" فن و تجزیہ۔ ص ۶۴
۵۔ صبحیہ انور "اردو میں خود نوشت"۔ ص ۴۳
۶۔ سید عبداللہ ڈاکٹر۔ نقوش، آپ بیتی نمبر جلد اول لاہور ۱۹۶۱ء۔ ص ۶۴
۷۔ سید وہاج الدین علوی۔ "خود نوشت سوانح"۔ ص ۳۱
۸۔ طفیل احمد۔ نقوش، آپ بیتی نمبر جلد اول ۱۹۶۴ء۔ ص ۲۰۲
۹۔ وہاج الدین علی۔ اردو میں خود نوشت فن تجزیہ۔ ص ۵۰
۱۰۔ حرف چند۔ خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ جنرل ۴۸
۱۱۔ طالعہ مخدوم جو کشمیر انسٹیوٹ کی اسکالر تھیں جو ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں اقبال کے تصورات جمالیات پر کام کر رہی تھیں وہ ڈاکٹر صاحب سے بہت مانوس ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب انکو اپنی بہو بنانا چاہتے تھے یہی وجہہ تھی کہ اور بھی چاہنے لگے تھے۔
۱۲۔ مسعود حسین خاں۔ ورود مسعود۔ ص ۳۴
۱۳۔ مشفق خواجہ "ورود مسعود ایک بہترین آپ بیتی" بشمولہ۔ نذر مسعود، فکر و نظر علی گڑھ۔ ص ۲۶۷
۱۴۔ مسعود حسین خاں۔ نذر مسعود۔ ص ۲۸۱-۲۸۰
۱۵۔ غلام ربانی تاباں مسعود صاحب کے منجھلے ماموں تھے جو ایک اچھے ادیب، شاعر اور وکیل تھے۔
۱۶۔ مسعود حسین خاں۔ ورود مسعود۔ ص ۹
۱۷۔ مسعود حسین خاں۔ ورود مسعود۔ ص ۱۰
۱۸۔ مسعود حسین خاں۔ ورود مسعود۔ ص ۶۸
۱۹۔ مسعود حسین خاں۔ ورود مسعود۔ ص ۲۷
۲۰۔ مشفق خواجہ، ورود مسعود ایک بہترین آپ بیتی بشمولہ۔ نذر مسعود، ص ۲۷۵
۲۱۔ سلیمان اطہر جاوید۔ نذر مسعود۔ ص ۵۰۶
۲۲۔ اختر وقار عظیم۔ شبلی بحیثیت مورخ دہلی۔ ص ۲۹، ص ۳۷
۲۳۔ مسعود حسین خاں۔ ورود مسعود، خدا بخش لائبریری۔ ص ۱۶
۲۴۔ مسعود حسین خاں۔ ورود مسعود، خدا بخش لائبریری۔ ص ۱۲۸
۲۵۔ مسعود حسین خاں۔ ورود مسعود۔ ص ۲۲۵

۲۶- عنوان چشتی، پروفیسر مسعود صاحب کی مرقع نگاری مشمولہ - نذر مسعود، علی گڑھ - ص ۱۹۰
۲۷- مسعود حسین خاں - ورود مسعود - ص ۴۳
۲۸- مشفق خواجہ "ورود مسعود ایک بہترین آپ بیتی" مشمولہ - نذر مسعود ص ۱۷۱

نگارشاتِ مسعود

مسعود حسین خاں کی تنقیدی، تحقیقی، تخلیقی اور دیگر تصانیف کو جب اکھٹا کیا گیا اور فہرست بنائی گئی تو اندازہ ہوا کہ وہ قلم برداشتہ لکھنے کے عادی نہیں ہیں تاہم جب بھی لکھا ہے بڑے ہی انہماک سے لکھا ہے۔

ان تصنیفات، تالیفات اور مضامین کی فہرست درج ذیل ہے سنہ کی ترتیب کے لحاظ سے پیش کیا گیا ہے۔ اصناف کی درجہ بندی نہیں کی گئی۔ سنہ واری فہرست میں انگریزی اور ہندی تصنیفات بھی شامل ہیں۔

سلسلہ نمبر، تصنیفات وتالیفات	مقام وسنہ اشاعت	
۱۔مقدمہ تاریخ زبان اردو	پہلا ایڈیشن دہلی	۱۹۴۸ء
اب تک (۱۰) ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں	ساتواں ایڈیشن علی گڑھ معہ ترمیم	۱۹۸۷ء
۲۔اردو زبان وادب مجموعہ مضامین	علی گڑھ	۱۹۵۲ء
۳۔روپ بنگال اور دوسرے گیت (ہندی)	علی گڑھ	۱۹۵۴ء
۴۔سریلے بول	انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۱۹۵۴ء
۵۔ "A Phonetic & Phnological Study of the Word in Urdu.	شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۹۵۴ء
۶۔دو نیم۔ مجموعہ کلام	پہلا ایڈیشن دہلی	۱۹۵۶ء
	دوسرا ایڈیشن علی گڑھ	۱۹۸۶ء
۷۔بکٹ کہانی از افضل۔	پہلے مشمولہ قدیم اردو حیدرآباد	۱۹۶۵ء
بہ اشتراک نورالحسن ہاشمی	(دوسرا ایڈیشن اردو اکیڈیمی لکھنو	۱۹۸۶ء
۸۔پرت نامہ از فیروز بیدری	حیدرآباد	۱۹۶۵ء
۹۔شعر وزبان	حیدرآباد مشمولہ	۱۹۶۶ء
۱۰۔ابراہیم نامہ از عبدل	حیدرآباد قدیم اردو	۱۹۶۶ء
	دوسرا ایڈیشن علی گڑھ	۱۹۶۹ء
۱۱۔قصہ مہرافروز ودلبر از عیسوی خاں بہادر	حیدرآباد	۱۹۶۶ء
	(انجمن ترقی اردو ہند دہلی)	۱۹۸۹ء
۱۲۔قصہ مہرافروز ودلبر ہندی	حیدرآباد	۱۹۶۶ء

۱۳۔ دکنی اردو لغت بہ تعاون غلام عمر خاں	حیدرآباد	۱۹۶۸ء
۱۴۔ عاشور نامہ از روشن علی	شعبہ لسانیات علی گڑھ یونیورسٹی	۱۹۷۲ء
باشتراک سفارش حسین رضوی	.	.
۱۵۔ اردو کا المیہ۔ اداریے وانشائیے	علی گڑھ	۱۹۷۳ء
۱۶۔ رقعات رشید خطوط رشید احمد صدیقی	شعبہ لسانیات علی گڑھ	۱۹۸۱ء
بنام مسعود حسین خاں	.	.
۱۷۔ اردو زبان کی تاریخ کا خاکہ	علی گڑھ	۱۹۸۱ء
۱۸۔ اقبال کی نظری اور عملی شعریات	اقبال انسٹیوٹ کشمیر	۱۹۸۳ء
۱۹۔ اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	۱۹۸۶ء
انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ	.	.
مترجم مرزا خلیل احمد بیگ	.	.
۲۰۔ اردو زبان تاریخ تشکیل تقدیر۔	شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مئی	۱۹۸۹ء
خطبہ پروفیسر ایمریٹس	.	.
۲۱۔ ورود مسعود۔ خود نوشت سوانح حیات	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ	۱۹۸۹ء
۲۲۔ نظیر اکبرآبادی۔ نظموں کا انتخاب	اتر پردیش اردو اکیڈیمی لکھنو	۱۹۸۹ء
۲۳۔ محمد قلی قطب شاہ	ساہتیہ اکیڈیمی	۱۹۸۹ء
۲۴۔ مقالات مسعود۔ مجموعہ مضامین	ترقی اردو بیورو نئی دھلی	۱۹۸۹ء
۲۵۔ یوسف حسین خاں۔ مونوگراف	ساہتیہ اکیڈیمی نئی دھلی	۱۸۹۰ء
۲۶۔ انتخاب کلام غالب۔ معہ مقدمہ	سرسید بک ڈپو علی گڑھ	۱۹۹۱ء

فہرست مضامین

مسعود صاحب کے مضامین کو موضوعات اور سنہ واری اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔

۱۔ لسانیات، صوتیات اور اردو مسائل سے متعلق۔

۲۲-اردو کا مینو فیسٹو	ہماری زبان	ہفتہ وار دہلی یکم فروری	۱۹۷۱ء
۲۳-لسانی انفرادیت کی تلاش	ہماری زبان	ہفتہ وار دہلی ۲۲/نومبر	۱۹۷۱ء
۲۴-بنگلہ دیش اور اردو	ہماری زبان	ہفتہ وار دہلی ۱۵/جنوری	۱۹۷۲ء
۲۵-اردو زبان اور اس کے رسم الخط کا مسلہ	شاعر	بمبئی ۳/مارچ	۱۹۷۲ء
۲۶-اردو ایک ہرجائی	ہماری زبان	ہفتہ وار دہلی ۱۵/مارچ	۱۹۷۲ء
۲۷-اردو لغت نویسی کے مسائل	ہماری زبان	یکم مئی	۱۹۷۲ء
۲۸-اردو کا المیہ	ہماری زبان	ڈسمبر	۱۹۷۲ء
۲۹-اردو کے لسانیاتی ادب کا جائزہ	جامعہ ماہنامہ	دہلی جون	۱۹۷۳ء
۳۰- " Some observation on the origin of Urdu Language.	مشمولہ پاکھا سنجم جلد ۶	پٹیالہ	۱۹۷۳ء
	----	----	---
۳۱-اردو زبان کی ابتدا کے متلق چند مشاہدات	علی گڑھ میگزین	----	۱۹۷۳ء
۳۲-اردو زبان کی تاریخ کا خاکہ	ادیب سہ ماہی	جنوری تا مارچ	۱۹۸۱ء
۳۳-اردو کا لسانیاتی و تہذیبی کردار	بازیافت ماہنامہ	جلد ۱۸ شمارہ ۱	۱۹۸۲ء
۳۴-اردو حروف کی صوتیاتی ترکیب	مشمولہ زبان و ادب	----	۱۹۸۲ء
۳۵-تخلیقی زبان	آواز	----	۱۹۸۷ء
۳۶-اردو مردم شماری کے آئینے میں	ہماری زبان	دہلی یکم اگست	۱۹۸۷ء
۳۷-کوائف اردو	ادیب	شمارہ ۴	۱۹۸۷ء
۳۸-لسانی چہ می گوئیاں	ادیب علی گڑھ	جلد ۱۳ شمارہ ۱-۳	۱۹۸۸ء
۳۹-لسانی چہ می گوئیاں	ادیب علی گڑھ	جلد ۱۳ شمارہ ۱-۴	۱۹۸۸ء
۴۰-جامعہ ملیہ اسلامیہ بل اور اردو	قومی آواز	دہلی ۲۳/اکٹوبر	۱۹۸۸ء
۴۱-اردو اور الیکشن	ادیب سہ ماہی	شمارہ ۱-۳	۱۹۸۹ء
۴۲-اردو سرکاری زبان	ہماری زبان	۸/جولائی	۱۹۸۹ء
۴۳-اردو کا صوتی و تجز صوتیاتی مطالعہ	مشمولہ مقالات مسعود	ترقی اردو بیورو	۱۹۸۹ء
۴۴-اردو دوسری سرکاری زبان	ہماری زبان	۸/جولائی	۱۹۹۰ء
۴۵-مغربی ہندی اور اس کی بولیاں	ادیب	جولائی تا ڈسمبر	۱۹۹۳ء

متفرق و تنقیدی مضامین

۱-اردو کا نیا عروض اور عظمت اللہ خاں	علی گڑھ میگزین ماہنامہ	جلد ۲۱ شمارہ ۱	۱۹۴۴ء
۲-ادب کا ایک باغی عظمت اللہ خاں	آج کل	۱۵/ جون	۱۹۴۷ء
۳-کیا کیا نہ کیا "ان" کی خاطر	ہندوستان بمبئی	۱۳/ جولائی	۱۹۴۷ء
۴-جنتا کے کوئی افضل جھنجھانوی	ہندوستان بمبئی	۱۳/ اگست	۱۹۴۸ء
۵-ہندی عروض کی مبادیات	علی گڑھ میگزین	ماہنامہ	۴۹-۱۹۴۸ء
۶-گیت ہندی پنگل	کسوٹی کلکتہ	سالنامہ	۱۹۴۹ء
۷-آہ بے چاروں کے	آج کل ماہنامہ دہلی	دہلی اگست	۱۹۵۰ء
عصاب پر عورت سوار ہے	----	----	---
۸-لندن کی ایک شام	علی گڑھ میگزین	طنز و ظرافت نمبر	۱۹۵۳ء
۹-انتخاب کلام مجاز	علی گڑھ میگزین	----	۵۶-۱۹۵۵ء
۱۰-اصغر گونڈوی	اردو زبان و ادب	علی گڑھ	۱۹۵۶ء
۱۱-اصغر گونڈوی کا	مشمولہ اردو زبان و ادب	علی گڑھ	۱۹۵۶ء
ایک نقاد نیاز فتحپوری	----	----	---
۱۲-جوش ملیح آبادی	اردو زبان و ادب	علی گڑھ	۱۹۵۶ء
۱۳-غزل کا فن	اردو زبان و ادب	علی گڑھ	۱۹۵۶ء
۱۴-مصحفی نقاد شاعر	اردو زبان و ادب	علی گڑھ	۱۹۵۶ء
۱۵-سماج اور شعر	ماہنامہ علی گڑھ	جنوری	۱۹۶۱ء
۱۶-پیر مغان اردو	سب رس	حیدرآباد	۱۹۶۵ء
مولوی نصرالدین ہاشمی	----	----	----
۱۷-تخلیق شعر	شعر و زبان	حیدرآباد	۱۹۶۶ء
۱۸-شمالی ہند کا مستند شاعر افضل	مشمولہ شعر و زبان	حیدرآباد	۱۹۶۶ء
۱۹-ہندی عروض اور شاعری	مشمولہ شعر و زبان	حیدرآباد	۱۹۶۶ء
۲۰-مطالعہ شعر	مشمولہ شعر و زبان	حیدرآباد	۱۹۶۶ء
۲۱-میرا شعری تجربہ	مشمولہ شعر و زبان	حیدرآباد	۱۹۶۶ء
۲۲-ایک خط چند باتیں	آج کل ماہنامہ	دہلی اکتوبر	۱۹۶۸ء

۲۳-نہرو کی عظمت	صبح نہرو نمبر	---	۱۹۶۸ء
۲۴-عبدل اور اس کا ابراہم نامہ	اردو ادب	شمارہ ۴	۱۹۶۹ء
۲۵-غبار کارواں	خود نوشت آجکل	جون	۱۹۷۰ء
۲۶-پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم	ہماری زبان	یکم اپریل	۱۹۷۱ء
۲۷-کفارہ	ہماری زبان	یکم سپٹمبر	۱۹۷۱ء
۲۸-یوم سرسید-ایک تقریر کی یادداشت	ہماری زبان	۲۲/ اکٹوبر	۱۹۷۱ء
۲۹-ڈھاکہ یادوں کی غلام گردش میں	ہماری زبان	۱۵/ ڈسمبر	۱۹۷۱ء
۳۰-یہ یادہ	ہماری زبان	۲/ مئی	۱۹۷۲ء
۳۱-نوام چامسکی	ہماری زبان	۸/ ڈسمبر	۱۹۷۲ء
۳۲-وعدوں کا موسم	ہماری زبان	۲۲/ مارچ	۱۹۷۳ء
۳۳-اردو زبان اور کلچر	ہماری زبان	۲۳/ مئی	۱۹۷۳ء
۳۴-دھنک رنگ لمحوں کا شاعر	فن اور شخصیت	فیض احمد فیض نمبر جون	۱۹۸۱ء
۳۵-خطبہ ذاکر حسین	خدا بخش جنرل	شمارہ ۱۹ اپٹنہ	۱۹۸۱ء
۳۶-ادب میں اسلوب کی اہمیت	آواز	جلد ۴۸ شمارہ ۵ یکم مارچ	۱۹۸۳ء
۳۷-رشید صاحب چند یادیں	مشمولہ رشید احمد صدیقی	آثار و اقدار	۱۹۸۴ء
۳۸-خواجہ حسن نظامی زبان اور اسلوب	قومی آواز	جلد ۴ شمارہ ۱۸ ۴/ مارچ	۱۹۸۴ء
۳۹-اعظمی صاحب	ماہنامہ کتاب نما	جامعہ نگر	۱۹۸۵ء
۴۰-قومی یکجہتی اور ہندوستانی زبانیں	اردو ادب	شمارہ ۱-۲	۱۹۸۶ء
۴۱-جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے	آواز	نئی دہلی جنوری	۱۹۸۷ء
۴۲-ذاکر میاں-کچھ باتیں کچھ یادیں	نقش ذاکر	نئی دہلی	۱۹۸۷ء
۴۳-محاورہ مابین ناقد و شاعر	مشمولہ جمیل الدین عالی	مترجم حبیب خاں	۱۹۸۸ء
۴۴-ضمیمہ ورود مسعود	نذر مسعود	مرتبہ خلیل احمد بیگ	۱۹۸۹ء
۴۵-یادوں کے دریچے	قومی آواز	دہلی ۱۲/ مارچ	۱۹۸۹ء
۴۶-کھرا اور سچا	Indian Literature	جلد ۳۲ شمارہ ۴ جولائی اگست	۱۹۸۹ء
۴۷-فانی کی ایک غزل کا صوتیاتی تجزیہ	مقالات مسعود	ترقی اردو بیورو	۱۹۸۹ء
۴۸-اردو یونیورسٹی	ادیب	جلد ۱۶ شمارہ ۳-۴	۱۹۹۲ء
۴۹-مثنوی کدم راؤ پدم راؤ پر ایک نظر	سہ ماہی فکر و نظر	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	۱۹۹۴ء

۱۔اقبال

۱-اقبال کا صوتی آہنگ	اردو زبان و ادب علی گڑھ	۱۹۵۶ء
۲-اقبال ہے عجب مجموعہ اضداد تو	اردو زبان و ادب علی گڑھ	۱۹۵۶ء
۳-فلسفہ اقبال پر تنقیدی اشارے	اردو زبان و ادب علی گڑھ	۱۹۵۶ء
۴-اقبال کی دو طویل نظموں کی باز آفرینی	مشمولہ اقبال کا فن مرتبہ گوپی چند نارنگ	۱۹۸۳ء
۵-فکر اقبال اور آزاد ہندوستان	مشمولہ ہندوستانی مسلمان خدا بخش لائبریری	۱۹۸۶ء
۶-اقبال کے ترکیب بند	مشمولہ اقبال اور اردو نظم آل احمد سرور	۱۹۸۷ء

۲۔غالبیات

۱-کلام غالب میں صوتی آہنگ کا ایک پہلو	آج کل، فروری	۱۹۶۵ء
۲-کلام غالب میں قافیہ اور ردیف کا آہنگ	آج کل، دہلی فروری	۱۹۶۹ء
۳-غالب کے ماما	غالب نمبر، علی گڑھ میگزین	۱۹۶۹ء
۴-غالب کی ایک غزل کا تجزیہ	نقد و نظر، علی گڑھ	۱۹۷۹ء
۵-غالب کے نکتہ چین نظم طباطبائی	غالب نامہ	۱۹۸۱ء
۶-غالب کے خطوط کی لسانی اہمیت	مقالات مسعود، ترقی اردو بیورو	۱۹۹۰ء
		۱۹۹۰ء

۳۔پریم چند

۱-پریم چند کی بصیرت	شاعر آگرہ، جنوری	۱۹۴۹ء
۲-گودان تصنیف یا ترجمہ	فکر و نظر (۲)	۱۹۷۱ء
۳-گئودان	ہماری زبان، ۱۵/ڈسمبر	۱۹۷۰ء
۴-گئودان	ہماری زبان، ۱۸/مئی	۱۹۷۱ء
۵-گئودان	ہماری زبان، ۱۵/جون	۱۹۷۱ء
۶-رنگ بھومی تا چوگان ہستی	ہماری زبان، ۲۳/ڈسمبر	۱۹۸۱ء
۷-اقبال بہادر ورما سحر ہنگامی	ہماری زبان، ۸/نومبر	۱۹۸۱ء

پیش لفظ اور مقدمات

۱-مقدمہ شب چراغ	عبدالحسین خاور نوری	مجموعہ غزل	۱۹۶۴ء
۲-پیش نامہ-دکنی زبان کا ارتقا	سری رام شرما-مترجم غلام رسول	ساہتیہ اکیڈیمی	۱۹۶۷ء
۳-تعارف رشید احمد صدیقی	سلیمان اطہر جاوید	حیدرآباد نیشنل بک ڈپو	۱۹۶۸ء
شخصیت اور فن	---	---	---
۴-پیش لفظ-دکنی میں مرثیہ	رشید موسوی	حیدرآباد	۱۹۷۰ء
اور عزاداری	---	---	---
۵-پیش لفظ-نقش قدم	(شعری مجموعہ)	علی احمد جلیلی	۱۹۷۰ء
۶-پیش لفظ-اردو میں لسانیاتی تحقیق	عبدالستار دلوی	بمبئی	۱۹۷۱ء
۷-مقدمہ-نظم طباطبائی	حیات اور کارنامے	ڈاکٹر اشرف رفیع	۱۹۷۳ء
۸-مقدمہ-کیفی	پنڈت برج نرائن دتاتریہ کیفی	دہلی	۱۹۷۵ء
۹-تقریظ-نجیب اشرف ندوی	ریاست علی تاج	حیدرآباد	۱۹۸۱ء
حیات اور کارنامے	---	---	---
۱۰-مقدمہ-شمس الدین فیض	ڈاکٹر لئیق صلاح	---	۱۹۸۲ء
۱۱-پیش لفظ-قرآن کریم کے تراجم	دکنی عہد میں-سید حمید الدین	حیدرآباد	۱۹۸۲ء
۱۲-پیش لفظ-اسلوب اور اسلوبیات	مرزا خلیل احمد بیگ	---	۱۹۸۳ء
۱۳-تعارف-اردو ہندی کے	سمیع اللہ اشرفی	علیگڑھ	۱۹۸۴ء
جدید مشترک اوزان	---	علیگڑھ	---
۱۴-تعارف-لسانیات کے بنیادی اصول-	اقتدار حسین	علیگڑھ	۱۹۸۵ء
۱۵-پیش لفظ-Urdu Grammer,	مرزا خلیل احمد بیگ	---	۱۹۸۸ء
History, Culture	---	---	---
۱۶-مقدمہ-ریاست حیدرآباد میں	ڈاکٹر مصطفےٰ کمال	---	۱۹۹۰ء
تعلیمی ترقی	---	---	---

انٹرویوز

نام	بمقام	مورخہ
۱۔پروفیسر مغنی تبسم	ادارہ ادبیات اردو	۳/جون ۱۹۹۰ء
۲۔پروفیسر مغنی تبسم	ادارہ ادبیات اردو	۵/جون ۱۹۹۰ء
۳۔پروفیسر یوسف سرمست	عثمانیہ یونیورسٹی	۹/جولائی ۱۹۹۰ء
۴۔پروفیسر یوسف سرمست	عثمانیہ یونیورسٹی	۷/جنوری ۱۹۹۱ء
۵۔ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	فیصل ولا۔علی گڑھ	۶/ڈسمبر ۱۹۹۰ء
۶۔ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	فیصل ولا۔علی گڑھ	۱۹/ڈسمبر ۱۹۹۰ء
۷۔ڈاکٹر علی احمد جلیلی	جلیل منزل۔حیدرآباد	۱۹/فبروری ۱۹۹۱ء
۸۔عبدالصمد خاں	اردو ریسرچ سنٹر حیدرآباد	۱۸/مارچ ۱۹۹۱ء
۹۔ڈاکٹر رفعیہ سلطانہ	پھول بن۔اڈیکمیٹ حیدرآباد	۱۲/مئی ۱۹۹۱ء
۱۰۔خلیق انجم ڈاکٹر	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	۲/سپٹمبر ۱۹۹۱ء
۱۱۔بدرالاسلام	امیر نعمان علی گڑھ	۳/سپٹمبر ۱۹۹۱ء
۱۲۔پروفیسر ڈاکٹر اشرف رفیع	یاقوت پورہ حیدرآباد	۱۰/اکٹوبر ۱۹۹۱ء
۱۳۔سری نواس لاہوٹی	اردو ریسرچ سنٹر حیدرآباد	۱۱/اکٹوبر ۱۹۹۱ء
۱۴۔ڈاکٹر مصطفٰے علی فاطمی	یاقوت پورہ حیدرآباد	۱۲/نومبر ۱۹۹۱ء
۱۵۔ضیاءالدین انصاری ڈاکٹر	مزمل منزل علی گڑھ	۱۸/ڈسمبر ۱۹۹۱ء

کتابیات

۱-آل احمد سرور	اردو فکشن شعبہ اردو	علی گڑھ	۱۹۷۲ء
۲-آل احمد سرور	خواب باقی ہیں	علی گڑھ	۱۹۹۱ء
۳-آمنہ خاتون	دکنی کی ابتداء	بنگلور	۱۹۷۰ء
۴-ابو المحاسن محسن خاں متین	اردو میں علم بجا مرتبہ سعادت نظیر	حیدرآباد	۱۹۶۲ء
۵-احتشام حسین (سید)	اردو کی کہانی	لکھنو	۱۹۵۹ء
۶-احتشام حسین (سید)	ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	لکھنو	۱۹۶۵ء
۷-احتشام حسین (سید)	اردو کی تنقیدی تاریخ	ترقی اردو بیورو	۱۹۸۶ء
۸-اختر اورینوی	بہار میں اردو زبان کا آغاز اور ارتقا	اترپردیش	۱۹۵۷ء
۹-اعجاز حسین	مختصر تاریخ ادب اردو ترمیم شدہ	الہ آباد	۱۹۸۴ء
۱۰-افضل	بکٹ کہانی مرتبہ مسعود حسین خاں	قدیم اردو حیدرآباد	۱۹۶۵ء
۱۱-امیر اللہ خاں شاہین	اردو لسانیات	دہلی	۱۹۷۲ء
۱۲-امیر عارفی	دکنی فرہنگ ادبی اکیڈیمی	حیدرآباد	۱۹۷۲ء
۱۳-بیگم بسم اللہ نیاز احمد	اردو گیت مکتبہ نیا دور	کراچی	۱۹۸۷ء
۱۴-پرکاش مونس	اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر	الہ آباد	۱۹۷۸ء
۱۵-جعفر رضا	پریم چند اور تعمیر فن	الہ آباد	۱۹۷۷ء
۱۶-جمیل جالبی ڈاکٹر	قدیم اردو لغت مرکزی بورڈ	لاہور	۱۹۷۳ء
۱۷-جمیل جالبی ڈاکٹر	تاریخ ادب اردو جلد اول	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس	۱۹۸۶ء
۱۸-جمیل جالبی ڈاکٹر	تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ سوم	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس	۱۹۸۶ء
۱۹-خاں آرزو	نوادر الالفاظ مرتبہ سید عبد الغفار	کراچی پاکستان	۱۹۵۱ء
۲۰-خلیل احمد بیگ مرزا-ڈاکٹر	زبان، اسلوب اور اسلوبیات	علی گڑھ	۱۹۸۳ء
۲۱-خلیل احمد بیگ مرزا-ڈاکٹر	اردو کی لسانی تشکیل	علی گڑھ	۱۹۹۰ء
۲۲-خلیل احمد بیگ مرزا-ڈاکٹر	نذر مسعود-فکر و نظر	علی گڑھ	۱۹۹۰ء
۲۳-رشید موسوی-ڈاکٹر	دکن میں مرثیہ اور عزاداری	حیدرآباد	۱۹۷۰ء
۲۴-روشن علی	عاشور نامہ مرتبہ مسعود حسین خاں	علی گڑھ	۱۹۷۴ء

۲۵-سلیمان اطہر جاوید ڈاکٹر	رشید احمد صدیقی شخصیت اور فن	حیدرآباد	۱۹۶۸ء
۲۶-سلیمان ندوی (سید)	نقوش سلیمانی	اعظم گڑھ	۱۹۳۹ء
۲۷-سمیع اللہ اشرفی ڈاکٹر	اردو ھندی کے جدید مشترک اوزان	شعبہ اردو علی گڑھ	۱۹۸۴ء
۲۸-سینتی کمار چٹرجی	انڈو آرین اینڈ ہندی	کلکتہ	۱۹۴۳ء
۲۹-سہیل بخاری	اردو کا قدیم ترین ادب پاکستان	پاکستان	۱۹۶۵ء
۳۰-سیدہ جعفر پروفیسر	ماہ پیکر	حیدرآباد	۱۹۸۶ء
۳۱-سیدہ جعفر پروفیسر	ڈاکٹر زور	ساہتیہ اکیڈیمی	۱۹۸۷ء
۳۲-سیدہ جعفر پروفیسر	انتخاب کلام قلی قطب شاہ	اتر پردیش اردو اکیڈیمی	۱۹۸۹ء
۳۳-سیدہ جعفر پروفیسر	ادبی تنقید نصابی کتاب اوپن یونیورسٹی	آندھرا پردیش	۱۹۸۹ء
۳۴-شبیر علی کاظمی	پراچین ہند کی اردو		۱۹۸۹ء
۳۵-شری رام شرما	دکنی زبان آغاز و ارتقا-ترجمہ غلام رسول	اے پی ساہتیہ اکیڈیمی	۱۹۶۷ء
۳۶-شعار احمد سید	دکنی لغت	مکتبہ ابراہیمیہ	۱۹۵۴ء
۳۷-شمس الرحمن فاروقی	تحفۃ السرور	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۸۵ء
۳۸-شوکت سبزواری	داستان زبان اردو	دہلی	۱۹۶۱ء
۳۹-شوکت سبزواری	اردو لسانیات	جدید ایڈیشن	۱۹۸۶ء
۴۰-صبیحہ انور ڈاکٹر	اردو میں خود نوشت	دہلی	۱۹۸۶ء
۴۱-ضیاء الدین	اسالیب نثر پر ایک نظر	ادارہ فکر جدید	۱۹۸۹ء
۴۲-ظفر ادیب	اردو زبان کی قومی آواز	انجمن ترقی اردو ہند	۱۹۷۶ء
۴۳-عبدالحق	اردو کی ابتداء میں صوفیائے کرام کا حصہ	انجمن ترقی اردو ہند	۱۹۶۸ء
۴۴-عبدالحئ محمد ڈاکٹر	مملکت آصفیہ جلد دوم	تنویر پریس کراچی	۱۹۷۸ء
۴۵-عبدالستار دلوی	ادبی اور لسانی تحقیق	شعبہ اردو بمبئی یونیورسٹی	۱۹۸۵ء
۴۶-عبدالغفار شکیل	لسانی اور تحقیقی مطالعہ	دہلی	۱۹۷۸ء
۴۷-عبدالقادر سروری پروفیسر	زبان اور علم زبان	حیدرآباد	۱۹۲۹ء
۴۸-عبدل	ابراہیم نامہ مرتبہ مسعود حسین خاں	شعبہ لسانیات علی گڑھ	۱۹۶۹ء
۴۹-عتیق صدیقی	گلکرائسٹ اور اس کا عہد	انجمن ترقی اردو ہند	۱۹۷۹ء
۵۰-عطش درانی	اردو زبان اور یورپی اہل قلم	لاہور	۱۹۸۷ء
۵۱-عظیم الحق جنیدی	اردو ادب کی تاریخ ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	۱۹۸۸ء

۵۲-علی رفاد فتیحی	اسلوبیاتی تنقید	سیماپوری دہلی	۱۹۸۹ء
۵۳-عیسوی خاں	قصہ مہرافروز دلبر	مرتبہ مسعود حسین خاں	۱۹۶۶ء
۵۴-غلام ربانی اگردہ	بھارت میں اردو ادبیات پاکستان	مخزونہ اردو ریسرچ سنٹر	۱۹۸۷ء
۵۵-فخر دین نظامی	مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مرتبہ جمیل جالبی	پاکستان	۱۹۷۹ء
۵۶-فرمان فتح پوری ڈاکٹر	زبان اور زبان	ڈاکٹر جمیل جالبی پاکستان	۱۹۷۹ء
۵۷-فضل علی فضلی	کربل کتھا-مرتبہ مالک رام	مختار الدین احمد پٹیل	۱۹۶۵ء
۵۸-فیروز بیدری	پرت نامہ مرتبہ مسعود حسین خاں مشمولہ	قدیم اردو حیدرآباد	۱۹۶۵ء
۵۹-قدرت نقوی سید	لسانی مقالات	مخزونہ اردو ریسرچ سنٹر	۱۹۸۸ء
۶۰-قیصر جہاں ڈاکٹر	اردو کے منتخب گیت مقتدرہ قومی پاکستان	اترپردیش اردو اکیڈیمی	۱۹۸۳ء
۶۱-گوپی چند نارنگ	اقبال کا فن	دہلی	۱۹۸۳ء
۶۲-گوپی چند نارنگ	لغت نویسی کے مسائل	جامعہ نگر	۱۹۸۵ء
۶۳-گوپی چند نارنگ	اسلوبیاتی تنقید	دہلی	۱۹۹۰ء
۶۴-گیان چند جین ڈاکٹر	لسانی مطالعے	ترقی اردو بیورو	۱۹۷۹ء
۶۵-گیان چند جین ڈاکٹر	پرکھ اور پہچان	دہلی	۱۹۹۰ء
۶۶-لطیف الزماں	نذر مسعود	بیکن بکس ملتان لاہور	۱۹۹۰ء
۶۷-محمد حسن	قدیم اردو کی تنقیدی تاریخ	اترپردیش اکیڈیمی	۱۹۸۶ء
۶۸-محمد حسین آزاد	آب حیات کلکتہ عثمانیہ بکڈپو	مخزونہ اردو ریسرچ سنٹر	۱۹۶۷ء
۶۹-محی الدین قادری زور	دکنی ادب کی تاریخ	ادارہ ادبیات اردو	۱۹۳۵ء
۷۰-محی الدین قادری زور	حیات محمد قلی قطب شاہ	سوانحی ادب حیدرآباد	۱۹۴۰ء
۷۱-محی الدین قادری زور	ہندوستانی لسانیات	نسیم بکڈپو لکھنو	۱۹۶۰ء
۷۲-مسعود حسین خاں پروفیسر	اردو زبان و ادب	علی گڑھ	۱۹۵۶ء
۷۳-مسعود حسین خاں پروفیسر	مقدمہ شعر و زبان	حیدرآباد	۱۹۶۶ء
۷۴-مسعود حسین خاں پروفیسر	دکنی اردو لغت	اے-پی ساہتیہ اکیڈیمی	۱۹۶۹ء
۷۵-مسعود حسین خاں پروفیسر	رقعات رشید	شعبہ لسانیات علی گڑھ	۱۹۸۱ء
۷۶-مسعود حسین خاں پروفیسر	اقبال کی نظری اور عملی شعریات	کشمیر	۱۹۸۲ء
۷۷-مسعود حسین خاں پروفیسر	دو نیم-جدید ایڈیشن	علی گڑھ	۱۹۸۶ء
۷۸-مسعود حسین خاں پروفیسر	اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجزصوتیاتی جائزہ	مرتبہ خلیل احمد بیگ	۱۹۸۶ء

۷۹-مسعود حسین خاں	نظیر اکبر آبادی	اتر پردیش اردو اکیڈیمی	۱۹۸۸ء
۸۰-مسعود حسین خاں	ورود مسعود	خدا بخش اورینٹل لائبریری	۱۹۸۸ء
۸۱-مسعود حسین خاں	قلی قطب شاہ مونو گراف	ساہتیہ اکیڈیمی حیدر آباد	۱۹۸۹ء
۸۲-مسعود حسین خاں	یوسف حسین خاں	ساہتیہ اکیڈیمی	۱۹۹۰ء
۸۳-مسعود حسین خاں	انتخاب کلام غالب	سر سید بک ڈپو	۱۹۹۱ء
۸۴-نظر عباس نقوی	اسلوبیاتی مطالعے	علی گڑھ	۱۹۸۷ء
۸۵-نصیر الدین ہاشمی	دکن میں اردو	انجمن ترقی اردو ہند	۱۹۶۶ء
۸۶-نور الحسن نقوی	فن اور تنقید نگاری	علی گڑھ	۱۹۹۰ء
۸۷-وارث سرہندی	کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ	اسلام آباد پاکستان	۱۹۸۷ء
۸۸-وہاج الدین علوی	اردو میں خود نوشت فن اور تجزیہ	جامعہ نگر دہلی	۱۹۸۹ء
۸۹-ہارون خاں شیروانی	دکن کے بہمنی سلاطین	ترجمہ علی الہاشمی نئی دہلی	۱۹۷۲ء
۹۰-یوسف حسین خاں ڈاکٹر	یادوں کی دنیا	اعظم گڑھ	۱۹۷۲ء

رسائل

اردو ادب	انجمن ترقی اردو	اکتوبر ۱۹۵۷ء
---	انجمن ترقی اردو	ستمبر ۱۹۵۹ء
---	انجمن ترقی اردو	ستمبر ۱۹۶۹ء
اردو دنیا	ترقی اردو بیورو	جنوری تا جون ۱۹۹۰ء
---	ترقی اردو بیورو	جنوری
ادیب	جامعہ اردو علی گڑھ	مارچ ۱۹۸۱ء
---	جامعہ اردو علی گڑھ	شمارہ (۴) ۱۹۸۴ء
---	جامعہ اردو علی گڑھ	شمارہ ۱، ۱۹۸۶۳ء
---	جامعہ اردو علی گڑھ	شمارہ (۴) ۱۹۸۶ء
---	جامعہ اردو علی گڑھ	جلد (۱۱) ۱۹۸۸ء
---	جامعہ اردو علی گڑھ	جلد (۱۲) ۱۹۸۸ء
آج کل - دہلی	دہلی	اگست ۱۹۵۰ء
---	دہلی	ستمبر ۱۹۵۴ء
---	دہلی	نومبر ۱۹۶۸ء
---	دہلی	فروری ۱۹۶۹ء
---	دہلی	جون ۱۹۷۰ء-۱۹/ اپریل ۱۹۸۷ء
آواز	دہلی	یکم دسمبر ۱۹۸۲ء-یکم مارچ ۱۹۸۳ء
---	دہلی	جلد (۵۲) یکم جنوری ۱۹۸۷ء
جامعہ	دہلی	جلد (۶۷) شمارہ ۶/ جون ۱۹۷۳ء
سب رس	حیدرآباد	مارچ ۱۹۶۸ء
---	حیدرآباد	۱۹۸۶ء-۱۹۸۷ء
شعر و حکمت	حیدرآباد	شمارہ (۲) ۱۹۷۰ء
شاعر	بمبئی	مارچ ۱۹۷۲ء
صبح	پٹنہ	نہرو نمبر ۱۹۶۸ء

علی گڑھ میگزین	علی گڑھ	شمارہ (۱) ۱۹۴۴ء
---	علی گڑھ	۱۹۴۶ء
---	علی گڑھ	۱۹۴۶ء
---	علی گڑھ	طنز و ظرافت نمبر-۱۹۵۳ء
---	علی گڑھ	غالب نمبر-۱۹۶۹ء
---	علی گڑھ	۱۹۶۸ء
---	علی گڑھ	۱۹۷۴ء
غالب نامہ	نئی دہلی	جلد (۲) شمارہ (۲)-جولائی ۱۹۸۱ء
فکر و نظر	علی گڑھ	جنوری ۱۹۶۱ء
---	علی گڑھ	جنوری ۱۹۶۲ء
---	علی گڑھ	۱۹۶۹ء
---	علی گڑھ	شمارہ (۲) ۱۹۷۱ء
---	علی گڑھ	نذر مسعود-۱۹۸۹ء
فن اور شخصیت	بمبئی	فیض احمد فیض نمبر-۱۹۸۱ء
قومی آواز	نئی دہلی	۲۳/ اکتوبر ۱۹۸۸ء
---	---	۱۲/ مارچ ۱۹۸۹ء
---	---	۴/ مارچ ۱۹۸۴ء
نگار	پاکستان	محمود حسین نمبر-۱۹۷۲
---	---	اصناف سخن نمبر-۱۹۶۷ء
---	پاکستان	فروری ۱۹۸۷ء
نقد و نظر	علی گڑھ	دسمبر ۱۹۸۸ء
---	---	جلد (۱۲) شمارہ (۲) ۱۹۹۱ء
---	---	جلد (۱۳) شمارہ (۱) ۱۹۹۱ء
نوائے ادب	بمبئی	۱۹۶۸ء
---	---	اکتوبر ۱۹۶۹ء
معارف	بمبئی	جولائی ۱۹۲۸ء
---	---	اپریل ۱۹۷۹ء